دُکھ سکھ اپنے

رضیہ بٹ

دُکھ سُکھ اپنے

تابی برآمدے سے کمرے میں داخل ہی ہوئے تھے کہ رینا دوڑی دوڑی آئی۔

"تابی بھیا — تابی بھیا۔"

"ہوں"۔ تابی نے بریف کیس بیڈ پر اچھال دیا۔

"دادی اماں کا فون آیا ہے۔"

"خیریت ؟"

"بالکل خیریت۔"

"پھر —"

"پھر یہ کہ آپ کو کل رات کی گاڑی سے لاہور جانا پڑے گا۔"

"گاڑی سے اور پھر لاہور — ؟"

"جی ہاں —"

"مگر کیوں ؟"

"کیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ دادی اماں نے بڑی زوردار دھمکی دے ڈالی ہے۔"

"یعنی۔"

"یعنی یہ کہ — اگر آپ ان سے ملے بغیر چلے گئے تو وہ — خدانخواستہ اگر آپ کی واپسی سے پہلے — اللہ میاں کے پاس پہنچ گئیں — تو آپ کو — کبھی معاف نہیں کریں گی۔"

رینا نے شوخ شوخ نظروں سے بھائی کو دیکھ کر چبا چبا کر باتیں کیں تو تابی کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شریر کہیں کی۔" تابی نے اس کا کان پکڑ کر مروڑا — "بڑی باتیں بنانا آتی ہیں۔"

"اوئی اللہ —" رینا نے اپنا کان چھڑاتے ہوئے کہا۔ "تابی بجیا خدا قسم جو ایک بات بھی دل سے بنائی ہو — مجھ پر یقین نہیں آتا تو امی سے پوچھ لیجیے۔ دادی اماں نے آپ کو بلا بھیجا ہے۔"

"انہیں کس نے بتایا تھا کہ میں کورس کے لیے باہر جا رہا ہوں۔"

"حد ہو گئی بھیا — یہ بھی کوئی بات ہے۔ کراچی سے لاہور خبر پہنچنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔"

"تم نے بتایا ہوگا؟"

"ہو سکتا ہے۔"

"میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔"

"کیا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ یہ خوش خبری ان کو ملنی چاہیے تھی نا — دادی اماں غیر تھوڑا ہی ہیں۔ اور پھر وہاں تائی اماں ہیں تایا ابو ہیں۔ ان کی اولاد ہے۔ بڑی پھپھو ہیں، چھوٹی ہیں۔"

"بس بس۔ کان مت کھاؤ۔"

"تو پھر کب جائیں گے لاہور؟"

"رینا —"

"جی —"

"تمہیں پتہ ہے میں لاہور جانا نہیں چاہتا۔"

"پرانی بات ہے۔"

"بعض باتیں پرانی ہو کر بھی نئی رہتی ہیں۔"

"اوہو — تو آپ جینی کو ابھی تک نہیں بھولے — حالانکہ اس کی شادی —"

"رینا بے وقت کی راگنی مت چھیڑا کرو۔ جانتی ہو آج کل میں کتنا مصروف ہوں۔ صبح سے کام کر رہا ہوں اور اب شام ڈھل آنے کو ہے — آتے آتے ہی یہ خبر سنا دی۔"

"اور جناب کا اچھا خاصا موڈ خراب کر دیا۔"

"بالکل۔"

"میں سمجھتی تھی کہ آپ اب تک جینی کو بھلا چکے ہوں گے۔"

"اسے یاد رکھنے کا فائدہ بھی تو نہیں تھا لیکن ـــ"

"لیکن ویکن کچھ نہیں لاحاصل چیزوں کو یکسر بھلا دینا ہی بہتر ہوتا ہے بھیا جی ـــ"

"جینی، تو سُنا ہے ایک بچی کی ماں بھی بن چکی ہے۔"

"رینا میرے لیے چائے بنا کر لاؤ ـــ میں تھک گیا ہوں۔"

"بہت اچھا۔"

رینا کمرے سے نکل گئی۔ نکلتے نکلتے شوخ نظروں سے بھائی کو چھیڑتی بھی چلی گئی۔ تابی نے ایک گہری سانس چھوڑی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کرسی پر آ بیٹھے ـــ ان کے چہرے پر بڑی بے چینی کے آثار تھے۔ آنکھوں میں تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ کرب بھی تھا۔ رینا نے شوخی شوخی میں ان تاروں کو چھیڑ دیا تھا جن کو وہ ماضی میں دفن کر چکے تھے۔ اور کبھی نہ جوڑنے کا عزم کر چکے تھے۔ وہ تار ٹوٹے ہی ایسے تھے کہ ان کے جوڑنے کا امکان رہا تھا نہ یہ بات ممکن تھی۔

کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے انہوں نے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو ملا۔ ماضی کے بند دریچے کڑکڑانے لگے تھے اور ان کی بسیار کوشش کے باوجود یہ ٹوٹتے چلے جا رہے تھے۔

چار پانچ سال پہلے جب وہ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھے دسمبر کی چھٹیاں گزارنے لاہور گئے تھے۔ لاہور جہاں ان کی دادی اماں اپنے بڑے

بیٹے، بڑی بہو، تین پوتوں اور چار پوتیوں کے ساتھ رہتی تھیں ـــ ہر دوسرے تیسرے سال وہ چھٹیاں دادی اماں کے پاس گزارنے جاتے تھے۔ کبھی کبھی رینا بھی ہمراہ ہوتی تھی۔ امی ابو تو جب بھی موقعہ ملتا تھا لاہور ہو آتے تھے لیکن طالب علمی کے زمانے میں چھٹیاں ہی یہ موقع فراہم کرتی تھیں۔ کبھی دسمبر کبھی جون اور کبھی موسم بہار کی چھٹیوں میں ادھر کا پروگرام بن جاتا تھا۔ دادی اماں بھی اکثر کراچی کا چکر لگا لیتی تھیں۔ تائی اماں کو مرطوب آب و ہوا راس نہ آتی تھی۔ تایا کبھی کبھی آ جاتے تھے اور چونکہ تائی اماں نہیں آتی تھیں اس لیے بچوں کے آنے کا بھی سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔

لیکن اس کے باوجود دونوں گھرانوں میں پیار تھا اور دادی اماں اس پیار کا منبع اور سرچشمہ تھیں۔ جس سے مستفید ہونے کا بچوں کو حق تھا۔ خواہ وہ کراچی میں رہتے تھے یا لاہور میں۔

پرانے طرز کی بنی وسیع و عریض لانوں میں گھری کوٹھی میں وہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ محرابی دروں، گھومتے زینوں، بڑے بڑے کمروں، وسیع ہالوں اور طویل طویل برآمدوں والی یہ کوٹھی پرانی تو تھی لیکن اس کے مکینوں کے خیالات نئے تھے۔ زندگی کی نئی نئی کروٹیں ان کو بھی راس آئی تھیں اور ان کروٹوں کی جھلک ان کے رہن سہن، طور طریق اور کوٹھی کی آرائش و زیبائش سے نظر آتی تھی۔

دادی اماں کے دونوں بیٹے لاہور میں قاسم اور کراچی میں عاصم اب جوان بچوں کے باپ تھے۔ لیکن ماں سے اب تک دونوں اسی طرح دبتے تھے جیسے

چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔ ماں ان کی فرمانبرداری پر پھولی نہ سماتی تھی۔ بڑے فخر سے ان کا ذکر کرتی تھیں عقل مند — کبھی اپنے حقوق کا ناجائز استعمال نہ کیا تھا۔

رینا چائے لے آئی۔

"تابی بھیا" — اس نے آہستگی سے بھائی کی ناک مروڑی۔ تابی نے آنکھیں کھول دیں۔ رینا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ سیدھے ہو کر کرسی میں بیٹھ گئے۔ یادوں کے غبار ان کی آنکھوں میں ڈھل آتے تھے، باوجود کوشش کے وہ مسکرا نہ سکے۔

رینا نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے چائے بنا کر بھائی کو پیش کی۔ اس نے دانستہ اب لاہور کا ذکر نہیں چھیڑا۔ تابی کی تیاریوں کا پوچھنے لگی۔

"ہائے بھیا! مجھے تو یہ ایک سال دو ماہ گزارنے مشکل ہو جائیں گے۔"

"کیوں؟"

"کسے بتایا کروں گی آپ کے جانے کے بعد؟"

"اپنے میاں کو —"

"ہٹیے!"

"اپنی دفعہ یوں لال انگارہ ہو گئیں — سنا ہے تمہارے محسن صاحب یہاں ٹرانسفر کرانے کے چکر میں ہیں —" تابی نے اس کے منگیتر کا ذکر کر کے اسے چھیڑا۔ یوں بھی وہ پھوپھی زاد تھے۔ محسن کوئی غیر تھوڑا ہی تھا۔

رینا بڑی استاد تھی۔ بات بدلنے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ جلدی سے بولی "آپ کے شلوار کرتے تیار ہو کر آ گئے۔"

"سارے —"

"ہاں — چار ہی تو تھے۔ امی کہتی ہیں بعد میں آپ کو اور بھی کپڑے بھیجا کریں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے — امی کہاں ہیں — ان کی آواز نہیں آتی۔"

"مسز واسطی کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔"

"اچھا —"

دونوں نے چائے پی — پھر رینا برتن اٹھا کر لے گئی۔ اس کی کوئی دوست آ گئی تھی اس لیے دوبارہ تابی کے کمرے میں نہیں آئی۔

چائے پینے کے بعد بھی تابی کرسی میں تساہل سے پڑے رہے۔ وہ تقریباً سوا سال کے کورس پر جرمنی جا رہے تھے۔ بڑے قابل انجینئر تھے اس لیے چار میں سے انہیں چنا گیا تھا — اسی سلسلے میں آج کل وہ بے حد مصروف تھے۔ صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتے اور چار پانچ بجے سے پہلے نہ لوٹ سکتے۔

آج بھی وہ معمول کی سرگرمیوں سے تھکے ماندے گھر آئے تھے کہ رینا نے مدفون یادوں کو اکسا کر بے چین کر دیا تھا۔

جینی ان کی تایا زاد تھی۔ قاسم تایا کی بڑی بیٹی۔ سیاہ بالوں گہری گہری سیاہ آنکھوں اور چمپئی رنگت والی نرم و گداز جینی جانے کب

ان کے دل میں اُتر گئی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے سال وہ لاہور جاتے تھے اور دو حسین آنکھوں کو اپنا منتظر پاتے تھے۔ ان آنکھوں میں انتظار کی شمعیں کب سے فروزاں تھیں۔ یہ شاید آنکھوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ تابی کو بھی سرا نہ ملتا تھا۔

بچپن ہی سے انہیں سنہری رنگت والی گڑیا سی جینی بہت پسند تھی۔ جتنا عرصہ بھی لاہور میں گزرتا اس گڑیا کی سنگت میں گھومتے زینوں پر چڑھتے اترتے لمبی راہداریوں میں دوڑتے بھاگتے، چمنوں میں بوڑھے درختوں کی شاخوں سے جھولتے، تتلیاں پکڑتے اور پھولوں کے ہار پرونے میں گزرتا تھا۔ دونوں کا اتنا ساتھ شاید بڑوں کی نظر میں نہیں آیا تھا اس لیے کوٹھی میں چھٹیوں میں ہر سائز کے بچے جمع ہو جاتے تھے چچا پھوپھیاں سب آتے تھے اور دیر دیر سے ملنے کی وجہ سے آپس ہی میں مصروف رہتے۔ بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور ان کی نگہبانی کرنے کے لیے نوکروں پر اعتماد کر لیا جاتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ جینی کی موہنی سی گڑیا ایک حسین پیکر میں بدلتی گئی۔ یہ پیکر اب تابی کی خلوتوں میں تو موجود تھا۔ قربتوں سے کچھ سنبھل کر کچھ کترا کر دور دور رہنے لگا تھا لیکن جذبے جو جنم پا چکے تھے اظہار کی دوسری راہیں اختیار کر لیتے تھے۔ خاموشیوں کو بھی زبان مل جاتی تھی، نگاہیں بھی مدعا بیان کر دیتی ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر چہرے جو لو دینے لگتے تھے جھکی اٹھتی پلکیں جو کہہ دیتی تھیں وہی کافی تھیں۔

اور پھر

دس پندرہ دن کی چھٹیوں کے سارے ہی لمحے بیرحم تو نہ ہوتے تھے تنہائی میں کبھی کبھی مل لینے اور چھپ چھپ کر دل کی باتیں کر لینے کے موقعے بھی مل ہی جاتے تھے۔ یہ لمحے میسر آ جانے میں اس وسیع و عریض پرانے طرز کی کوٹھی کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک سرے پہ کوئی ہوتا تو دوسرے سرے کی خبر نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ تیرہ چودہ سالہ بینی بھی تو ان کی راز دان تھی۔

تابی نے بے تابی سے کرسی پر کروٹ بدلی۔ یادوں کی دھول اڑنے لگی تھی اور دبی دبی چنگاریوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ انہیں لپک جھپک کئی واقعات یاد آنے لگے۔ بینی جینی سے چھ سات سال چھوٹی تھی۔ لیکن بہنیں شاید شروع ہی سے بہنوں کے رازوں کی امین ہوتی ہیں۔ وہ تابی کو ستایا تو بہت کرتی تھی لیکن جینی سے ملانے کا بندوبست بھی خوب کیا کرتی تھی۔

"تابی بھیا — تابی بھیا —" وہ ان کے پاس دوڑی آیا کرتی اور سب کی موجودگی میں کہا کرتی۔

"کیا ہے؟"

"تابی بھیا — وہ جو پچھلے لان میں پیپل کے درخت ہیں نا —"

"ہاں —"

"ان کے نیچے میری کتابیں رہ گئی ہیں"۔

"تو میں کیا کروں ؟"

"پلیز لا دیں"

"خود کیوں نہیں لاتیں ؟"

"شام ہو گئی ہے اِدھر جاتے ڈر لگتا ہے"

"شام سے پہلے لے آتیں"

"پلیز بھیا ۔"

وہ اس انداز سے ہنس کر شوخ ہو کر کہتی کہ تابی سمجھ جاتے ۔ سب کو دکھانے کے لیے بڑبڑ کرتے لیکن اٹھ کر چل بھی دیتے ۔

اور ۔

جو کبھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاتا تو بینی ایک دم باتوں میں لگا لیتی ۔ سنبھل سنبھل کر اِدھر اُدھر دیکھ کر جب تابی پچھلے لان کے آخری سرے پر اُگے ان گھیر دار درختوں کی طرف چل دیتے تو بینی کی کھنک دار ہنسی ان کے کانوں میں اتر جاتی لیکن وہ اس چھوٹی سی لڑکی کا دل ہی دل میں سارا جسم دوپٹے میں لپیٹے جیسی سر جھکائے کھڑی ہوتی ۔

"اوہ ۔ تم یہاں ۔" تابی یوں کہتے جیسے بے خبری میں ادھر آ گئے ہوں ۔

وہ شرما کر نگاہ غلط انداز ان پر ڈالتی تو تابی کے سینے میں ہلچل مچ جاتی ۔ پھر وہ اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتے ۔ اور اس کی حسین و خوبصورت آنکھوں میں جھانک جھانک کر اپنے خوابوں

کی تعبیر ڈھونڈتے ۔

بینی نئی نئی راہیں تلاش کرتی رہتی تھی ۔ کبھی اسے کوٹھی کے اُوپر والے اس کمرے میں اپنا دوپٹہ بھول جاتا تھا جہاں فالتو سامان رکھا ہوتا تھا ۔ کبھی وہ باجی کے کمرے میں اپنی قمیض چھوڑ آتی تھی ۔ کبھی سرونٹ کوارٹرز کے پیچھے اسے کوئی چیز یاد آ جاتی تھی اور ان سب باتوں کے لیے اسے تابی ہی کی ضرورت رہتی تھی ۔

"تابی اس کے شکر گزار تھے ۔" جینی ۔"

"ہوں ۔"

"بینی نہ ہوتی تو ہم قربت کے ان لمحوں سے مستفید نہ ہو سکتے تھے ۔"

"بہت چالاک ہے ۔"

"تم نے اسے چالاک بنا دیا ہے ۔"

"جی نہیں ۔ میں نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا ۔"

"یعنی تم نے مجھ سے اکیلے میں ملنے کی کبھی خواہش نہیں کی ؟"

وہ اک ادائے دلربائی سے مسکرا کر کہتی ۔ "بینی خود ہی سب کچھ کرتی پھرتی ہے ۔"

پھر وہ دونوں ڈھیروں باتیں کرتے ۔ پیار کی معصوم معصوم باتیں ۔ کبھی روٹھ جاتے کبھی من جاتے ۔ کبھی جدائی کے تصور سے آنکھوں میں نمی اتر آتی ۔ کبھی مستقبل کے پلان بناتے بناتے آنکھوں میں مسرتوں کی شمعیں جلنے لگتیں ۔

کتنے حسین کتنے پیارے تھے وہ شب و روز ــــ کیسے سرشار سرشار رہتے تھے تابی۔ زندگی مسکراہٹوں کا دوسرا نام لگتی تھی۔

لیکن ــــ

چار سال پہلے جب وہ لاہور گئے تو جینی کچھ بکھری بکھری اداس اداس نظر آئی۔ آنکھوں میں انتظار کی شمعیں جیسے بجھ کر دھواں دینے لگی تھیں۔ چہرہ اترا اترا تھا۔

پہلی ہی فرصت میں تابی نے جینی کو ہراساں نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے جینی" جینی کی آواز حلق میں اٹک گئی، آنکھوں میں آنسو آگئے۔

تابی نے بے تابی سے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا "کچھ بتاؤ جینی ــــ کیا ہوا ــــ اتنی اداس کیوں ہو ــــ؟"

جینی کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہہ نکلے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

تابی کی پریشانی دید کے قابل تھی "خدا را کچھ تو کہو۔ میں بہت پریشان ہوں جینی۔ میں تو خوشیاں سمیٹنے اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں آیا ہوں ــــ تم ــــ تم ــــ رو رہی ہو ــــ کیوں ــــ؟ کیوں جینی کیوں؟"

"رونا ہی میرا نصیب ہے تابی ــــ" اس نے بمشکل کہا۔

تابی کچھ نہ سمجھے۔ الجھے الجھے لہجے میں بولے "تم مجھے پاگل بنا دو گی جینی۔ جانتی بھی ہو میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔

تمہارے چہرے پر حزن و ملال کی کوئی لہر برداشت نہیں کر سکتا"

"تابی ــــ" جینی روتے گئی۔

"ہوا کیا ہے ــــ"؟ تابی نے جینی کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"ہم بچھڑ رہے ہیں تابی" جینی بمشکل کہہ پائی۔ اور تابی کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ وہ کئی لمحے بے حس و حرکت جینی کے دونوں بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لیے کھڑے رہے۔ کئی لمحے یونہی گزر گئے۔

پھر ــــ

تابی ایک دم چیخے ــــ نہیں نہیں ــــ یہ نہیں ہو سکتا؟"

جینی کی گھٹی گھٹی سسکیاں ابھرتی رہیں اور تابی مجنونانہ انداز میں اسے تکتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے رہے۔

جب جزن کو کچھ ہوش آیا۔ جینی کچھ سنبھلی تو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس نے تابی کو بتایا کہ اس کی امی کی سہیلی اس کا رشتہ اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لیے مانگ چکی ہے اور اس مانگنے کو اہل خانہ نے بصد عزو نیاز قبول بھی کر لیا ہے۔ اگلے ہفتے منگنی بھی ہو نا طے پا گئی ہے۔

"تابی کو زمین و آسمان گھومتے ہوئے نظر آئے ــــ انہوں نے اپنا سر تھام لیا ــــ کچھ سمجھ نہ پائے کہ کیا کریں۔

وہ ــــ

کیا کریں۔

کیا کریں —

کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔

انہوں نے جینی ہی کو جھنجوڑ ڈالا "جینی — تم نے کوئی احتجاج کیوں نہیں کیا۔ چپ چاپ میری محبت کا گلا گھونٹ دیا — تم بے رحم ہو۔ سفاک ہو۔ سنگدل ہو"

اور جینی ان کی حالت سے متوحش ہو کر بولی "میں کیا کر سکتی تھی تابی — کیا کر سکتی تھی — تم اب آئے ہو تو کچھ کرو — میں — میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تابی — میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گی"

اسے سوائے رونے کے اور کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا۔

وہ رات تابی نے جیسے کانٹوں پر گزاری۔ کئی پلان بناتے — کئی باتیں سوچیں — لیکن کسی پر بھی عمل پیرا ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔

وہ کیا کرتے — کیا کہتے — انہوں نے تو اپنے جذبوں کو ہوا تک لگنے نہ دی تھی۔ کسے علم تھا کہ وہ جینی کو اس قدر ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ جینی سے عمر بھر کے ساتھ کے نباہ کی قسمیں کھا چکے ہیں۔ جینی کو رگ رگ میں اس طرح اتار چکے ہیں کہ اب اس کے بغیر سانس لینا بھی دشوار ہے۔

اگر تھوڑا بہت آگاہ تھی تو بینی —— لیکن اس تیرہ چودہ سالہ لڑکی سے وہ دل کی بات کیسے کہہ سکتے تھے؟

فرطِ جذبات سے ڈوبی آواز میں دوسرے دن جب بینی ان سے ہنستے

ہنستے ملی تھی تو وہ صرف اسی قدر کہہ سکے تھے "یہ سب کچھ کیا ہو گیا بینی؟"

بینی ان کی بات شاید سمجھی ہی نہ تھی — وہ تو ہنستی مسکراتی حسب عادت کدکڑے لگاتی پھر رہی تھی۔

وہ جتنے دن وہاں ٹھہرے یہی سوچتے رہے کہ دادی اماں سے کہہ دیں ان سے اپنا حق مانگ لیں۔ جینی ان کی تھی۔ ان کے تایا کی بیٹی تھی — اس پر ان کا حق تھا۔ یہ حق جینی کی ماں کی دوست کا بیٹا کیوں چھین رہا تھا؟

لیکن —

وہ دادی اماں سے یہ نہ کہہ سکے۔ تائی اماں اور دادی اماں تو اس نئے بندھن پر اتراتی پھر رہی تھیں۔ اسے صرف جینی ہی کا نہیں اپنا بھی مقدر جاگتا معلوم ہو رہا تھا — اتنے امیر کبیر خاندان کا ڈاکٹر لڑکا جینی کے روشن نصیب کی دلیل تھا۔

انہوں نے اپنی امی کو فون پر بتایا۔

امی بھی تائی امی کی طرح خوشی سے چہک اٹھیں۔

"بہت اچھا ہوا ہے۔ جینی کا نصیبا جاگ اٹھا۔ اتنی اچھی لڑکی کے لیے ایسا ہی رشتہ درکار تھا"

تابی کی زبان گنگ ہو گئی — امی نے فون تائی اماں کو دینے کا کہا۔ وہ اس رشتے کی مبارکباد انہیں دینا چاہتی تھیں۔

تابی مایوس و پریشان ہو کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ کاش انہوں نے

اپنے جذبات کو یوں مستور نہ رکھا ہوتا اور کسی سے نہ سہی اپنی امی سے ہی کہہ دیا ہوتا۔ لیکن اب ــ ؟

کوئی راہ نظر نہ آ رہی تھی۔ گھر میں منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں ــ پرانی کوٹھی کو نئے طرز سے سنوارا جا رہا تھا۔ فرنیچر پالش ہو رہا تھا، پردے دھل رہے تھے۔ صوفوں کے کپڑے بدلائے جا رہے تھے۔ کشن خریدے گئے تھے۔ ہر فرد اپنی اپنی تیاری میں مصروف تھا۔

جینی تو ماں سے لڑ لڑ کر اپنے لیے قیمتی کپڑے بنوا رہی تھی۔ کسی کو سمبدھنوں کے لیے کپڑے خریدنے سے فرصت نہ تھی ــ ہر کوئی مصروف تھا ــ ہر کوئی دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ اس خاندان کی پہلی خوشی تھی۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ بہت دھوم دھام سے منگنی کی رسم ادا ہونا تھی۔

تابی سے یہ سب بھلا کیونکر برداشت ہو سکتا تھا۔ اس جہنم کدے میں تو وہ سانس بھی نہ لے سکتے تھے۔ سارے بدن میں آگ لگی تھی۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ جینی کو دیکھ دیکھ کر آگ اور بھڑکتی تھی۔

کبھی جینی پر غصہ آتا ــ کبھی اپنے آپ پر تاؤ ــ کبھی جینی قابل رحم لگتی۔ کبھی اپنا آپ ترس کے قابل ــ چند دن وہاں رہے تو الجھتے ہی رہے ــ

پھر ــ

چپ چاپ کراچی چلے آئے۔

آتی دفعہ جینی کو بھی نہ ملے۔

کئی دن تڑپے۔

کئی راتیں جاگ کر گزاریں۔

کھوتے کھوتے پھرے۔

خون کے آنسو بہاتے۔

لیکن

حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ پڑھائی کا حرج ضرور ہو گیا۔ آخری سال کا کورس دو سالوں پر پھیل گیا۔

لیکن

آخر

بے قراری کو قرار آ ہی جاتا ہے۔ وقت بہت بڑا طبیب ہے۔ زخموں کی چارہ گری اسے خوب آتی ہے۔ تابی بھی اس طبیب کے رحم و کرم پر تھے۔ سنبھالا مل ہی گیا۔

جینی کی شادی دوسرے سال ہو گئی ــ سب گھر والے شادی میں شریک ہوئے صرف تابی نہیں گئے۔

رینا شادی میں شریک ہوئی تھی۔ واپس آ کر رک رک کر تفصیل بھائی کو بتانے لگی۔

"ہائے تابی بھائی جینی باجی اتنی پیاری لگ رہی تھیں دلہن بن کر ــ کہ کیا بتاؤں ــ ؟ شاید کسی کی نظر ہی لگ گئی تھی جو بے ہوش ہو گئیں ــ بہت روئی تھیں نا ــ"

تابی کی آنکھیں گہری گہری لال لال ہوگئیں۔ چہرے پر اداسی کا تاثر پھیل گیا تو رینا نے حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا۔ اتنے مضطرب ایسے بے چین نظر آرہے تھے کہ رینا کا دل کانپ گیا۔

اس نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ نہیں پوچھا۔ لیکن یہ جان گئی کہ تابی جینی کے لیے کیا تھے اور جینی تابی کے لیے کیا؟ اس کے ذہن میں کئی واقعات لہرا گئے جو اس بات کی کھلی تصدیق تھے۔

اسے دلی افسوس بھی ہوا لیکن کر کیا سکتی تھی۔

کئی دنوں بعد اس نے تابی سے کہا "ایک بات پوچھوں بھیّا۔؟"

"کیا۔؟"

"بتائیں گے۔؟"

"ہاں۔"

"جینی آپ کو اچھی لگتی تھی نا۔"

تابی کا چہرہ ایک دم دھواں ہوگیا۔ تلخی سے بولے "یہ کیا پوچھنے کی بات ہے؟"

"پھر بھی بھیا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

وہ چپ ہوگئے۔ سر جھکا لیا اور ہاتھوں کو مسلتے چلے گئے۔

"آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا۔" رینا کا دل بھائی کی حالت پر تڑپ گیا۔

"چلو چھوڑو رینا۔ یہ باتیں۔ کیا لینا ہے اب۔ کوئی اور بات

کرو۔" اک گہری سرد آہ بھر کر تابی نے کہا۔

رینا چپ ہوگئی۔

وقت کا دھارا بہتا چلا گیا۔ دن مہینے اور سال گزر گئے۔ تابی بہل گئے دل کا گھاؤ بھر گیا۔ زندگی سے مفاہمت کرلی۔ رینا اب کبھی کبھی انہیں جینی کے حوالے سے چھیڑا کرتی تھی۔ بس یہی واسطہ رہ گیا تھا جینی سے۔ ورنہ زندگی معمول پر آچکی تھی۔ ہاں کبھی کبھی ٹھہرے ہوئے پانی میں جیسے کنکر پھینکنے سے ہلچل ہوتی ہے اسی طرح جینی کے متعلق کوئی نئی بات علم میں آنے سے تابی چند لمحوں کے لیے بے سکونی محسوس کرتے تھے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے آپ کو انہوں نے شعوری کوششوں سے سنبھالا تھا۔

کوشش کا ایک حصّہ یہ بھی تھا کہ چار سال سے انہوں نے لاہور جانا چھوڑ رکھا تھا۔ لاہور کے نام ہی سے انہیں وحشت سی محسوس ہوتی تھی۔ گو اب جینی وہاں نہیں تھی اپنے ڈاکٹر شوہر کے ساتھ ٹیکساس چلی گئی تھی لیکن پھر بھی وہ وہاں نہیں جاتے تھے۔ وہاں ان کا دل اجڑا تھا۔ اس دل پر قیامتیں ٹوٹی تھیں۔ اک نہ معلوم سا خوف اب بھی ان کے حواس پر لاہور کے نام سے مسلّط رہتا تھا۔

ایک گہری سرد آہ بھر کر تابی نے آنکھیں کھول کر اپنے چاروں اور دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا بھر گیا تھا۔ شام رات کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ کھلی کھڑکی سے بھی روشنی کی کوئی کرن اندر نہ آرہی تھی۔ غالباً اس طرف کے چمن کی آج بتی جلائی نہ گئی تھی۔

تابی کرسی سے اٹھے۔ اتنی دیر سے ڈھیر ہوئے بیٹھے تھے۔ جسم حرکت نہ کرنے کی وجہ سے شل سا ہو گیا تھا۔ کرسی سے اٹھنے میں انہیں کچھ اینٹھن سی بھی محسوس ہوئی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر بازو اوپر اٹھائے پھر نیچے کئے۔ دو چار مرتبہ یوں ہی کیا پھر پاؤں باری باری زمین پر ٹپکے۔ جسم میں کچھ تنومندی آ گئی۔

وہ کچھ دیر کمرے ہی میں کھڑے رہے۔ بتی جلا دی۔ اندھیرا گل ہو گیا۔ اور کمرے کی ہر چیز برقی روشنی میں چمکنے لگی۔ کمرے ہی کا سا عالم ان کے صحن بھی تھا۔ چند لمحے پہلے وہاں گھورا اندھیرا تھا لیکن اب انہوں نے ذہن کو جھٹک کر ماضی کے پنجے سے چھڑا لیا تھا۔ گزرے لمحے لوٹ کر نہیں آتے۔ انہیں پکڑنے کی سعی لاحاصل ہوتی ہے پھر لاحاصل کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کی حماقت کیوں کی جاتے۔ اس سوچ نے انہیں تازہ دم کر دیا اور وہ چمکنے کا سا انداز بناتے اپنے کمرے سے باہر آ گئے — امی ابھی تک نہ آئی تھیں۔

اور

رینا کی دوست بھی یہیں تھی۔

وہ باہر لان میں چلے گئے جہاں بہار کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں اور چمن کی روشن بتیوں میں پھولوں کے رنگین چہرے چمک رہے تھے۔

رات کھانے کی میز پر وہ حسب معمول خوش و خرم بیٹھے تھے۔ رینا ان کے سامنے تھی۔ ابو اپنی کرسی پر اور امی اپنی مخصوص نشست پر۔

رینا نے جان بوجھ کر لاہور کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"امی تابی بھیا کے ساتھ میں بھی لاہور جاؤں گی" اس نے کہا۔

"ہاں تابی بیٹے تمہاری دادی اماں نے تمہیں بلا بھیجا ہے۔ باہر جانے سے پہلے ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔" ابو نے تابی کو بتایا۔

"دادی اماں کو یہاں کیوں نہ بلا لیا جائے" تابی نے تجویز پیش کی۔

"بری بات ....." رینا ہنسی "آپ کا جانا فرض ہے"

"بالکل —" امی نے کہا ....." سال سوا سال کے لیے جا رہے ہو۔ سبھی سے مل لینا۔ یوں بھی تمہیں کتنا ہی عرصہ ہو گیا لاہور گئے —"

"چار سال" رینا نے شوخی سے آنکھیں گھمائیں" تابی مسکرا دیئے۔

"میرے خیال میں دو دن کے لیے چلے ہی جاؤ" ابو بولے۔

"دو دن تو سفر ہی میں کٹ جائیں گے" رینا نے چھیڑا — جانتی تھی تابی اتنے لمبے سفر سے چڑ لگتی ہے۔

"بابی آئیر چلا جائے گا۔ اس کے پاس وقت بھی تو کم ہے —"

امی بولیں۔

"ابھی تو پورا ایک مہینہ ہے" رینا نے کہا۔

"اور یہ مہینہ تو میں لاہور ہی میں گزاروں گا —" چڑ کر تابی بولے۔ تو سب ہنس دیئے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی تابی کو لاہور جانے کے لیے کچھ وقت نکالنا پڑا۔ مگر تھے، امی یہی چاہتی تھیں اور رینا بھی اصرار کر رہی تھی۔ اس کا اپنا جی

بھی جانے کو چاہ رہا تھا۔ اسی لیے زور لگا رہی تھی۔ شاید تابی بھیا اسے ساتھ لے ہی جائیں۔

تابی پانچ بجے شام کی فلائیٹ سے لاہور پہنچ رہے تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ دادی اماں بہت خوش نظر آ رہی تھیں تائی امی مسرور تھیں۔ عمو، جیدی اور ککی تابی بھیا کی آمد کے منتظر تھے۔ چار سال تابی آ رہے تھے۔ اپنے اس چچا زاد کو ملنے کے لیے بے چین تھے۔ جب آیا کرتے تھے۔ تینوں بھائی چھوٹے چھوٹے تھے لیکن چار سالوں میں سیا ہو گئے تھے۔ عمو تو سیکنڈ ایر میں تھا اس لیے تابی کے آنے پر پکچر دیکھنے کسی کیفے میں چائے پینے کے پروگرام بنا رہا تھا۔

بینی نے بھی تابی کے آنے کی خبر سنی تھی۔ اب وہ تیرہ چودہ سالہ سی لڑکی نہیں تھی کہ جسے سارا سارا دن کدکڑے لگاتے پھرنے کے سوا نہ تھا۔ بے معنی باتوں پر بے تکے پن سے ہنستی رہنے والی بینی اب خاصی سی جوان لڑکی تھی ــ وہ بی اے کے پہلے سال میں تھی۔ سارا سارا وقت کمرے میں کتابی کیڑہ بنی رہتی۔ جتنی شوخ اور چنچل تھی اتنی ہی سنجیدہ باوقار بن گئی تھی۔

تابی کے آنے کی خبر سنی تو چہرے پر گلابی گلابی رنگ لہرا گئے۔ آنکھوں میں جیسے قندیلیں جل اٹھیں۔ جسم دہکنے لگا اور سانسیں کچھ الٹ پلٹ ہونے لگیں ــ

دراصل اس نے اپنی امی اور دادی اماں کی وہ گفتگو سن لی تھی جو وہ بڑی رازداری سے کر رہی تھیں ــ اتفاق ہی سے وہ دادی اماں کے کمرے سے کچھ لینے جا رہی تھی کہ باتوں کی بھنک نے قدم روک لیے۔ تابی کا ذکر تھا ــ اس کا نام بھی لیا جا رہا تھا ــ وہ ٹھٹھک گئی۔

دادی اماں کہہ رہی تھیں "بہت نیک بچہ ہے ماشاءاللہ لائق بھی ہے۔ اب تو کورس کرنے باہر جا رہا ہے ــ بینی کے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کہاں سے ملے گا ــ؟"

"بالکل ماں جی ــ مجھے تو شروع ہی سے وہ بہت پیارا لگتا ہے۔" امی جواب میں بولی تھیں۔

"عاصم اور چھوٹی بہو بھی بینی کو بہت چاہتے ہیں۔ عاصم نے تو پچھلی بار جب آیا تھا یہ خواہش خود ہی ظاہر کی تھی۔"

"پھر.... پھر آپ نے کیا کہا تھا؟"

"میں کیا کہتی۔ اس نے خود ہی کہہ دیا تو میں خوش ہو گئی۔ جوڑی ماشاءاللہ خوب ہے۔ بہت خوبصورت جوان ہے تابی۔ تم نے تو چار سال سے اسے دیکھا نہیں نا..... میں پچھلے سال دیکھ آئی تھی۔"

"اپنا بچہ ہے۔ ہمیں اور کیا چاہیے؟"

"میں نے اسے اسی لیے تو بلایا ہے۔ بینی سے مل لے ــ بینی اسے دیکھ لے۔"

امی اس بات پر ہنس دی تھیں ــ تو دادی اماں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

وہ سوا سال کے لیے باہر جا رہا ہے بیٹی — بینی کو اس نے بہت پہلے دیکھا ہوا ہے جب تو وہ بچی تھی —"

"ہوں —"

اور پھر دونوں سرگوشیوں میں جانے کیا کچھ کہتی رہی تھیں۔ ان کی دبی ہنسی بھی بینی نے سُنی تھی۔ دونوں بہت خوش تھیں۔

بیٹی کے خیالوں نے پلٹا کھایا — پڑھائی میں ڈوبی رہنے والی بینی خیالوں کی آماجگاہ وہ وجود بن گیا جسے جانتے ہوتے بھی نہ جانتی تھی جو اپنا بھی تھا اور پرایا بھی۔

لیکن جذبات کا تندریلا تھا۔ جوانی کی اپنی ہی سوچ تھی۔ سوچ کے تانے بانے میں اُلجھے رہنے والے تصوراتی پیکر کو وجود مل گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق ڈوب کر سوچنے لگی۔

وہ جانتی تھی کہ جینی باجی اور تابی بھیا ایک دوسرے کو پسند کرتے لیکن یہ بات پرانی ہو چکی تھی۔ جینی دو سال سے ٹیکساس میں تھی۔ اس پیاری سی بچی ہو چکی تھی۔ بینی کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بڑی مدت سے کو چاہتی چلی آ رہی ہے۔ اس وقت سے جب وہ تابی بھیا اور جینی باجی کے درمیان رابطے کا کام کرتی تھی لیکن یہ چاہت خوابیدہ تھی۔ امی دادی اماں کی باتوں سے یکایک جاگ اٹھی۔

اسے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔

وہ شام بڑی حسین تھی۔ سردی کی آمد آمد تھی۔ موسم نکھرا ہوا

بلکورے لیتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں فضا کو یخ کرنے پر آمادہ تھیں۔ کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں سرِ شام بند کر دیئے جاتے تھے۔ ابھی ہیٹر چلانے کی تو ضرورت نہ تھی۔ ہاں ٹھنڈی ہواؤں کی بے روک ٹوک آمد بھی گوارہ نہ تھی۔ اسی لیے کھڑکیاں بند کر کے بھاری بھاری پردے شام ہوتے ہی گرا دیئے جاتے تھے۔

بینی نے بھی اپنی کھڑکی بند کر کے پردے گرا دیئے تھے۔ وہ اس وقت اپنے کمرے ہی میں تھی۔ عموا در جیدی تابی بھیا کو لینے ایئر پورٹ جا چکے تھے۔ انہیں گئے کافی وقت ہو چکا تھا۔ کوئی دم میں وہ واپس آنے ہی والے تھے۔

دادی اماں ابو اور امی تو ان کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے لیکن باری باری برآمدے میں نکل کر تابی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بینی سے چھوٹی بمی اور سب سے چھوٹا بھائی ککی کو بھی تابی کا انتظار تھا۔ انہیں یقین تھا کہ کراچی سے وہ ان کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئیں گے۔

بینی بھی بار بار بند کھڑکی کے پردے سرکا کر بیرونی گیٹ کو دیکھ رہی تھی اس کا دل جوں جوں وقت گزر رہا تھا دھک دھک کر رہا تھا۔ گالوں پر آپ ہی آپ گلابی رنگ بکھر رہا تھا۔ دادی اماں اور امی کے پلان کا راز سینے میں مچل کر ہلچل مچا رہا تھا۔

گاڑی کے پورچ میں رُکنے کی آواز آئی۔ پھر آوازوں کا ایک شور

بلند ہوا۔ بینی سمجھ گئی کہ تابی آگئے۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر برآمدے میں
چلی جائے اور خوش آمدید کہنے والوں کی صف میں وہ بھی شامل ہو جائے
— لیکن اس کے قدم تو جیسے زمین میں ہی گڑ گئے تھے۔ آوازوں پر کان
تو لگاتے رہی لیکن کمرے سے باہر نہ نکل سکی۔

تابی آگئے تھے۔ سبھی ان سے مل رہے تھے۔ پیار کر رہے تھے، شکر
ہو رہے تھے، ہنس بول رہے تھے۔

"ہائے تابی — چار سال تم نے ادھر کا رُخ نہ کیا۔ ناراض ہو گئے تھے
کیا۔" تائی نے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"اب بھی اگر نہ آتے تو میں —" دادی اماں نے کہا تو عمو جلدی
سے بولیں۔ ... تو ..... تو کیا کرتیں دادی اماں؟"

"اس کا دو کانوں میں سر کر دیتی۔" وہ ہنس کر بولیں۔ سب ان کی
بات پر ہنسنے لگے۔

اور تابی بھی جو اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے عجیب سی بے کلی اور
نہ معلوم سی بے چینی محسوس کر رہے تھے ان کے سنگ ہنسنے لگے۔

سب ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ اِدھر اُدھر کی خیریت پوچھی گئی —
حال احوال معلوم کیا گیا۔ تائی اماں نے ملازم کو چائے بنا لانے کا کہا۔

بجی اور ککی تابی کے دائیں بائیں آبیٹھے۔

"تم — بجی ہو —" تابی نے حیرانگی سے دس بارہ سالہ لڑکی کو دیکھا

اتنی چھوٹی سی تھیں چار سال پہلے —"

"میں بھی تو چھوٹا سا تھا نا تابی بھیا۔" ککی نے کہا۔ "پانچ سال کا تھا۔
اب نو سال کا ہوں۔"

"ہاں بھئی تم واقعی بڑے ہو گئے ہو۔ ان دنوں تو ہر وقت ریں ریں
ہی کرتے رہا کرتے تھے — بڑے ضدی تھے — اب کیسے ہو؟"

"اب بھی ویسا ہی ہے —" ابو نے کہا — "ضد بہت کرتا ہے۔"

"کب کرتا ہوں ضد —" ککی نے نالاں نظروں سے باپ کو دیکھا۔
"جو چیز کہتا ہوں لا کر تو دیتے نہیں اور کہتے ہیں کہ ضد کرتا ہوں۔"

"تابی اس کی بات پر مسکرا دیئے پھر اس کی پشت پر تھپکی دیتے
ہوئے بولے۔ "چلیئے بھئی۔ ہم لا دیں گے جو کچھ کہہ دیں گے۔"

"توبہ توبہ ..... اس کو منہ نہ ہی لگانا۔" تائی پیار سے بولیں — بہت
سر چڑھ جاتا ہے۔"

"سب سے چھوٹا جو ہے۔" دادی اماں نے کہا۔ "لاڈلا ہے نا —"

"آپ ہی نے اسے خراب کیا ہے۔" ابو بولے۔

چند لمحے بچوں ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ عمو اور حبیبی چپ بیٹھے تھے۔
تابی اب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ کس کلاس میں ہیں عمو؟"

"سیکنڈ ایئر —"

"میڈیکل —"

"نان میڈیکل۔"

انجینئر بنیں گے صاحبزادے۔" ابو نے کہا۔

عمر مسکرانے لگا۔" تابی بھیا کی طرح۔ پھر کورس کے لیے باہر بھی جاؤں گا۔"

"اس کی طرح محنت کروگے جب نا!"

"اور آپ کس کلاس میں ہیں جیدی؟"

"میٹرک کا امتحان دوں گا۔"

"لائق ہو یا یوں ہی!"

"لائق ہوں۔ ڈاکٹر بنوں گا۔"

"ڈاکٹر تو بینی نے بھی بننا تھا بس رہ گئیں۔" عو نے کہا تو تابی کو بینی کا خیال آگیا۔ جلدی سے کمرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولے۔" بینی کہاں ہے۔ اسے تو دیکھا ہی نہیں۔"

"بینی باجی اپنے کمرے میں ہیں۔" بمی اٹھتے ہوئے بولی۔

"اسے پتہ نہیں چلا۔ میرے آنے کا۔" تابی بولے

"جاؤ بیٹے بلا لاؤ باجی کو۔" ابو نے بمی سے کہا۔" اسے کیا ہوا ہے؟ پتہ تو تھا تابی آرہے ہیں۔"

بمی نے تابی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔" آئیں بینی باجی کے پاس چلیں۔"

تائی اور دادی اماں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ کچھ بولیں نہیں۔ ہاں ابو

بولے۔" اسے ہی بلا لاؤ۔"

"جانے دو۔" تائی نے کہا۔" وہ بلانے پر آئے گی تھوڑا ہی ——"

بمی تابی کو ہاتھ سے تقریباً کھینچتے باہر لے گئی۔ برآمدے کے پہلے گھماؤ پر ہی بینی کا کمرہ تھا۔ بمی خوب باتونی لڑکی تھی۔ بینی کے کمرے تک پہنچنے میں کتنی ہی باتیں کر ڈالیں۔ تابی مسکراتے گئے۔ جینی کا کمرہ اب بینی کے تصرف میں تھا۔ تابی نے قدم اندر رکھا تو کئی یادیں سینے میں مچل گئیں۔ جینی کا شرماتا لجاتا پیکر نگاہوں میں گھوم گیا۔ درد کی لہر سی اٹھنے لگی۔ جی چاہا اندر جانے کی بجائے واپس لوٹ جائیں لیکن بمی انہیں کھینچے اندر لے جا رہی تھی۔

"بینی باجی۔ بینی باجی....." وہ تابی کا ہاتھ چھوڑ کر بینی کی طرف دوڑی جو الماری کھولے کھڑی تھی۔

بمی کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

اور ——

تابی جو تیرہ چودہ سالہ الہڑ سی بے پرواہ لڑکی کا ذہن میں تصور لیے کھڑے تھے۔ بینی کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ حیرت اور اچنبھے سے وہ ششدر رہ گئے۔

بینی کی حسین آنکھوں میں کھوتے ہوئے ستاروں کی ساری چمک بھر گئی۔ گلابی گلابی گال لو دینے لگے۔ ہونٹ تھرتھرائے۔

چار سال پہلے والے دبلے پتلے انیس بیس سالہ لڑکے کی بجائے اس کے

سامنے ایک خوبصورت گرانڈیل جوان کھڑا تھا جس نے سلیقے سے لباس پہنا ہوا تھا اور جس کی پرسنیلٹی ایک دم چیلنج تھی۔

شرما کر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

اور

تابی بھی کی موجودگی کو ایک دم نظر انداز کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کی جانب کھنچے۔

"تم — بینی — ہو"۔ انہوں نے خوبصورت آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لیکن دوسرے لمحے انہیں یوں لگا جیسے کئی سو والٹ کا کرنٹ لگا ہو بینی نے ہاتھ کھینچا اور انہوں نے چھوڑ دیا۔

وہ بینی کو پھر بھی دیکھتے چلے گئے۔ بینی شرماتے جا رہی تھی۔ گال گلابی سے سرخ ہوتے جا رہے تھے۔ الماری کا پٹ پکڑے وہ نگاہیں جھکاتے کھڑے مسکرا رہی تھی۔

"تم اتنی بڑی ہو گئیں — ؟" بے تکی سی بات تابی کے لبوں سے نکلی۔

"اتنی ہی رہتی" وہ زیر لب مسکراتے ہوتے بولی۔ جھکی ہوئی نگاہیں اٹھائیں اور تابی کو شوخ شوخ نظروں سے دیکھا۔

تابی اپنے دل کو ان نظروں کی گرفت سے نہ بچا سکے۔ پُرشوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوتے بولے۔ "میرے ذہن میں آپ وہی تھیں — الہڑ شوخ سی بچی —"

"بچی —" وہ ہنس دی۔ اس کے خوبصورت دانت چمک رہے تھے۔

"لیکن آپ تو —" وہ دانستہ چپ ہو گئے — ویسے ان کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

"کیا ہوں —؟" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"جی چاہتا ہے —" وہ مسکراتے — رکے اور پھر بولے قیامت کہہ دوں —"

بینی نے شرما کر چہرہ بازو میں چھپا لیا تو تابی کو احساس ہوا کہ انہیں یہ بات شاید نہیں کہنا چاہیئے تھی۔ لیکن بات کہہ چکے تھے اور بات اثر بھی دکھا چکی تھی۔ کچھ نادم سے ہوئے، خجل سے نظر آئے لیکن من میں روشنی روشنی سی پھیل گئی۔ بھرپور مسرتوں کا احساس بھی ہوا۔

ملازم چائے کے لیے بلانے آ گیا تھا۔ وہ اپنے قدموں پر گھوم گئے اور سرشار سرشار سے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

دو دن کا قیام بڑا ہی حسین تھا۔ بینی کی قربتیں سہانی تھیں۔ حسن کی قیامت خیزی عشق کے جنون کو ہوا دیا ہی کرتی ہے۔ تابی کو بینی اپنی زندگی کا محور محسوس ہونے لگی۔ مختصر سے عرصے میں انہوں نے تو جیسے صدیوں کی مسافتیں طے کر لی تھیں۔

ان دو دنوں میں جینی کا بھی ذکر ہوا۔ تابی نے یہ بھی سنا کہ وہ اپنے گھر میں کچھ خوش نہیں ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اس کا میاں دور دیس لے جا کر اس پر خالص شوہرانہ قسم کی سختیاں بھی کر رہا ہے۔

لیکن

ان باتوں کا انہوں نے زیادہ اثر نہیں لیا۔ جذبہ ترحم کو ابال آیا تو بینی کی قربت میں یہ اُبال بیٹھ گیا۔ انسان اپنی غرض کا غلام ہے شاید۔ خود غرض اور بے رحم بھی ہے۔ تابی بھی انسان سے ماورا، تو کوئی شے نہ تھے۔ حسن کا داؤ کارگر ہوا تھا۔ ماضی سے دامن چھڑا کر حال میں جینے کی شعوری سعی کرنا بھی تو کوئی بُری بات نہ تھی۔

چار سال پہلے کے تابی اور اب کے تابی میں خاصا فرق بھی آگیا تھا وہ اب اچھوتے سے لڑکے نہ تھے جوان آدمی تھے۔ جن کا دل و دماغ سوچیں ذہن ان کے تابع تھے۔ اپنے اوپر بھرپور اعتماد تھا۔ جو قدم اٹھانا تھا وہ سوچ سمجھ کر اٹھا سکتے تھے۔

بینی کی محبت کا شعلہ تو پہلی نظر ہی میں جل اٹھا تھا۔ دو دن اس کے ناز و ادا دیکھے تو محبت کچھ جنوں خیز ہو گئی۔

جس صبح انہوں نے کراچی واپس لوٹنا تھا اس کی شب کے بہت سے اور بے شمار لمحے انہوں نے درختوں کے پُراسرار سایوں اور چمن کے مہکتے حصوں میں گزار دیئے۔ اٹھتے بیٹھتے اور ایک دوسرے کی قربت کے احساس سے مغلوب ہو کر گزارے۔

"بینی میں سمجھتا تھا اب میں کبھی محبت نہ کر سکوں گا۔ یہ جذبہ جینی اپنے ساتھ ہی سمیٹ کر لے گئی۔ لیکن جب تمہیں دیکھا تو یوں لگا جیسے خواب سے جاگا ہوں۔ جینی کے ساتھ جو جذبات وابستہ تھے وہ اب بچگانہ

کھیل سا لگتے ہیں۔ میری روح تمہاری تلاش میں ازل سے سرگرداں تھی۔ تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے شاید جینی سے ٹکرا گئی تھی۔ اب میں نے تمہیں پا لیا ہے بینی۔ تمہیں میری تلاش ہو۔ تم ہی میرا آئیڈیل اور میرا مقصد حیات ہو۔"

بینی ان مسحور کن باتوں سے مغلوب ہو گئی اور اس نے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

تابی نے اس کا پیارا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں لاہور آنا نہیں چاہتا تھا بینی۔ اب سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ اگر میں یہاں نہ آتا تو تمہیں کیوں کر پاتا۔؟"

"تابی۔ تم آتے بھی۔ اور چلے بھی جاؤ گے۔" وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ "اس سے تو اچھا تھا نہ ہی آتے۔"

"بینی۔ مجبوری ہے۔ میں سوا سال کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ یہ عرصہ میرا دل ہی جانتا ہے کیسے گزرے گا۔ تم ہر لمحہ ہر آن مجھے یاد آؤ گی۔"

بینی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "تم درد کی اذیت سے دوچار کر کے جا رہے ہو تابی۔"

"یہ درد ہی زندگی ہے بینی۔ کتنا پیارا۔ کتنا عزیز ہو گا یہ درد۔"

"ہاں۔"

"تابی نے اس کے آنسو پونچھے۔ "سوا سال کا طویل عرصہ ہم ایک دوسرے سے ملنے کے انتظار میں کاٹ دیں گے بینی۔ پھر واپس آ کر میں تمہیں

اپنا لوں گا۔"

بینی نے سر جھکا لیا۔ وہ کوشش کے باوجود آنسو ضبط نہ کر سکی۔

جانے سے پہلے دادی اماں نے تابی کو اپنے کمرے میں بلایا۔ باہر جا کر اک شریفانہ زندگی بسر کرتے اور لگن سے کام کرنے کی انہوں نے تابی کو نصیحت کی۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے رہے۔

"واپس آتے ہی تمہاری شادی کر دوں گی۔" دادی اماں نے غیر متوقع طور پر کہا تو تابی نے جلدی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"کہاں دادی اماں؟" وہ نذرے بے چینی سے بولے۔

"جہاں کہو گے۔"

تابی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے دادی کو دیکھا۔ شکریہ دادی اماں —"

دادی اماں چند لمحے چپ رہیں پھر آہستگی سے بولیں۔ "جینی کی عیزوں میں شادی کر کے کیا پایا ہے۔ پتہ نہیں وہاں وہ کس حال میں ہے۔ بینی —" وہ چند لمحے رکیں تابی کو دیکھا اور بولیں۔ "بینی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ اپنی جگہ سے جیسے اچھل کر اٹھے اور صوفے پر بیٹھی دادی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر خوشی سے ان کے گال پر پیار کرتے ہوئے بولے۔ "آپ کتنی سویٹ ہیں دادی اماں —؟"

"منظور —" دادی اماں نے پیار سے پوچھا۔

"منظور —" وہ بولے۔

"چلو میرا بوجھ تم نے کم کر دیا لیکن تابی یہ ساری بات تمہاری واپسی پر طے ہوگی۔ خدا جانے وہاں جا کر تم کیا سے کیا بن جاؤ۔ میں نہیں چاہتی بچی کا نام لیا جائے — ہاں واپس بخیریت آ گئے تو — سب طے ہو جائے گا۔"

بات معقول تھی۔ تابی اپنے سینے میں مچلتے طوفانوں کو دادی اماں کے سامنے بکھیر نہ سکتے تھے۔ خاموش ہو گئے۔ دادی اماں اس مسئلے کے ہر نازک پہلو پر بڑی دلجمعی سے بات کرتی رہیں۔ تابی کو اپنے جذبۂ عشق پر اعتماد تھا۔ بینی کے جذبات کی سچائی کا بھی یقین تھا۔ اس لیے سوا سال گزارنا آسان نہیں تو مشکل بھی نہ تھا۔

دس بجے کے پلین سے تابی کراچی واپس ہو گئے۔ بینی کی الوداعی ڈبڈبائی نگاہیں ان کے سینے میں درد کی لطیف سی ٹیسیں پیدا کرتی رہیں۔

واپسی پر وہ بہت خوش تھے۔ رینا نے ان میں ایک نمایاں فرق محسوس کیا۔ کہاں تو لاہور جانے کا نام ہی نہ لیتے تھے کہاں باتیں ہی لاہور کی کئے جا رہے تھے۔

سہ پہر کو جب بیرونی لان میں سب نے چائے پی تو وہ بے انتہا خوش تھے۔ چہک چہک کر لاہور کے دو روزہ قیام کی رنگین کہانی سنا رہے تھے۔ امی ابو کسی مہمان کے آ جانے سے اٹھ کر چلے گئے تو رینا شوخی سے بولی۔ "بہت بھایا لاہور تابی بھیا۔"

"ہاں —"

"لگتا ہے کچھ مل گیا ۔"

"واقعی مل گیا ۔"

"کیا ۔ ؟"

"منزل کا سراغ ۔"

"واقعی ۔"

"ہاں ۔"

"وہ منزل ۔"

"بینی ۔"

"سچی ۔"

"ہاں رینا ۔"

تابی بھیا گنگناتے ہوئے کرسی سے اُٹھ گئے ۔ رینا انہیں بڑے غور سے دیکھنے لگی ۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی تابی ہیں جو جینی کے شیدائی تھے ۔ جو جینی کی منگنی ہو جانے پر اکھڑے اکھڑے بکھرے بکھرے تھے جو اس کی شادی کی خبر سے متوحش نظر آتے تھے ۔

کیا لڑکیاں بھی فیشن کی کوئی رو ہوتی ہیں ۔ جو گزر جانے پر آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتی ہے ۔ رینا کو سوچ کر افسوس بھی ہوا لیکن جلد ہی اس سوچ کو اس نے جھٹک دیا ۔ جینی کی شادی ہو چکی تھی ۔ اب اسے یاد کرنا یا اس کی یادوں کے سہارے زندگی گزار دینا حماقت کے سوا کیا تھا لیے ہے ۔ ؟"

اچھا ہوا جو تابی نے بینی کا انتخاب کر لیا ۔ بینی اسے اچھی بھی تو بہت

لگتی تھی ۔

سوا سال کا عرصہ بخیر و خوبی گزار کر تابی واپس آئے تو لاہور جانے کی لگن امنگ بن کر دل میں مچل رہی تھی ۔ تیسرے دن ہی انہوں نے لاہور کے لیے نشست جہاز میں لے لی ۔

"بہت بیتاب ہو رہے ہیں تابی بھیا ۔" رینا نے چھیڑا ۔

"دادی اماں ، تائی اور تایا ابو سے ملنے نہیں جانا ۔" وہ بولے ۔ اور برابر مسکرائے جا رہے تھے ۔

"جی ہاں صرف انہی سے تو ملنے جا رہے ہیں ۔"

"اور کس سے ؟"

"جو من میں بسی ہے ۔"

"یعنی ۔"

"بینی ۔"

"اوہو ۔ کس کا نام لے لیا ۔ مجھے تو وہ یاد بھی نہیں تھی ۔"

"اچھا جی ۔"

"ہاں جی ۔"

"اور وہ جو ڈائمنڈ کی رنگ جناب نے چھپا کر رکھی ہوئی ہے ۔ کیا میرے لیے ہے ۔ ؟"

"شریر ۔ تو نے رنگ بھی دیکھ لی ۔"

"ساری تلاشی لے لی تھی۔"

"کیسی ہے انگوٹھی ۔؟"

"لگن اور پریت سے خریدی ہے تو اچھی ہی ہے۔"

"گویا ویسے اچھی نہیں۔"

وہ ہنس پڑی۔

تیسرے دن وہ مستقبل کے سہانے سہانے سپنے آنکھوں میں لیے پہنچ گئے۔ اپنی آمد کی دانستہ اطلاع نہیں دی۔ وہ بینی کو غیر متوقع پر مل کر اس کی خوشیوں کا رنگ دیکھنا چاہتے تھے۔

ایئرپورٹ سے ٹیکسی لے کر وہ گھر پہنچے۔

شام اُتر چکی تھی۔ لان کی بتیاں روشن تھیں۔ بوڑھا ملازم گیٹ پر قریب چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کوٹھی کا رکھوالا کتا ریکسی درختوں تلے گھر رہا تھا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی تھی اور گھر کی کافی بتیاں جل رہی تھیں۔

تابی بے تابی کو چھپانے کی کوشش کرتے ٹیکسی سے اترے۔ ملازم اسے دیکھ کر بیگ پکڑ کر سلام کیا۔ ان کے آنے کی جلد ہی سب کو خبر سبھی برآمدے کی طرف لپکے۔

"کب آئے ؟"

"اطلاع بھی نہ دی۔"

"فون ہی کر دیتے۔"

"کیسے رہے ؟"

"کورس مکمل کر لیا۔"

"کراچی میں سب کیسے تھے ؟"

"وہاں کب آئے ؟"

اپنے گھیرے میں لیے گھر کے سبھی افراد سوال پہ سوال کر رہے تھے۔ تابی مسکرا مسکرا کر سب سے ملتے ہوئے جواب دے رہے تھے۔ انہوں نے بینی کو بھی برآمدے میں کھلنے والے دروازے میں کھڑے دیکھا۔ سلام کے جواب میں اس نے سر ہلکا سا جھکایا اور اندر غائب ہو گئی۔

تابی ڈرائینگ روم میں آ گئے۔ دادی تائی، تایا، عمو، جیدی اور بڑی پھپھو ان کی بیٹیاں جو یہاں آئی ہوئی تھیں ان کے ساتھ ہی اندر آ گئیں۔ سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ تابی نے محسوس کیا دادی اماں تائی اور تایا ابو کچھ اداس اداس سے تھے۔ اک نہ معلوم سی اداسی انہیں فضا میں رچی بسی محسوس ہوئی۔

وہ چائے پینے کے بعد وہاں سے اٹھ آئے۔ بینی سے ملنے کی تمنا دل میں موجزن تھی۔ وہ انگوٹھی کو جیب میں محسوس کرتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ ان کے ہونٹوں پر کسی خوبصورت مصرعے کے رومانوی الفاظ تھرک رہے تھے۔

دروازہ نیم وا تھا۔ دھک دھک کرتے دل اور جگ مگ کرتی مسکراہٹوں کو لیے انہوں نے دروازہ دھیرے سے بجایا۔

نیم وا دروازے سے انہیں پلنگ کے قریب اپنی طرف پشت کئے

کھڑی وہ نظر بھی آرہی تھی۔ دروازہ بجنے پر اس نے بغیر پلٹے شا
"ہوں" کہا۔

"بینی ۔۔۔" وہ تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ ان کی آ
جوشِ جذبات سے مغلوب ہو رہی تھی ۔۔ اور شائد اسی جوشِ جنوں
وہ بینی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف گھما لیتے۔

کہ ۔۔

وہ خود ہی گھوم گئی ۔۔

وہ بینی نہیں تھی۔

جینی تھی۔

جینی۔

جو اپنی بچی شہناز کو سلانے کے بعد پلنگ کے قریب کھڑی کوئی کپڑا
کر رہی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

اور

ششدر سے کھڑے دیکھتے رہ گئے۔

جینی کا چہرہ ویران تھا۔ گہرے سناٹوں کی چھاپ عیاں تھی جسم
لاغر اور رنگت اڑی اڑی زرد تھی ۔۔ کئی لمحے گزر گئے تو اس نے نگا
ہٹا کر سر آہستگی سے جھکا لیا ۔۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور ویر
آنکھوں پر جھکی خشک پلکیں لرز رہی تھیں۔

تابی کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ پھیلی پھیلی آنکھوں سے اسے تکتے
ہوئے جہاں کھڑے تھے وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔

خاموشی بوجھل ہو تو گراں لگتی ہے۔ جینی نے اس گراں خاموشی کی اذیت
محسوس کی تو سوکھے ہونٹوں پہ زبان کا سرا پھیرتے ہوئے مسکرانے کی
کوشش میں بولی۔ "آپ شاید بینی کو ڈھونڈنے یہاں آگئے ۔۔" ؟

اور

وہ

جانے کیسے کہہ اٹھے ۔۔ "تمہیں ڈھونڈتا بینی تک پہنچ گیا ۔۔"

جینی لرز گئی ۔۔ لیکن ان کی بات کو جیسے ان سنی کر دیا۔ جلدی سے
بولی آپ .... تو باہر گئے ہوئے تھے۔ کب واپس آئے ؟"

اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے تابی نے سر جھکا لیا اور آہستگی
سے بولے۔ "تم بیمار ہو گیا ۔۔ ؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا لیکن آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ۔۔ بڑی
مشکل سے اس نے آنسوؤں کو روکا اور بستر میں پڑی بچی پر جھک گئی۔

تابی دو قدم اٹھا کر آگے آگئے ۔۔ تم کب آئیں ؟"

"دو ہفتے ہو گئے ہیں۔" اس کی آواز گھٹ رہی تھی۔

"اکیلی آئی ہو یا ۔۔" وہ رک گئے۔

"اپنی بچی کے ساتھ آئی ہوں۔" اس کی آواز آنسوؤں میں رندھی تھی۔

تابی جذباتی مرحلوں سے گزر رہے تھے۔ جینی کی باتوں اور آنسوؤں کی نمی سے

حقیقت کو نہ جان سکے۔

وہ شاید کچھ اور کہنے کو تھے کہ دوسرے دروازے سے بینی اندر آگئی

"اوہ — آپ —" بینی کے چہرے پر سُرخی لہرا گئی۔ نگاہوں میں شوق کے سجدے ادا ہوئے — اور مسکراتے ہوئے وہ جینی کے قریب آگئی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔

"تابی تمہیں ڈھونڈتے یہاں آگئے —" جینی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بینی سے کہا۔

بینی نے اک نگاہِ غلط انداز تابی پر ڈالی اور آہستگی سے بولی "مجھے پتہ نہ تھا کہ میں پھر اپنے کمرے میں شفٹ ہو گئی ہوں۔ اوپر والے کمرے میں —"

وہ اٹھلاتے ہوئے مڑی۔ دعوتی نظروں سے تابی کو دیکھا اور بولی "میں اوپر جا رہی ہوں —"

صاف اشارہ تھا کہ تابی بھی اوپر چلے آئیں۔

لیکن

تابی کے قدم تو جیسے وہیں گڑ گئے تھے۔ ان کی تو جان پر بن آئی تھی۔ ندامت کا بار تھا جو سر اٹھانے نہیں دے رہا تھا۔ یہ احساس چبھ رہا تھا کہ انہوں نے جینی کے بعد جینی کی بہن سے پینگیں بڑھا کر بہت بڑا جرم کیا ہے۔

بڑی مشکل سے انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ جینی کی حالت متغیر

ہو رہی تھی۔ وہ کئی لمحے چپ کھڑے رہنے کے بعد کمرے سے نکل گئے۔ وہ بینی کے پاس اُوپر نہیں گئے۔ ڈرائینگ روم میں آ بیٹھے۔

اور

یہیں باتوں باتوں میں انہیں اس سانحے کا پتہ چلا جو جینی پر گزر گیا تھا اور جس نے گھر کی فضا میں اداسی سمو دی تھی۔

جینی کو طلاق ہو گئی تھی۔

چاند درخت کی آخری پھنگ میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کی زرد اور بیمار سی روشنی چہار سو پھیلی تھی۔ اندھیرے اتھاہ اور گھمبیر تھے۔ ناکافی سی چاندنی ان سے اُلجھ رہی تھی۔ چمن کا سارا حسن ملگجے اندھیروں نے نگل لیا تھا ہوائیں پراسرار سی سرسراہٹیں پیدا کرتے چل رہی تھیں۔ درختوں سے سوکھے پتے گر رہے تھے۔ بہار کی آمد تھی لیکن خزاؤں کا نزول لگتا تھا — اداسیاں فضا میں تحلیل تھیں۔

تابی چمن میں ٹہل رہے تھے۔ دماغ سوچوں کی آماجگاہ تھا۔ جینی کے حالات سن کر دکھ کی تیز دھار سینے میں اُتر گئی تھی۔ کتنے دکھ کیسی اذیتیں سہی تھیں اس بیچاری نے۔

تابی کا من مجرم تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے جینی کو سب سے بڑا دکھ انہوں نے دیا ہے۔ اس کی محبت کو بھلا کر اس کی بہن سے پیار کا ناطہ جوڑ لیا ہے۔

بے چینی انہیں چین نہ لینے دے رہی تھی۔ وہ بینی کے کمرے میں نہیں گئے تھے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ بینی ہمہ انتظار بنی ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ وہ دو بار سیڑھیوں پر جا کر واپس آ گئے تھے، وہ اپنے خیالوں میں مستغرق تھے کہ قدموں کی چاپ ہوئی۔

"تابی" بینی کی آواز آئی — ان کے قدم رک گئے اور دھیرے سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ملگجے اندھیرے میں بینی کے چہرے کے تاثرات تو نہ دیکھ سکے۔ ہاں آواز کی کپکپاہٹ ضرور محسوس ہوئی

"تم — تم بینی —" وہ بولے

"آپ کا انتظار کر کر کے تھک گئی —" وہ شاکی انداز میں بولی۔

تابی چپ کے چپ رہ گئے۔

"سوا سال کافی طویل عرصہ تھا تابی — میں نے — ایک ایک دن گن کر گزارا —"

تابی کا جی چاہا — وہ بھی گزرے دنوں کی سچائی پوری سچائی سے بیان کر دیں لیکن اس وقت وہ جس کش مکش میں مبتلا تھے یہ الفاظ ان کے لبوں پر نہ آ سکے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ بینی پھر بولی۔ "آپ کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں —؟"

"چند — دن رہوں گا — وہ بمشکل کہہ سکے۔

"یقین نہیں آ رہا کہ آپ — آپ آ گئے ہیں —" وہ مسکرا رہی تھی

اور تابی کا جی کہہ رہا تھا — "میں نہیں آیا بھئی — میں نہیں آیا۔"

"آپ گم سم کیوں ہیں؟" بینی نے آخر یہ کہہ ہی دیا۔

"میں —"

"ہاں —"

"مجھے جینی کے حالات سن کر دکھ ہوا ہے —"

بینی نے اک تیز نگاہ ان پر ڈالی اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ہاں جینی باجی کے حالات سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بہت دکھ سہے انہوں نے — جس دن آئی تھیں پہچانی نہ جاتی تھیں اب تو پھر کچھ اچھی نظر آتی ہیں۔

وہ دونوں جتنی دیر رات کے لمحوں میں ایک دوسرے کے قریب رہے۔ جینی ہی کی باتیں کرتے رہے۔ تابی کو کرید تھی اور بینی نہ چاہتے ہوئے بھی سارے واقعات ان کے گوش گزار کر رہی تھی — وہ تو اس وقت بیتے دنوں کی تلخیاں، جدائی کے سنگین دنوں کی کہانی کہنے سننے کو بے تاب تھی لیکن اس کا موقعہ ہی نہ ملا۔

چند دن انتہائی کش مکش اور اضطراب میں گزرے۔ تابی کو یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی پتھریلی ڈھلانی چٹان پر کھڑے ہیں اور کسی آن کسی لمحے منہ کے بل گرنے والے ہیں — ان سے توازن برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا۔

سوچوں نے ان کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ بینی ان کے قریب آنے کی کوشش کرتی تھی۔ ان کے الجھاؤ سے تنگ آ کر ان سے روٹھ بھی گئی تھی۔

لیکن

وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ انہیں کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

جینی لٹ لٹا کر واپس آ گئی تھی۔

جینی ۔

جو ان کی محبت تھی ۔ پیار تھی ۔ عشق تھی۔

جسے زمانے نے ان کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ وہ اُف تک نہ کر سکے تھے، آواز تک نہ نکال سکے تھے۔

اور

جب چار بیرحم سالوں کی دھول سینے میں چھپے درد کو اچھی طرح ڈھانپ چکی تھی تو ان کی راہ میں بینی آ گئی تھی۔

بینی جسے انہوں نے بھرپور انداز میں چاہا تھا ۔ جو انہیں اپنا آئیڈیل لگی تھی۔ جسے اپنی تلاش کا حاصل مان لیا تھا اور جس کی انگلی میں اپنی محبت کی نشانی پہنانے کے لیے وہ بڑے ارمانوں اور چاؤ سے انگوٹھی خرید کر لائے تھے ۔

لیکن اب ۔؟

ایک طرف جینی تھی ۔۔۔ اور دوسری طرف بینی۔

وہ جینی کا سوچتے تو یوں لگتا بینی کے مجرم ہیں۔

بینی کا خیال کرتے تو سر ندامت سے جھک جاتا۔ جینی کے ساتھ اس سے بڑا ظلم شاید کوئی اور نہ ہوتا۔

کئی دن گزر گئے ۔ ہر کوئی اپنے اپنے کندھوں پر اپنی صلیب اٹھائے پھر رہا تھا۔ جینی تابی کا سامنا کرنے سے گھبراتی تھی۔ ان کے تیوروں سے خوف کھانے لگی تھی۔ بینی دکھ کے دھاروں پر بہہ رہی تھی ۔ تابی گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ تھے ۔ کبھی اتنے قریب محسوس ہوتے کہ خون کی روانی بن کر رگوں میں دوڑتے محسوس ہوتے اور کبھی اتنے دور ۔۔۔

کہ ۔

ان کا ہیولہ ہی نظر آتا ۔

سوچ سوچ کر تابی کا دماغ جیسے پھٹ جانے کو تھا۔ انگوٹھی ان کی جیب میں تھی ۔۔۔ دو ایک بار انہوں نے انگوٹھی نکالی بھی لیکن بینی کی انگلی تک نہ پہنچا سکے۔

اور

اس دن دادی اماں کے کمرے میں تابی بیٹھے تھے ۔ تائی اماں بھی تھیں۔ جینی بھی بیٹھی تھی ۔ جینی نے تابی کو دیکھ کر اٹھ جانا چاہا تھا لیکن دادی اماں بولیں۔

"بیٹھو ۔"

وہ بیٹھ گئی ۔۔۔

چند اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد دادی اماں ستے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "تابی تمہارے باہر جانے سے پہلے میں نے ایک وعدہ تم سے کیا تھا۔"

"تابی نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔ سب کی نظریں دادی اماں پر تھیں۔

"تم بخیریت واپس آگئے ہو — میں وعدہ پورا کرتی ہوں۔ تمہاری تائی اماں اور تمہارے والدین کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بینی تمہاری ہوئی۔"

تابی نے بے چینی سے جینی کی طرف دیکھا۔

جینی کا رنگ بالکل سپید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں سناٹے گونج اٹھے تھے پھر بھی وہ مسکرا رہی تھی۔

"مبارک ہو۔" دادی اماں نے کہا اور بہو کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خوش نظر آ رہی تھی۔

تابی نے سر جھکا لیا۔

"جینی کا غیر لوگوں میں رشتہ کر کے ہم نے کیا سکھ پایا۔" دادی اماں بڑے دکھ سے جینی کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ جینی نے سر جھکا لیا — اور اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی —

دادی اماں اور تائی نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں۔ تابی کے ذہن میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔ سینے میں تلاطم تھا۔ ان کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا۔

ننھی سی نازک سی انگوٹھی انہوں نے ڈبیہ سے نکالی۔ کئی لمحے اسے دیکھتے رہے پھر آہستگی سے بولے۔ "دادی اماں۔ یہ انگوٹھی میں بڑے چاہ سے خرید کر لایا تھا اجازت ہو تو پہنا دوں۔"

دادی اماں اور تائی کھل اٹھیں۔ جینی مٹی کے بت کی طرح کرسی پر

بیٹھی رہی۔

تابی کرسی سے اٹھے۔

"بینی اپنے کمرے میں ہوگی۔" تائی اماں نے کہا۔

"اجازت ہے۔ پہنا دو اسے۔" دادی اماں نے خوش ہو کر کہا۔

تابی انگوٹھی ہاتھ میں لئے چند لمحے کھڑے رہے۔ پھر قدم اٹھایا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔

دروازے کی طرف جانے کی بجائے وہ جینی کی طرف جا رہے تھے۔

"جینی۔" انہوں نے جذبات سے مغلوب آواز میں پکارا۔

جینی، دادی اماں اور تائی یہی سمجھیں کہ وہ انگوٹھی جینی کو دکھا رہے ہیں۔ جینی نے انگوٹھی پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا۔

تو —

تابی نے ایک لمحہ کا توقف کئے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور برق کی سی تیزی سے انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

جینی کے منہ سے خوف زدہ چیخ نکل گئی۔ دادی اماں اور تائی بھی اس ڈرامائی انداز کو نہ سمجھ سکیں۔ حیران سی تابی کو دیکھنے لگیں جو جینی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے بت کی طرح کھڑے تھے۔

لیکن

جن کے چہرے پہ

تلافی سے ہونے والا گہرا سکون تھا۔

بدلہ

شاپنگ سنٹر کے باہر سڑک کے کنارے گاڑیوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ گل شیر خان اپنی نیلی گاڑی کو پارک کرنے کے لیے آہستہ آہستہ قطار کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ کافی دور جا کر کچھ جگہ تھی۔ گل شیر نے گاڑی وہاں پارک کر دی۔

"اتنی دور لے آتے بابا" رجانہ نے برا سا منہ بنایا۔

گل شیر نے گردن موڑ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی اپنی بیٹی کو پیار سے دیکھا اور بولا۔

"وہاں جگہ نہ تھی"

"چلو چند قدم کا فاصلہ ہی تو ہے" رجانہ کی امی بی بی جان جو اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں بولیں۔ اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھا گل شیر خان کا ذاتی ملازم حیدر خاں بولا۔

"بی تھیلا اور ٹوکری ہم اٹھائے گا"

"اوہ نہیں حیدر کاکا" رجانہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلی۔ حیدر خاں بھی گاڑی سے نکل کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

بی بی جان بھی لمبی چوڑی چادر میں اپنا سارا وجود اور چہرہ چھپائے باہر نکل آئی۔

"زیادہ دیر نہ لگا دینا" گل شیر نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ایک دو چیزیں تو نہیں خریدنی تمہیں پتہ ہے رجانہ کی شاپنگ ہے" بی بی جان نے پیار سے بیٹی کو دیکھا۔

پھر بھی کوشش کرنا جلدی آ جاؤ۔ مجھے اور بھی بہت کام ہیں" گل شیر بولا۔

"تو بابا آپ اپنے کام کر لیں۔ ہم شاپنگ کر لیتے ہیں۔ اس طرح سے وقت بھی بچ جائے گا۔ اور آپ بور بھی نہ ہوں گے" رجانہ نے جھک کر کھڑکی میں بابا کو دیکھا۔

"نہیں تم جاؤ ہم یہیں ٹھہریں گے" گل شیر نے کہا۔

"ہاں بیٹا" حیدر خان بولا۔ "ہم ادھر انتظار کریں گے۔ آپ کو پتہ ہے خان اس طرح آپ کو کبھی نہیں چھوڑ کر جاتے"

"پتہ ہے" رجانہ بڑبڑائی۔ بابا تو اب بھی مجھے بچی سمجھتے ہیں۔ اور ساتھ بی بی جان بھی تو ہیں۔ کھا تو نہیں جائے گا مجھے کوئی" گل شیر خان نے یہ بڑبڑاہٹ سنی۔ پتہ تو نہ چلا کہ رجانہ نے کیا کہا ہے لیکن بڑبڑاہٹ

سے ناگواری سمجھ گیا۔ پھر بھی کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

بی بی گل بولی۔ چلو بھی اب!"

"چلیں بی بی"۔

دونوں ہینڈ بیگ اور ڈوریوں سے بنا ہوا تھیلا اٹھا کر شاپنگ سنٹر کی طرف چل دیں۔

حیدر خاں پھر سیٹ پر آ بیٹھا۔

"رجانہ بی بی کو یہ نگہداشت اور نگرانی بہت بُری لگتی ہے خان"۔ حیدر نے مسکرا کر کہا۔

"وہ کیا جانے" گل شیر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کبھی بتایا نہیں انہیں؟"

"نہیں حیدر خاں"

"ہوں"

"کسی وقت تم یہ حماقت نہ کر بیٹھنا"

"توبہ خان توبہ" میں ایسا کر سکتا ہوں؟"

"کبھی کبھی تمہیں رجانہ پر لاڈ آجاتا ہے اور نہ کہنے والی باتیں بھی کہہ جاتے ہو"

"خان اتنی عمر ہو گئی۔ سائے کی طرح آپ کے ساتھ ہوں کوئی راز مشتہر کیا میں نے؟"

"نہیں" گل شیر خان نے حیدر خان کے کندھے پر ہاتھ شاباشی

انداز میں مارا۔

"یہ راز"

"ہاں خان"

"ان دنوں میں بہت پریشان ہوں"

"کیوں خان؟"

"رجانہ کی منگنی کر رہے ہیں ناہم"

"جی خان۔ اگلے ہفتے منگنی ہے اور نادر آفریدی جیسا خوبرو نوجوان آپ کا داماد بننے والا ہے"

"ہاں"

"بہت اچھا لڑکا ہے خان۔ انجینئر ہے اور گاؤں میں زمین بھی بہت ہے۔ بڑے اچھے خاندان کا لڑکا ہے"

"ہاں یہ سب کچھ ہے"

"پھر؟"

"میرا دشمن کہیں اسے نشانہ نہ بنا لے"

گل شیر خان نے جتنی سنجیدگی سے کہا اتنے ہی مسخرے پن سے حیدر خان ہنس پڑا۔ گل شیر خان نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

وہ چند لمحے اپنی ہنسی پر قابو پانے میں صرف کرنے کے بعد بولا۔ خان آپ نے یہ کیسی بات سوچی؟"

"کیوں؟"

"آپ کا دشمن جانے کہاں دفعہ دفعان ہو چکا ہے۔ زندہ ہے یا مر گیا۔ وہ آپ سے تو بدلہ لینے آ نہ سکا۔ آپ کے داماد سے بدلہ لینے کہاں سے آ جائے گا۔"

"اس کے متعلق بیشک کچھ پتہ نہیں لیکن وہ زندہ ہے۔ ہماری طرح وہ بھی آبائی گاؤں چھوڑ کر کسی شہر میں آباد ہو چکا ہے۔"

"بیس اکیس سال ہو گئے کبھی آپ کا آمنا سامنا تو ہوا نہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن کبھی کبھی ـــــ خیر چھوڑو اس قصے کو۔ یہ بتاؤ منگنی کی دعوت کے سلسلے میں تیاری ٹھیک ہو رہی ہے نا؟"

"بالکل خان۔ اتنی شاندار دعوت کا انتظام کیا ہے کہ کھانے والے برسوں یاد کریں گے۔"

"نادر خان کی شایانِ شان منگنی ہونا چاہیے۔"

"ضرور ہو گی خان۔"

دونوں باتیں کر رہے تھے کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس فقیر کھڑکی کے قریب آ کر بولا۔ "اللہ کے نام پر کچھ دے دو صاحب!"

گل شیر نے جیب میں ہاتھ مارا۔ جتنی ریزگاری ہاتھ آئی فقیر کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

وہ دعا دیتا ہوا پیچھے ہٹا۔

اور

عین اسی وقت اک ہلکے براؤن رنگ کی گاڑی کے بریک چرچرائے۔

شاید اس فقیر کو زد میں آنے سے بچانے کے لیے بریک لگائے گئے تھے۔

گل شیر نے اس چرچراہٹ پر کھڑکی میں سے برابر آ کر کھڑی ہونے والی گاڑی کو دیکھا۔ اس کے تعاقب میں حیدر خان کی نظریں بھی اٹھیں۔

اور

دونوں کو جیسے سکتہ سا ہو گیا، کھلی آنکھوں سے دونوں گاڑی میں سٹیرنگ سنبھالے۔

"خان۔" حیدر خان کے لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔

"میرا فضل۔" گل شیر خان کے پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے ہلکی سی سرگوشی ابھری۔ دونوں نے سیٹ پر رکھے ہوئے ہاتھ سختی سے پکڑ لیے۔

"یقیناً میرا فضل ہے۔" حیدر خان نے جنبش کئے بغیر ہولے سے کہا۔

"ہاں وہی ہے۔" گل شیر خان نے لب ہلاتے۔ اور اس کا ہاتھ گلے میں پڑے گولیوں کے پٹے پر سے ہوتا ہوا پستول پر آ گیا۔

"نہیں خان۔" حیدر خان نے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ "ہماری بیبیاں مارکیٹ میں جا چکی ہیں۔"

گل شیر خان کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔

"میرا فضل۔" وہ صرف یہی بڑبڑایا۔ پھر اس نے گاڑی سٹارٹ کرنے کو چابی گھمائی۔

"کہاں خان۔" حیدر خان نے ہولے سے کہا۔

"یہاں سے گاڑی نکال لے جائیں۔"

"رجانہ بی بی اور بیگم صاحبہ؟"

"اوہ۔" وہ بُری طرح سٹپٹا گیا۔

حیدر خان نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "خان ہمت رکھو پرواہ نہ کرو۔ یوں ظاہر کرو جیسے اسے پہچانا ہی نہیں۔"

"اور اگر اس نے کوئی گڑبڑ کر دی تو؟"

"اتنے پُررونق بازار اور ہجوم میں نہیں کرے گا۔"

"اسے ہمارا پتہ تو چل گیا ہے۔"

"یہ دیکھیں گے خان۔ ابھی آپ آرام سے لاپرواہ بن کر بیٹھیں۔"

"رجانہ اور گل؟"

"میری نظر ادھر ہی ہے آپ فکر نہ کریں۔"

گل شیر خان کی حالت دگرگوں تھی۔ لیکن اس وقت وہ کچھ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

میر افضل نے پہلی نظر ہی میں گل شیر خان کو پہچان لیا۔ ایک لمحہ کو تو وہ بھی پتھرا سا گیا۔ اس کے تینوں ساتھیوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ اور پھر اس کے برابر بیٹھے جمعہ خان کی نظر بھی گل شیر پر پڑ گئی۔

"گل شیر۔" وہ بے آواز چیخا۔

"ہاں۔" میر افضل نے جواب دیا۔

"موذی اب کہاں جائے گا۔ برسوں سے ہمیں اس کی تلاش تھی۔"

"ہاں"

"اسی شہر میں رہتا ہوگا۔"

"یہ تو پتہ کرنا پڑے گا۔"

"موٹر کا نمبر نوٹ کر لیں۔"

"ہاں"

جمعہ خان نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے نوجوانوں سے بغیر گردن موڑے آہستگی سے کہا۔

"اس گاڑی کا نمبر نوٹ کر لو۔"

"اچھا خان۔"

نوجوان دروازہ کھول کر گاڑی سے یوں نکلا جیسے کسی اپنے کام کے لیے جا رہا ہو۔ گل شیر پر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے کے لیے اترا ہے وہ گھوم کر اپنی گاڑی کے پیچھے آیا۔ جھک کر اس کے پہیے دیکھے یوں جیسے پہیوں کی ہوا چیک کر رہا ہو۔

"ہوا ٹھیک ہے۔" اس نے جھکے جھکے جمعہ خان سے کہا اور اسی دوران اس نے گل شیر کی گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا۔ وہ پھر گاڑی میں آ بیٹھا۔

"گاڑی پشاور ہی کی ہے۔" وہ بولا۔

"تو اس کا مطلب ہے گل شیر پشاور ہی میں رہتا ہے۔" جمعہ خان بولا۔

"ظاہر ہے۔" اس نے کہا۔

میر افضل چپ تھا۔ اس کے ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ اس کا خون جوش میں آ رہا تھا۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور آنکھوں سے انگارے ٹوٹنے لگے تھے۔

بیس بائیس برس پہلے کے واقعات اس کے ذہن میں لہرانے لگے تھے اس کی گرفت اسٹیرنگ پر مضبوط ہو رہی تھی۔ وہ دانت بھینچ کر اپنے اندر اٹھنے والے طوفانوں کو دبا رہا تھا۔

گل شیر اس کا دشمن تھا۔

اور

برسوں سے اسے اس کی تلاش تھی۔ وہ زرساگا کے خون کا بدلہ لینے کا عہد کر چکا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

گل شیر خاں اور میر افضل خاں لنڈی کوتل کے نواحی گاؤں کے باسی تھے صدیوں سے ان کے خاندان اس گاؤں میں رہتے چلے آ رہے تھے۔ اور صدیوں ہی سے ایک دوسرے کی دشمنی کا زہر سینوں میں سموتے ہوتے تھے۔

دشمنی کا سلسلہ ان کے دادا کے بھی دادا کے وقت سے چلا تھا۔ جب اس گاؤں کی آبادی بہت تھوڑے نفوس پر مشتمل تھی۔ دونوں خاندان ساتھ ساتھ آباد تھے زمینیں تھیں جن پر گزر اوقات ہوتی تھی۔ ویسے ان دنوں زیادہ وقت ان لوگوں کا جنگ و جدل ہی میں گزرتا تھا۔ کبھی

سرحدی افغانوں سے جھڑپیں ہوتیں، کبھی ہندوستان کے نئے حکمران انگریزوں سے ٹکر لینا پڑتی۔ دونوں خاندان سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ اور اپنی آزادی کے لیے جد و جہد کرتے رہتے تھے۔

دونوں خاندانوں کے سربراہوں میں ایسی دوستی تھی کہ ایک دوسرے کے لیے سر کٹانے کو تیار رہتے تھے۔

لیکن دونوں دوستوں کی دوستی دشمنی میں بدل گئی۔ اس دشمنی کی بنیاد دونوں کے نوجوان بیٹوں کی محبت تھی۔

شادگل گاؤں کی حسین و جمیل کشمالا کی زلف گرہ کا اسیر ہو گیا۔ کشمالا ایک تیسرے سربرآوردہ خاندان کی لڑکی تھی۔ شادگل جب بھی کھیتوں پر جاتا۔ کشمالا اپنے چھینٹ کے گھیر دار فراک نما کرتے، تنگ موری کی بھاری شلوار اور کالی اور لال چھینٹ کی بڑی سی چادر سر کے پیچھے ڈالے اپنی بکریوں کے پیچھے بھاگتی ملتی۔

گہری گہری نیلی آنکھوں، سنہری بالوں اور سرخ و سفید رنگت والی کشمالا شادگل کی زندگی میں کب آئی یہ تو اسے یاد نہ تھا۔ وہ بچپن ہی سے اسے دیکھتا چلا آیا تھا۔ اور پسند کے جذبات ہمیشہ سینے میں مچلتے تھے۔ لیکن جوانی میں تو وہ سراپا قیامت بن گئی تھی۔ شادگل اس قیامت کو سینے میں چھپا لینے کی شدت سے خواہش محسوس کرنے لگا

لیکن

کشمالا کے خاندان سے اس کے خاندان کے کچھ اچھے تعلقات نہ تھے

اس لیے وہ اپنی خواہش کا برملا اظہار نہ کر سکتا تھا۔

محبت اثر رکھتی ہے، کشمالا بھی اس خوبرو جوان سے متاثر تھی۔ ایک غیر محسوس سی کشش اسے شادگل کے قریب لا رہی تھی۔

اور

ایک دن جب وہ اپنی بکری کو پکڑنے بھاگتی ہوئی شادگل کے کھیتوں میں آ گئی تو شادگل نے تیزی سے بڑھ کر کشمالا کو روکا۔

"کیوں"۔ کشمالا چند لمحے کے لیے رکی اور تیکھی ادا سے اسے دیکھا۔

شادگل مسکرایا اور آگے بڑھ کر کشمالا کے خوبصورت بالوں کی لٹ کاٹ لی۔

"شادگل!" کشمالا ایک لمحہ کو ٹھٹھکی۔

"میں بہت دنوں سے اس انتظار میں تھا کشمالا۔ تم میری ہو۔" شادگل نے لٹ کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

کشمالا نے پیار بھری نظروں سے شادگل کو دیکھا۔ پھر سنجیدگی سے بولی "تم نے بڑی جرأت کی ہے شادگل۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"یہ جرأت خون میں بھی نہا سکتی ہے۔"

"پرواہ نہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں!"

کشمالا نے عقیدت سے اسے دیکھا وہ بڑی خوبصورتی سے مسکرایا اور بولا "تمہیں حاصل کروں گا۔ یہ میری زندگی کا مقصد ہے۔ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا کشمالا۔" محبت کا اقرار ہوا۔

اور

ساتھ کٹنے کی بات گاؤں میں پھیل گئی۔ ناصر خاں بھی کشمالا کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ پتھروں کے دیس کی یہ حسین لڑکی اس کے من میں بھی چھپی تھی۔

اس نے شادگل کے لٹ کاٹنے کا سنا تو آتش زیر پا ہو گیا۔ شعلے کی طرح بھڑکتا شادگل کے پاس پہنچا۔

"کشمالا میری ہے۔" اس نے بے دھڑک کہا۔ بہتر ہے تم میری راہ سے ہٹ جاؤ۔"

شادگل نے بڑے سکون اور اطمینان سے ناصر خان کو دیکھا۔ جیب سے بالوں کی لٹ نکالی۔ ناصر خان کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ پھر ہونٹوں سے لگا لی۔

ان دنوں اس گاؤں میں یہ رواج تھا۔ جو نوجوان جس لڑکی کی لٹ کاٹ لیتا وہ اسی سے شادی کرتا۔ اس سلسلے میں بڑی جرأت، بہادری اور جوانمردی کی ضرورت ہوتی تھی۔ کیوں کہ عام طور پر لٹ کاٹنے کی ضرورت وہیں ہوتی جہاں اور کسی طرح سے رشتہ کرنا ممکن نہ ہوتا اور جب کوئی نوجوان لٹ کاٹ لیتا وہ اپنے حق پہ چٹان کی طرح جم جاتا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے

اس کے حق سے دستبردار نہ کر سکتی تھی۔

ناصر خان پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے گھور کر شاد گل کو دیکھا۔

اور

یوں دشمنی کا پہلا بیج دونوں خاندانوں کے درمیان بو دیا گیا۔

اگلے ہی ماہ شاد گل اور کشمالے کی دستور کے مطابق شادی ہو گئی۔

لیکن

کینہ پرور ناصر خان اپنی توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے شاد گل کو قتل کر دیا۔ مہینہ بھر کی سہاگن کشمالا بیوہ ہو گئی۔

لیکن

شاد گل کی نشانی اس کی کوکھ میں تھی۔

دشمنیوں کا سلسلہ چل نکلا۔ کشمالا نے شاد گل کے بیٹے کو جنم دیا اور پھر اس کی پرورش اس طرح کی کہ بڑا ہو کر باپ کا بدلہ لینے کے لیے اسے تیار کیا۔ شاد گل کے بیٹے نے صرف سترہ سال کی عمر میں اپنے باپ کے قاتل ناصر خان کو مار ڈالا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی ایک خاندان کا آدمی مارا جاتا۔ کبھی دوسرے کا۔ صدیوں پہلے کی دشمنی مرنے قتل پر تازہ ہو جاتی۔ دس پندرہ برس میں ضرور ایک نہ ایک قتل ہو جاتا۔

اس سلسلے کا آخری قتل بیس اکیس برس پہلے ہوا تھا۔ پرانے غصے میں کچھ نئی دشمنی بھی شامل ہو گئی تھی۔

گل شیر خان اور میرا فضل ان دنوں جوان تھے۔ دونوں دشمن گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بول چال نہ تھی۔ پھر بھی ایک دوسرے کی شخصیت سے مرعوب تھے۔ اشاروں کنایوں سے اپنے اپنے وجودوں کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ گو آباؤ اجداد کی طرح ان کے سینوں میں کینہ نہ تھا اور آئے دن کے قتل سے دونوں ہی بیزار تھے ایک دوسرے کو معاف کر دینا چاہتے تھے لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر انسان چاہنے کے باوجود عمل نہیں کر سکتا۔

شاید رفتہ رفتہ ان دونوں کی سوچ حاوی ہو جاتی اور خاندانی دشمنیاں خاتمے کے قریب آ جاتیں کہ انہی دنوں اس دشمنی کے سینے میں تازہ زخم لگا۔

زرساگا میرا فضل کی خالہ زاد تھی۔ حسین و جمیل زرساگا میرا فضل کے دل کی دھڑکن تھی۔

دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے چلے آئے تھے۔ اس چاہت کو دیکھتے ہوئے میرا فضل کی ماں نے زرساگا کی امی سے کہا تھا "زرساگا میرے گھر کی روشنی بنے گی۔ میں ابھی سے کہہ رہی ہوں۔"

اور بہن نے بہن کا مان رکھنے کے لیے کہہ دیا تھا "مجھے میرا فضل سے زیادہ اور کون عزیز ہو گا بہن۔"

آپس کی بات تھی۔ منگنی کا باقاعدہ اعلان تو نہ ہوا لیکن سب رشتہ داروں اور عزیزوں میں یہ بات مشہور ہو گئی۔

زرساگا اور میرا فضل دونوں اس بات سے مسرور تھے۔ اور آنکھوں میں حسین خواب سجائے ان کی تعبیر کے لیے جدوجہد کرتے شاہراہِ زندگی پر گامزن تھے۔

لیکن تاریخ شاید اپنا آپ دہرا کر ہی تسکین محسوس کرتی ہے۔ زرساگا کے حسن کا جادو گل شیر پر بھی چل گیا۔ ان دنوں گل شیر تعلیمی مدارج طے کر رہا تھا۔ اور اس غرض سے پشاور ہی میں رہتا تھا۔ چھٹیوں میں گاؤں جایا کرتا تھا۔ خاندانی دشمنی کے پیشِ نظر اس کے والدین چاہتے تھے کہ گل شیر مستقلاً پشاور ہی میں سکونت اختیار کرے۔

وہ شاید بہار کی چھٹیاں تھیں گل شیر گاؤں آیا ہوا تھا۔ معتبر خاندان کا فرد تھا۔ تعلیم نے اور بھی معتبر بنا دیا تھا۔ جب وہ شہر سے آتا تو اس کے حجرے میں گاؤں کے غیر تعلیمیافتہ نوجوان جمع ہو جایا کرتے تھے۔ وہ بڑے ذوق و شوق سے اس کی باتیں سنتے اور گاؤں کی ساری باتیں اسے بتایا کرتے تھے۔

زرساگا کے ساحرانہ حسن کے متعلق بھی اس نے انہی نوجوانوں سے سنا تو سینے میں وید کی آتش بھڑک اٹھی۔

"وہ رنگ و نور میں ڈھلی ہے خان!"

"وہ بولتی ہے تو جیسے چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں۔"

"وہ چلتی ہے تو مست ہوائیں دم سادھ لیتی ہیں۔"

"اس کی حسین آنکھوں میں نیلے سمندروں کی گہرائی ہے۔"

"اس کے تن میں پہاڑوں کی اٹھان ہے۔"

نوجوان زرساگا کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے۔

گل شیر نے لوگوں کی زبانی یہ بھی سنا تھا کہ زرساگا صدیوں پہلے پیدا ہونے والی کشمالا کا دوسرا روپ ہے۔ ایسا حسن صدیوں میں جنم لیتا ہے۔ اس گاؤں کی آنکھ نے کشمالا کا روپ دیکھا تھا۔ اور اب زرساگا کا دیکھ رہی ہے۔

گل شیر کی آتشِ شوق بھڑک اٹھی تھی اور وہ اپنی تعلیم کو بھول کر اس گاؤں کے سبزہ زاروں میں دیوانہ وار پھرنے لگا تھا۔ جن میں زرساگا کے نظر آنے کی توقع ہوتی تھی۔

اور

اس دن شام ڈھل رہی تھی۔ ہر طرف سرمئی شام کے آنچل لہرا رہے تھے۔ اک ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گل شیر ساتھ والے گاؤں سے واپس آ رہا تھا کہ اچانک اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ اسے یوں لگا کہ سرمئی شام نے آنچل سمیٹ لیے ہیں اور چاروں اور ٹھنڈا ٹھنڈا نورانی اُجالا پھیل گیا ہے۔ پگڈنڈی پر اس نے اک آفتاب ابھرتے دیکھا۔

زرساگا خراماں خراماں چلی آ رہی تھی، گل شیر کو پگڈنڈی پر کھڑے دیکھا تو سمجھی کہ کسی آوارہ نوجوان نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بے دھڑک آگے بڑھی۔ رک جانا یا ڈر کر سہم کر لوٹ جانا حسنِ جہاں سوز نے سیکھا ہی کب تھا۔ غرورِ حسن متقاضی تھا کہ وہ راستے میں آنے والے کو

پاتے استحقار سے ٹھکراتی آگے بڑھ جاتے۔

وہ بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ گل شیر کے بالکل سامنے آگئی۔

"کون ہو تم؟" اس نے بڑی تمکنت سے کہا۔

"تم کون ہو؟" وہ جیسے عالمِ خواب میں بڑبڑایا۔

"راستے سے ہٹو۔ میں نے ادھر جانا ہے۔"

"چند لمحے رک جاؤ۔"

"کیوں؟"

"بلاشبہ تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو۔"

زرساگا کی پیشانی پر شکنیں اُبھریں۔ اجنبی نوجوان کا اندازِ گفتگو اور محویت سے کھٹکی چونکی۔ غور سے اسے دیکھا۔

گل شیر آہستگی سے بولا۔ "یقیناً تم زرساگا ہو۔"

"کیا تم مجھے جانتے ہو؟" زرساگا بڑے وقار سے بولی۔

"ہاں!"

"میں تمہیں نہیں جانتی!"

"چاند ایک ہوتا ہے بیشمار۔ اب چاند کو موردِ الزام تو نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ وہ ہر ستارے سے باخبر کیوں نہیں۔"

گل شیر نے مسکرا کر کہا تو زرساگا کے خوبصورت ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں وہ ایک تند سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے اپنا راستہ دائیں ہاتھ بناتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

گل شیر اسے وہیں کھڑا تکتا رہ گیا۔

وہ زرساگا کو دیکھے بغیر ہی اس پر مرمٹا تھا۔ اب جو اسے دیکھ لیا تو زندگی اجیرن ہو گئی۔ دوبارہ دیکھنے کی تمنا کو رد نہ کر سکا۔ ان راہوں پر بکھر بکھر گیا جن پر زرساگا کے آنے جانے کی توقع ہوتی تھی۔

اس نے زرساگا کو کئی بار دیکھا۔ قریب سے بھی اور دور سے بھی۔ باتیں کرنے کا موقع پھر نہ ملا۔ کہ زرساگا نے اسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا۔

لیکن

اس کے سینے میں آتشِ عشق بھڑک اٹھی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ زرساگا اور میرا فضل کی بات طے ہے اس نے زرساگا کو حاصل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ میرا فضل سے تو صدیوں پرانی دشمنی تھی ہی اس دشمنی میں نیا رنگ بھی شامل ہو جاتے تو کیا فرق پڑے گا۔

لٹ کاٹنے کی رسم اب اس گاؤں سے مٹ چکی تھی۔ لوگ اب کہانی کے طور پر اس رسم کا ذکر کیا کرتے تھے لیکن گل شیر نے چونکہ میرا فضل کو چیلنج کرنا تھا۔ اس لیے اس کے ذہن میں لٹ کاٹنے کی ترکیب آئی۔

وہ ہر وقت موقعے کی تاک میں رہنے لگا اور ایک سہ پہر جب زرساگا اپنی بکریوں کو چراگاہ سے لے کر واپس آ رہی تھی گل شیر نے اس سنہری سہ پہر میں زرساگا کو روکا۔

"بات سنو زرساگا۔"

"کیا ہے؟" وہ رعونت سے بولی۔

"میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں زرساگا تمہاری محبت میں پاگل ہو رہا ہوں۔"

"تم۔"

زرساگا نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا، بڑی تلخ نظروں سے اسے دیکھا اور بولی:

"میرا فضل کو جانتے ہو؟"

"صدیوں سے جانتا ہوں۔"

"اچھا؟"

"وہ میرا خاندانی دشمن ہے۔"

"تو پھر سن لو۔ میں اس کی ہوں۔"

وہ راستے میں پڑے چھوٹے سے پتھر کو ٹھوکر سے ہٹاتی آگے بڑھی۔

گل شیر نے جلدی سے اس کے سنہری بالوں کی لٹ کاٹ لی۔

"گل شیرا" زخمی شیرنی کی طرح زرساگا دھاڑی۔

"تم میری ہو زرساگا۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" گل شیر نے لٹ اونچی کی اور پھر اسے چوم لیا۔

زرساگا سرتاپا شعلہ نظر آتی۔ اس کے پاس اس وقت پستول ہوتا تو گل شیر کے سینے میں وہ گولی داغ دیتی۔

وہ سخت برہمی کے لہجے میں بولی: "اس جرأت کی سزا مت بھولنا۔" وہ قدموں کی ٹھوکروں سے ممتاز جگاتی آگے بڑھ گئی۔

گل شیر نے دوبارہ لٹ کو چوما اور بالوں کی لٹ جیب میں رکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ گیا۔

زرساگا نے ساری بات میرا فضل کو بتا دی۔ میرا فضل غصے سے تلملانے لگا۔ اس نے صدیوں پرانی دشمنیوں کو کئی بار ختم کر دینے کا سوچا تھا لیکن اب۔ اب اسے یوں لگا جیسے سارے قتل اس سے بدلہ لینے کی استدعا کر رہے ہیں۔

"وہ گل شیر کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔" اس نے فیصلہ کر لیا۔ زرساگا نے اسے اس بات سے روکا نہیں وہ تو خود گل شیر کے پرخچے اڑا دینا چاہتی تھی۔

گل شیر پشاور چلا گیا تھا اس لیے اسے مار ڈالنے کا موقع میرا فضل کو چند دن نہ مل سکا۔ لیکن انتقام کی آگ تو کبھی نہیں بجھتی۔ یہ آگ گل شیر کے خون ہی سے بجھ سکتی تھی۔ صرف موقع کی تلاش تھی۔

گل شیر زرساگا کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ چند دنوں بعد وہ گاؤں واپس آ گیا اسے علم تھا کہ میرا فضل غصے سے پاگل ہو رہا ہوگا۔ اس لیے وہ اب کسی وقت بھی تنہا نہیں رہتا تھا۔ گاؤں کے جیالے نوجوان طمنچے لیے ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

اس نے باقاعدہ رشتہ زرساگا کے گھر بھیجا جسے بے عزتی کے ساتھ واپس کر دیا گیا۔ اسی دن زرساگا گل شیر سے ملی اسے ذلیل کیا، اس پر تھوکا اور اسے راستے سے ہٹ جانے کے لیے کہا۔

"میں میرا فضل کی ہوں اور اس سے تم مجھے چھین نہیں سکتے۔

"تم میری ہو۔" ساری ذلت پیتے ہوئے گل شیر نے کہا۔ "اور یہ بھی سُن لو کہ تم مجھے نہ ملیں تو میرا فضل کو بھی نہ ملو گی۔"

"تم سمجھتے ہو گے اس دھمکی سے میں ڈر جاؤں گی۔"

"یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔"

اور

واقعی

یہ دھمکی نہ تھی۔ حقیقت تھی۔ جب گل شیر زرساگا سے مایوس ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ زرساگا اس سے نفرت کرتی ہے تو ایک رات جب میرا فضل اور زرساگا کھیتوں کے کنارے ٹیلوں کے پاس چاندنی رات کی مسحور کن فضا میں کھوتے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی۔

اور

زرساگا کے سینے کے پار ہو گئی۔

"زرساگا" میرا فضل کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی۔ اس آواز میں درد سے آتا ایک خبیث سا قہقہہ شامل ہو گیا۔

زرساگا کی اس ناگہانی موت پر میرا فضل حواس ہی کھو بیٹھا۔ کئی دن وہ پاگلوں کی طرح گریباں چاک رہا۔

اور

یہی موقع گل شیر کو گاؤں سے فرار ہونے کا مل گیا۔ وہ گاؤں سے ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔

⁂ ⁂ ⁂

رجانہ اور گل بی بی ڈھیر ساری شاپنگ کر کے ٹوکری اور تھیلا اٹھائے ہنستی مسکراتی واپس آئیں۔

حیدر خان نے جلدی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور ان سے ٹوکری اور تھیلا لے کر اندر رکھ دیا۔

"بابا۔" رجانہ نے مسکراتے ہوئے جھک کر کھڑکی میں سے دیکھا۔

"کیا ہے؟" گل شیر کی آواز بے حد تلخ اور گھبرائی ہوئی تھی۔

"ایک چیز رہ گئی ہے بابا لے آؤں؟" رجانہ نے بغیر نوٹس لیے کہا۔

"نہیں۔ بیٹھو گاڑی میں۔" گل شیر نے اسی لہجے میں کہا۔

رجانہ نے منہ بنایا۔

"کل لے جائیں گے۔" بی بی گل نے جلدی سے بیٹھتے ہوئے رجانہ سے کہا۔

وہ ضدی سی لڑکی تھی۔ منہ پھلائے کھڑی رہی۔ برابر کی گاڑی میں بیٹھے میرا فضل اور اس کے ساتھی بظاہر لاپرواہی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ لیکن وہ ان کی طرف پوری پوری طرح متوجہ تھے۔

"بیٹھو حیدر خان۔" گل شیر نے کہا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ وہ خاصا الجھا ہوا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

رجانہ بھی دھپ سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے منہ پھلا رکھا تھا۔ گل شیر

وہاں سے گاڑی نکال لایا۔

"یہ ہمارا پیچھا کریں گے۔" اس نے ہولے سے حیدر خاں سے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" حیدر بولا۔

بی بی گل اور رجانہ آپس ہی میں باتیں کر رہی تھیں انہوں نے حیدر خان اور گل شیر کی باتوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

گل شیر گاڑی چلاتے ہوئے مڑ مڑ کر بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا اس کے پیچھے میرا فضل آئے گا۔ ضرور تعاقب کرے گا۔ لیکن لمبی سڑک پر کافی دور جانے پر بھی اسے براؤن گاڑی نظر نہ آئی تو وہ اپنے گھر کے راستے پر چل پڑا۔

وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ چند دنوں بعد اس کی بیٹی کی منگنی تھی اور اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ میرا فضل اس کو کھوج نکالے گا۔ وہ ڈرپوک تو نہیں تھا۔ نہ ہی قتل و قتال سے خائف تھا اسے صرف اس فنکشن کا خیال آ رہا تھا جو وہ چاہتا تھا کہ بخیر و خوبی انجام پا جائے۔ اس سے پہلے وہ کوئی گڑبڑ نہیں چاہتا تھا۔

رات بیرونی ڈرائنگ روم میں وہ مضطرب و پریشان پھر رہا تھا۔ جو قالین پر بیٹھا تھا۔ گل شیر کے راز کا صرف وہی امین تھا۔

"خان۔" اس نے مالک کا اضطراب دیکھ کر کہا۔

"ہوں۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ میرا فضل خاموش رہے گا۔ تم نے اس کی آنکھوں میں انتقام کی چنگاری نہیں دیکھی۔"

"چنگاری نہیں شعلہ دیکھا ہے خان۔"

"پھر؟"

"پھر فکر کی کیا بات ہے۔ ہم چوکس ہیں۔ پھر ضروری نہیں کہ ہم ہی اس کی طرف سے وار کا انتظار کریں۔"

بات گل شیر کے دل لگی۔ اس کے قریب آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا "تمہارا مطلب ہے۔ مطلب ــــ"

"جی خان جی۔ ہم نے چوڑیاں تو نہیں پہن رکھیں۔ اس کے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہم بھی اسے ختم کر سکتے ہیں۔"

"بہت ہوشیار اور چوکس رہنے کی ضرورت ہوگی۔"

"بالکل۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا پتہ یوں نکال لوں گا۔" اس نے چٹکی بجائی۔ پھر اسے اپنی راہ سے ہٹانا مشکل نہ ہوگا۔"

گل شیر چند لمحے سوچوں میں کھویا رہا پھر آہستگی سے بولا۔ "یہ اتنا آسان نہیں حیدر خان۔ اب تم لنڈی کوتل کے گاؤں میں نہیں ہو۔ پشاور میں ہو اور یہاں حکومت کا قانون چلتا ہے۔"

"اوہ ــ آپ بے فکر رہیں صاحب!"

گل شیر چند لمحے سوچوں میں کھویا رہا۔ پھر بولا۔ "مجھے اپنی جان کی فکر نہیں حیدر خان۔ اب نادر خان بھی خاندان میں شامل ہے۔ کہیں وہ نادر خان کو

کوئی نقصان نہ پہنچائے۔"

حیدر خان بھی سوچ میں پڑ گیا۔

"ہم نادر خان کو براہِ راست کہہ بھی نہیں سکتے۔ اسے بھنک پڑ گئی تو فکر ہے وہ اس رشتے سے ہی انکار کر دے۔"

"نہیں خان۔"

"یہ حقیقت ہے حیدر — کون بیٹھے بٹھائے دشمنوں میں گھرنا پسند کرے گا"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"مجھے یہی تو فکر ہے۔ مجھے اس بات کی خبر ہوتی تو میں منگنی کے بجائے رجانہ کی شادی ہی کر دیتا۔"

"یہ باتیں چھوڑیں خان۔ دیکھنا یہ ہے کہ میرا فضل سے ہم نے کیسے نپٹنا ہے۔"

"تم ہی سوچو۔ میرا تو دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔"

٭ ٭ ٭

"نادر!"

"ہوں؟"

"پتہ ہے بابا نے بی بی گل سے کیا کہا ہے؟"

"کیا؟"

"نہیں۔ میں نہیں بتاتی مجھے شرم آتی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے رجانہ؟"

"بس ہے۔"

"بتاؤ نا۔"

رجانہ کے گالوں پر شفق لہرا رہی تھی۔ آنکھوں میں ستاروں کی جوت تھی نادر آفریدی کے قریب بیٹھی وہ شرمائے جا رہی تھی۔

نادر اور رجانہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ دو سال پہلے ان کی ملاقات یونیورسٹی کی بس میں ہوئی تھی۔ کیوپڈ نے تاک کر تیر مارا تھا۔ دونوں پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئے تھے۔ ان دنوں نادر انجینئرنگ کے تیسرے سال میں تھا۔ اور رجانہ ہوم اکنامکس کالج میں سیکنڈ ائیر کی طالبہ تھی۔

پہلی ملاقات آخری ثابت نہ ہوئی تھی۔ پیار کے رشتے ٹوٹنے والے نہیں تھے۔ نادر رجانہ کے قریب آنے کے لیے کوشاں رہا۔ رجانہ بھی نادر کو منتہائے مقصود سمجھتی رہی۔

قربتوں کو ابدی رنگ دینے کے لیے ضروری تھا کہ نادر اور رجانہ کے والدین بھی ایک دوسرے سے متعارف ہوں۔ پہل نادر نے کی اس نے امی اور بہنوں کو رجانہ کے ہاں بھیجا۔

پھر بی بی گل ان کے ہاں گئیں۔ نادر کے آغا جی اور گل شیر میں بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں گھرانے جتنے قریب آتے گئے نادر اور رجانہ کی خوشیاں اتنی ہی مضبوط اور مستحکم ہوتی گئیں۔

بالآخر نادر کے والدین نے رجانہ کا رشتہ مانگا۔ گل شیر اور بی بی جان کو اس رشتے کی بڑی لگن تھی۔ وہ خود قبائلی پٹھان تھے۔ اپنے جوڑ کا رشتہ ہی رجانہ

کے لیے درکار تھا۔ آفریدی خاندان سے رشتہ داری بنانا ان کے لیے باعث عزت و فخر تھا۔

منگنی کی رسم دھوم دھام سے طے ہو رہی تھی۔ گو دونوں خاندانوں کے ہاں اس قسم کی رسومات نہ تھیں۔ لیکن پشاور میں ایک عرصہ سے رہ رہے تھے۔ یہاں کی تہذیب اور رسم و رواج اپنا لیے تھے۔

اعتراض تو کسی کو بھی نہ تھا لیکن اب جو پریشانی گل شیر کے سر آن پڑی تھی۔ وہ اس سے خائف تھا۔ وہ اپنی دشمن داری کا کسی کو بتا بھی نہ سکتا تھا۔ اور نادر کی زندگی کے متعلق بھی اسے تشویش تھی۔ اپنے دونوں بیٹوں کو تو اس نے بغرض تعلیم پہلے ہی یو۔کے بھیج دیا ہوا تھا۔ دراصل یہ بھی میرا فضل کے بھوت سے فرار کی ایک کوشش تھی۔ وہ بیس بائیس سالوں سے جو اس کے اعصاب پر مسلط تھا۔

اس نے بی بی گل کو کچھ بتائے بغیر اس دن کہا۔ "منگنی سے بہتر تھا ہم رجانہ کی شادی کر دیتے۔"

"کیوں؟"

"سر سے فرض ادا ہو جاتا۔"

"ہو ہی جائے گا۔ نادر کی ماں اور باپ حج پر جا رہے ہیں۔ واپس آ کر یہی کام کریں گے۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن!"

"کیا بات ہے پریشان ہو کچھ گل۔"

"نہیں تو۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ رجانہ کی شادی ہو جاتی تو اچھا تھا۔"

بی بی گل نے ہنستے ہوئے رجانہ سے یہی بات کہی تھی۔

اور

اب رجانہ نادر خان کو بتانا چاہ رہی تھی۔ وہ بابا کی ذہنی کیفیت سے بالکل بے خبر تھی۔ ان دنوں وہ خود بھی کونسا ہوش و حواس میں رہتی تھی۔ ہر وقت نادر کے تصور ہی میں کھوئی رہتی۔ آنے والے حسین دنوں کے رنگین تانے بانے میں الجھی رہتی۔ نادر کو قریب پا کر تو وہ بہکنے لگتی تھی۔ مسحور ہو جاتی تھی۔

نادر پوچھ کر ہی رہا۔

رجانہ نے شرماتے مسکراتے بتا دیا۔

"کتنی اچھی بات کہی ہے تمہارے بابا نے۔" نادر سحر زدہ سا رجانہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہٹو جی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"

"میرا بس چلے تو تمہیں ابھی لے جاؤں اپنے گھر۔"

"اوہو۔ تم تو بابا سے بھی تیز ہو۔"

"اور کیا؟"

"ایسا مت سوچو۔"

"کیوں؟"

"ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔"

"بڑی بی ٹھیک کہہ رہی ہو۔" نادر نے اپنا بازو اس کی کمر میں ڈالتے ہوئے

شوخی سے کہا: "مجبوری ہے کہ میری امی اور بابا حج کے لیے جا رہے ہیں۔ ورنہ میں تمہارے بابا کی خواہش ضرور پوری کر دیتا۔"

رجانہ شرما گئی۔

نادر شرمانے کی ادا پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

٭ ٭ ٭

جس دن سے میرا فضل نے گل شیر کو دیکھا تھا۔ وہ مضطرب اور بے چین تھا۔ زرساگا کا چہرہ اس کی آنکھوں میں بسا رہتا تھا۔ اس کے سینے سے خون کا ابلتا فوارہ نظر آتا تھا۔ اس کا ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانا اذیت دہ تو تھا لیکن اب گل شیر کو دیکھ کر اس اذیت میں کربناک اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ گل شیر کی تلاش میں ملک ملک گھوما تھا۔ اسے قتل کیے بغیر چین نہ پا سکتا تھا۔

لیکن

گل شیر اس معاملے میں شاید خوش قسمت تھا۔ پشاور ہی میں رہ رہا تھا۔ لیکن میرا فضل کے ہتھے نہ چڑھا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا فضل نے اس کے روپوش ہونے سے یہی سوچ لیا تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ بہر حال اتنی مدت کے بعد وہ اسے نظر آ گیا تھا۔ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر۔

اور

انتقام کی آگ جو اتنے برسوں میں وقت کی راکھ میں دب کر ٹھنڈی

گئی تھی۔ اچانک بھڑک اٹھی۔ یوں جیسے آندھی کے جھونکے نے راکھ اڑا دی ہو اور چنگاریاں سلگ کر پھر سے شعلوں میں بدل گئی ہوں۔

"میں نے آخر گل شیر کو پا لیا ہے۔" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"ہاں خان۔" جمعہ خان بولا۔

"اس کا پتہ نکالو۔"

چند دن کی مہلت دیں۔ سب کچھ پتہ چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس کے ساتھیوں نے چند دن ہی میں گل شیر کا کھوج نکالا۔ اس کی کوٹھی جہاں واقع تھی اس کے خاندان کے لوگ۔ اس کا فون نمبر۔ حتیٰ کہ اس کے بچے کے میں مقیم بچوں کے متعلق بھی معلومات حاصل کر لیں۔ رجانہ اور نادر کی منگنی کا دن بھی معلوم کر لیا۔ نادر کے خاندان کے متعلق بھی سارا پتہ کر لیا۔

ساری معلومات انہوں نے میرا فضل کے سامنے رکھ دیں۔

"کل اس کی بیٹی کی منگنی ہے خان۔" جمعہ خان نے کہا۔ "ناصر آفریدی کے بیٹے نادر آفریدی کے ساتھ۔"

"ہوں۔"

"پھر کیا خیال ہے؟"

میرا فضل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جمعہ خان، گل زمان اور شیریں خان باتیں کرتے رہے۔ گل شیر کو ختم کر دینا مشکل کام نہ تھا۔ میرا فضل کے ان تینوں ساتھیوں میں سے کوئی بھی یہ کام کر سکتا تھا۔

لیکن

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اب گاؤں میں نہیں ہیں۔ اس لیے بہت محتاط ہو کر قدم اٹھانا چاہتے تھا۔ شکار اب ان کی زد میں تھا۔ میرا فضل کی پلک کا اشارہ ہی کافی تھا۔ وہ اس اشارے کے منتظر تھے۔

٭ ٭ ٭

تڑاخ — گولی کی آواز پر گل شیر تڑپ اٹھا۔

پھر کئی گولیاں داغی گئیں۔

گل شیر کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس سے کھڑے رہنا دشوار ہو گیا، ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "یقیناً لڑکے والے آ گئے ہیں۔"

ایک لمحہ کو گل شیر کے چہرے پر رونق آئی۔ آج منگنی کی تقریب تھی اور لڑکے والے آ رہے تھے۔ دستور کے مطابق وہ خوشی میں فائر کرتے آ رہے تھے۔

حیدر خان نے گل شیر کی بدلتی رنگت دیکھی تو جلدی سے باہر گیا۔

واقعی سسرال والے آ گئے تھے۔ وہ لپک کر اندر آیا۔

"خان لڑکے والے آ گئے ہیں۔ مبارک ہو۔"

گل شیر نے تھوک نگل کر خشک حلق تر کیا اور چہرے پر بشاشت کے آثار لاتے ہوئے بولا:

"چلو خیر مقدم کے لیے ہم سب کو گیٹ پر ہونا چاہیئے تھا۔"

"ہاں خان۔"

گل شیر دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر آیا۔ بظاہر خوش نظر آ رہا تھا۔ لیکن جان اٹکی ہوئی تھی۔ اس موقع پر کسی بھی گڑبڑ کی اسے توقع تھی۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ گڑبڑ ہو۔ اپنی عزیز ترین بیٹی کو وہ سکون اور امن سے دوسرے کے ہاتھوں سونپنا چاہتا تھا۔

"خان"

"ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"ہم نے گل شیر سے بدلہ لینا ہے نا۔"

"ہاں!"

"ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔"

"کس بات کی؟"

"بدلہ لینے کی، خان آپ سنیں گے تو داد دیں گے۔"

میرا فضل گولیوں کی پیٹی اور پستول گلے سے اتار رہا تھا۔ جمعہ خان اور وہ دونوں ابھی ابھی باہر سے آتے تھے۔ جمعہ خان اس کا معتمد خاص تھا۔ جاں نثار خادم بھی تھا۔ میرا فضل کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔ یہ ساری باتیں میرا فضل اچھی طرح جانتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اس پر مکمل بھروسہ کرتا تھا۔ گل زمان اور شیریں خان بھی اس کے ساتھی تھے۔ لیکن جمعہ خان کو ان پر برتری حاصل تھی۔

پیٹھ میز پر رکھ کر میر افضل نے گھوم کر قریب کھڑے جمعہ خان کو دیکھا۔ اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہارا دماغ آجکل ضرورت سے زیادہ ہی کام کرنے لگا ہے جمعہ خان۔"

"بالکل۔ میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں کہ گل شیر سے کس طرح بدلہ چاہیئے۔"

"ہوں!"

"ویسے خان آپ کو بتا دوں۔ جتنی ذہنی کوفت اسے ہو رہی ہے نا وہ قتل ہو جانے سے زیادہ ہے۔ دن کو چین ہے نہ رات کو۔"

جمعہ خان نے قہقہہ لگایا۔ "ذرا سے کھٹکے سے ڈر جاتا ہے کہ کہیں اسے قتل کرنے تو آپ نہیں جا پہنچے۔"

"دشمن کو اتنا حقیر بھی نہ سمجھو جمعہ خان۔ یہ نہ ہو ہم تم انتقام کے منصوبے ہی بناتے رہیں۔ اور اس کی گولیاں ہمارے سینوں کے پار ہو جائیں۔"

"اوہ۔ ایسا ناممکن ہے خان۔ آپ کی حفاظت ہم لوگ اس طرح کر رہے ہیں کہ دشمن کی گولی تو کیا خیال کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔"

میر افضل مسکرا دیا۔ داد دینے کو اس کے کندھے پر تھپکی دی اور بولا۔

"تو کیا ترکیب سوچی تھی تم نے؟"

"بتاؤں؟"

"ہاں ہاں۔"

"خان۔"

"ہاں۔"

"اس کی بیٹی کی منگنی ہوئی ہے نادر آفریدی سے۔"

"ہاں مجھے علم ہے؟"

"پتہ ہے نادر آفریدی کون ہے؟"

میر افضل نے نفی میں سر ہلایا۔ جمعہ خان نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور بولا:

"خان ہمارے دفتر کے ساتھ جو سپنسر والوں کا دفتر ہے نا۔"

"ہاں۔"

"وہ ادھر ہوتا ہے سپنسر والوں کے پاس ہے وہ۔ کنسٹرکشن کمپنی ہے نا یہ۔ نادر خان ادھر انجینئر ہے۔"

"اچھا!"

"آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ لمبا اونچا خوبصورت لڑکا ہے۔"

جمعہ خان نے نادر خان کے خدوخال کے متعلق بتایا تو میر افضل بولا "ہو سکتا ہے دیکھا بھی ہو۔ خیر تم تو اپنی ترکیب بتا رہے تھے؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"خان۔ ہم نادر خان کو ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اوہ خان۔ ہم نادر خان سے دوستی کر کے اسے بھڑکا دیتے ہیں کہ گل شیر

اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس کی بیٹی بھی اچھی نہیں ہے۔ اسے بدظن کر کے یہ منگنی تڑوا دیتے ہیں۔ اور —"

"جمعہ — خانا" تڑاخ سے میرا فضل کا تھپڑ جمعہ خان کے گال پر پڑا۔ جمعہ خان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اور وہ گال پر ہاتھ رکھ کر حیرانگی سے میرا فضل کو تکنے لگا۔

میرا فضل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے لہو سا ٹپکنے لگا تھا۔ وہ چلایا۔

"یہ ترکیب بتا رہے تھے مجھے ذلیل آدمی۔ میری دشمنی گل شیر سے ہے اس کی معصوم بیٹی سے نہیں۔ اس بچی نے میرا کیا بگاڑا ہے کہ میں اس پر ظلم کروں۔ اس کے منگیتر کو بدظن کروں۔ اس کی منگنی تڑوا دوں۔

جمعہ خان کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ میرا فضل اتنا اونچا اور عظیم ہو گا۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اس کی عظمت کے سامنے اس نے سرنگوں کر دیا۔

میرا فضل کام پہ جانے کے لیے تیار تھا۔ اپنی گولیوں والی پیٹی اور پستول اس نے گلے میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

لیکن

اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اسے یقین نہ آیا۔

اک پل کو تو وہ پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا۔ بالکل پتھرا سا گیا۔

لیکن

دوسرے لمحے اس کا ہاتھ اپنے پستول پر پڑا۔ گل شیر اس کے سامنے کھڑا تھا لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کور سے پستول نکالتا۔

گل شیر آگے بڑھا

اور

میرا فضل کے قدموں میں گر گیا۔

ایک بار پھر میرا فضل پتھرا گیا۔ گل شیر اس کے قدموں میں جھکا کہہ رہا تھا

"تم عظیم ہو میرا فضل مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ نہیں کر سکتے تو میں حاضر ہوں۔ جتنی چاہو گولیاں میرے سینے میں اتار دو۔ تمہاری عظمت کے سامنے میں سرنگوں ہوں۔"

میرا فضل کچھ نہ سمجھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے گل شیر کے قریب کھڑے جمعہ خان کو جو سر جھکائے کھڑا تھا۔

جمعہ خان نے ہی گل شیر کو جا کر میرا فضل کے متعلق بتایا تھا۔ اور وہ اس کے کردار کی بلندی سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ خود ہی معافی مانگنے اس کے گھر چلا آیا تھا۔ اپنے آپ پر نادم۔ گناہوں کے بوجھ سے جھکا ضمیر کے بار سے سرگرداں چلا آیا تھا۔

"تم عظیم ہو میرا فضل۔ تم چاہتے تو میری معصوم بچی کو بدنام کر کے اس کی منگنی تڑوا کر مجھے ذلیل کر سکتے تھے۔ دکھ دے سکتے تھے۔ لیکن — لیکن — تم نے ایسا نہ کر کے مجھ سے جو بدلہ لیا ہے میں اپنی نظروں میں حقیر ہو گیا ہوں۔ مجھے معاف کر دو یا مار ڈالو۔ میں حاضر ہوں۔"

میرا فضل نے جمعہ خان کو دیکھا۔

پھر

گل شیر کو۔ جو اس کے قدموں میں جھکا تھا۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ جھکا اور گل شیر کو کندھے سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

دوسرے لمحے وہ گل شیر سے بغلگیر تھا ــــ صدیوں پرانی دشمنی کا اس نے خاتمہ کر دیا تھا۔

تلخیاں

جہاز رن وے پر اترنے سے پہلے فضا میں آخری چکر لگا رہا تھا۔ ایئرپورٹ پر اترنے والے مسافروں کے چہرے منزل پر پہنچنے کا سکون محسوس کر رہے تھے۔ اپنے اپنے عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے کی خوشی آنکھوں میں روشنی بن کر چمک رہی تھی۔ بہت سے مسافر خاصے طویل عرصے کے بعد سرزمین وطن پر قدم رکھنے والے تھے۔ اک بے کل سی خوشی سینے میں مچل رہی تھی۔ بھولے بسرے چہرے ذہنوں میں اتر رہے تھے۔ رشتوں کا احساس جاگ رہا تھا۔ لہو کی خوشبو احساس کو چھو رہی تھی۔

عمیر بھی اسی فلائٹ سے آ رہے تھے۔ وہ تین سال کے طویل عرصے بعد وطن آ رہے تھے۔ انجینئرنگ میں ماسٹرز کی ڈگری لینے گئے تھے۔ اس کے بعد وہیں جاب مل گئی تھی۔ پھر یہ خوش رنگ فضا انہیں اتنی بھائی

تھی کہ وہیں رہ جانے کا عزم کر لیا تھا۔

زندگی کی سہولتیں انہیں اپنے وطن میں بھی مل سکتی تھیں کہ اک امیر گھرانے کے فرد تھے۔ والد مرحوم دو بھائیوں کے لیے بہت بڑی جائیداد۔ چالو فیکٹری اور خاصا بنک بیلنس چھوڑ گئے تھے۔ فیکٹری ان دنوں زبیر چلا رہے تھے۔ جائیداد کا حساب کتاب بھی انہی کے پاس تھا۔ بڑے بھائی تھے۔ عمیر کا بچوں کی طرح خیال رکھتے تھے۔ بھابی کو بھی عمیر بہت عزیز تھے۔ لیکن عمیر نے امریکہ ہی کو وطن بنا لینے کا عزم کر لیا تھا۔ دکھ تو بھائی بھابی کو ہوا تھا لیکن عمیر کی خوشی ان کی خوشی تھی۔ اس کے حصے کے امانت دار تھے۔ اس میں خیانت کا کچھ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ عمیر کو امریکہ بس جانے کی اجازت تو زبیر نے بادلِ نخواستہ دے ہی دی تھی لیکن شادی کے معاملہ میں انہیں چھوٹ نہ دے سکتے تھے۔

"شادی تمہیں یہاں ہی کرنا ہوگی۔" انہوں نے عمیر کو دو ٹوک فیصلہ لکھ دیا تھا۔

اور

اب عمیر

انہی کے حکم پر وطن آ رہے تھے۔ وہ چاہتے تو حکم عدولی بھی کر سکتے تھے۔ کیوں کہ جانتے تھے کہ انہیں کس مقصد کے لیے بلایا جا رہا ہے لیکن پھر بھی چلے آئے تھے۔

سارا راستہ وہ مضطرب اور بے چین رہے تھے۔ اپنی گرل فرینڈ جیکی کی الوداعی مسکراہٹ دل میں تیر کی طرح لگ رہی تھی۔ نیلی کانچ ایسی خوبصورت آنکھوں، سنہری بالوں اور یاقوتی ہونٹوں والی جیکی ان دنوں ان کے دل و دماغ پر بری طرح چھائی تھی، وہ اس فیکٹری میں سٹینو تھی جس میں عمیر کام کرتے تھے۔

جیکی کی گاڑی خراب تھی۔ عمیر نے دو بار اسے لفٹ دی تھی۔ لفٹ دینا ہی قریب آنے کا حیلہ بن گیا اور وہاں کی تہذیب کے مطابق دونوں بے روک ٹوک ملنے لگے۔ محبت ہو گئی اور اس محبت کو بخوبی نبھایا جانے لگا۔

عمیر کو یہاں کی یہی بات پسند تھی۔ جس سے چاہو دل لگا لو، من میں بسا لو، پیار کے عملی مظاہرے کر لو۔ اور جس سے چاہو ناطے توڑ لو۔ آج اس کی گرل فرینڈ، کل کسی کی، کوئی پابندی نہیں، کوئی حد بندی نہیں۔

تین سال میں یہ چوتھی لڑکی تھی جو عمیر کے حواس پر چھائی تھی۔ مارگریٹ، سنیلا، روبی پارڈی۔ تینوں سے انہیں عشق ہوا تھا۔ مارگریٹ تو ٹیکساس چلی گئی۔

"میں تمہیں کبھی کبھی مس کروں گی عمیر۔" اس نے بڑی آسانی سے کہا تھا۔

وہ کچھ افسردہ بھی نظر آتی تھی۔ لیکن اس نے عمیر کا سنیلا سے تعارف کرا دیا تھا۔

"یہ میری بہت قریبی دوست ہے۔ اس کی کمپنی تم انجوائے کرو گے۔" اس نے کہا تھا۔

اور

عمیر کالے بالوں اور کالی آنکھوں والی اس سپینش لڑکی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گئے تھے۔

پھر اچانک ہی روبی ان کی راہ میں آ گئی تھی۔ سنیلا نے کچھ مشرقی انداز میں اس نئی لڑکی کو سوکن جانا تھا۔ لیکن عمیر کا جھکاؤ پوری پوری طرح اس کی طرف ہو گیا تھا تو وہ خود ہی ان کے راستے سے ہٹ گئی تھی۔ اس کا یہ بھی اب معاشقہ ایک ایرانی لڑکے سے شروع ہو گیا تھا۔

روبی سے شاید شادی کی بھی نوبت آ جاتی۔ یہ لڑکی خاصی گھریلو سی تھی۔ لیکن شادی کے متعلق وہ سنجیدہ نہ تھی۔

"میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں جب تک تعلیم مکمل نہ ہو جائے میں شادی نہیں کر سکتی۔" اس نے بڑی آسانی سے کہا تھا۔

"لیکن میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔"

"ہم جیسے اب رہ رہے ہیں کچھ سال اور بھی رہ سکتے ہیں۔"

"نہیں۔"

"تو پھر اپنے لیے دوسری لڑکی تلاش کر لو۔"

"تمہیں دکھ نہیں ہو گا؟"

"شاید ہو گا لیکن میں برداشت کر سکتی ہوں۔ تم بخوشی دوسری لڑکی ڈھونڈ سکتے ہو۔"

اور عمیر نے واقعی دوسری لڑکی ڈھونڈ لی تھی۔

ان دنوں ان کے جیکی سے مراسم تھے۔

عمیر کو ان تینوں سالوں میں محبت کا جو تجربہ ہوا تھا وہ خاصہ خوشگوار تھا۔ ان کی زندگی میں جتنی لڑکیاں آئی تھیں۔ بڑی آسانی سے دوسری کے لیے جگہ بنا کر نکل گئی تھیں۔ عمیر کے ذہن میں یہ بات بڑی پختگی سے گھر کر گئی تھی کہ یہاں عورت محبت کے معاملے میں خاصی وسیع النظر اور وسیع القلب ہے۔ حسد، شک اور دکھ کے اس معاملے میں اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ انہیں مشرقی عورت کے جذباتی لگاؤ کا کچھ تلخ تجربہ تھا، خاندان میں عورتیں انہوں نے دیکھی تھیں۔ جن کا خاوندوں کے ساتھ ہر وقت جھگڑا ہی رہتا تھا کہ فلاں عورت سے ہنس کر کیوں بولے۔ فلاں کی طرف اس طرح کیوں دیکھا، فلاں سے بات کیوں کی ــــ یہ جھگڑے بہت سے گھروں میں تھے اور کچھ کے تو بہت سنجیدہ صورت بھی اختیار کر گئے تھے۔

اس وقت بھی جب عمیر پاکستان آ رہے تھے ان کے ذہن میں یہی موازنہ ہو رہا تھا۔ جیکی ان کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ جیکی جو ٹوٹ کر محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ لیکن جو انتہائی لبرل بھی تھی۔ جو یہ جانتی تھی کہ روبی عمیر کی دوست رہ چکی ہے۔ لیکن پھر بھی روبی سے خوشی سے ملا کرتی تھی۔

طیارہ رن وے پر دوڑتا ہوا آیا اور مخصوص جگہ پر رک گیا۔ لوگوں میں ہلچل مچی تو عمیر اپنے خیالات سے چونکے۔

استقبال کے لیے زبیر بھائی اور بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے ریلنگ کے پاس سب کھڑے تھے۔ بھابی نے انہیں سب سے پہلے دیکھا۔ بڑے تپاک اور جوش سے ہاتھ ہلایا۔

عمیر نے بھی ان سب کو شوق اور پیار سے ہاتھ ہلایا۔

اور

جب وہ ایئرپورٹ کی ضروری کارروائیوں کے بعد ان لوگوں کے پاس آئے تو زبیر والہانہ انداز میں ان سے لپٹ گئے۔ بھابی نے بھی پیار کیا۔ گڈو ذرا سا ہچکچائی لیکن عمیر نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ جمو، راشی اور ذکی بھی آئے ہوئے تھے، یہ سب کزن تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔

⁂ ⁂ ⁂

شہنہ نے قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی آسمانی رنگ کا چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھولوں والا سوٹ تراش خراش کے لحاظ سے عمدہ تھا۔ اور اس کے خوبصورت جسم پر خوب بیٹھا تھا۔ جسم کی اجاگر خوبصورتیوں کو اس نے بڑے سے دوپٹے میں لپیٹ لیا۔ بالوں کی لمبی چٹیا پشت پر چھوڑ دی۔ اور میک اپ سے بے نیاز چہرے پر اپنے ہاتھوں کی نازک نازک انگلیاں پھیریں۔ آئینے میں اپنی

آنکھوں کو دیکھ کر آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ اس نے نہ تو آئی شیڈو استعمال کیا تھا۔ نہ ہی مسکارا لگایا تھا۔ آنکھوں کے اندر بھی چمک پیدا کرنے کے لیے کوئی چیز نہ ڈالی تھی۔

لیکن

یہ آنکھیں تو ہمیشہ سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھیں۔ نوکیلی پلکوں کی جھالر تو یوں لگتا تھا جیسے مصنوعی لگائی ہو۔ آنکھوں میں یوں لگتا تھا جیسے آسمان کے روشن ستارے کوٹ کر بھر دیئے ہوں۔

اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو دیکھا۔ انگلی کے سرے سے ان کو چھوا۔ بند کیا، کھولا، پھیلا پھیلا کر دیکھا اور پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی نرم نرم لہریں دوڑ گئیں۔

آج عمیر آرہے تھے نا۔

عمیر

جو اس کے بچپن کے ساتھی تھے۔ اس کے چچازاد۔ اس کے من مندر کے دیوتا۔ جنہیں وہ شروع سے چاہتی چلی آرہی تھی۔ جن کے خیالوں سے اس کی دُنیا آباد تھی۔ جو نہیں جانتی تھی کہ تین سالوں کے پھیلاؤ نے، وقت کے دھارے نے عمیر کو کہاں موڑا ہے۔ لیکن جو اپنے قدموں کو اس نقطے پر گاڑے استقامت سے کھڑی تھی جہاں عمیر جانے سے پہلے اسے چھوڑ کر گئے تھے۔

آئینے کے سامنے سے ہٹ کر وہ کھڑکی کی طرف آئی اور برابر والی کوٹھی

کی طرف دیکھا۔ ابھی کوئی گاڑی نہیں آئی تھی۔ کچھ لوگ عمیر کو لینے ایئرپورٹ پر گئے ہوئے تھے، کافی لوگ گھر میں تھے۔ انتظار ہو رہا تھا سیما، نفی، بانو، سدرہ، زیبا سبھی لان میں گھوم رہی تھیں۔

اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ بس اب وہ لوگ آیا ہی چاہتے تھے۔ وہ کھڑکی سے ہٹی۔ اپنے کمرے کو ایک نظر دیکھا۔ ادھر ادھر پڑی چیزیں اٹھائیں اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی اور برآمدے کا دروازہ کھول کر زبیر کے ہاں آگئی۔

کچھ ہی دیر میں وہ اپنی پھوپھی، تایازاد اور خالہ زاد بہنوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس نے سب کو غائر نظروں سے دیکھا۔ سبھی نے آج خاص اہتمام سے تیاری کی ہوئی تھی۔ سارہ نے جدید طرز کا لباس پہنا ہوا تھا۔ بانو نے میک اپ بڑی مہارت سے کیا ہوا تھا۔ سیما نے بالوں کا سٹائل بدل کر منفرد نظر آنے کی کوشش کی تھی۔ نفی نے ساڑھی باندھی تھی۔ چھوٹی سی چوٹی کی وجہ سے شرم آ رہی تھی۔ ساڑھی کو چادر کی طرح جسم کے گرد لپیٹے جا رہی تھی۔

ساری لڑکیاں ہمہ انتظار تھیں۔ شوق سے عمیر کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

"اللہ۔ میرا دل تو دھک دھک کر رہا ہے جانے عمیر اب کیسے ہو رہے ہوں گے؟" سارہ بولی۔

"بہت شریر تھے۔ پتہ ہے نا جانے سے پہلے کتنا تنگ کرتے تھے مجھے!" بانو نے ہنس کر کہا۔

"دیکھیں ہم سب میں سے کس کا نصیب جاگتا ہے۔" نفی نے شوخی سے آنکھیں گھمائیں۔

"کیوں؟" تقریباً سبھی نے تجسس سے پوچھا۔

"امی بتا رہی تھیں، زبیر نے بھائی عمیر کو اسی لیے بلایا ہے"

"کس لیے؟"

"شادی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے!"

"اوہ۔ ٹھیک ٹھیک۔ میرے امی ابو بھی کچھ یہی باتیں کر رہے تھے۔"

"پتہ نہیں عمیر کی پسند کیا ہوگی؟"

"اللہ کرے مجھے پسند کر لیں میں تو امریکہ کے لیے بس مری جا رہی ہوں۔"

"عمیر شادی کر کے امریکہ واپس چلے جائیں گے؟"

"اکیلے تھوڑا ہی جائیں گے۔ ہم میں سے کسی خوش نصیب کو ساتھ لے کر جائیں گے۔ محترمہ۔"

سب لڑکیاں ہنسی مذاق میں دل کی دبی دبی خواہش کا اظہار بھی کیے جا رہی تھیں۔ شہنہ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے دل ہی دل میں غصہ بھی آ رہا تھا۔ عمیر کے متعلق سوچنے یا باتیں کرنے کا ان کو کیا حق تھا۔ سارا حق تو اسے حاصل تھا۔

لیکن؟

اس کا دل ڈول گیا۔

وہ کس بنا پر یہ حق اپنا حق سمجھ رہی تھی۔ عمیر نے تو کبھی اشارۃً

کنائیتہً" بھی کچھ نہ کہا تھا۔ جانے سے پہلے بھی وہ کھلنڈرا سا تھا۔ سبھی کزنز سے اس کی دوستی تھی۔ ہر ایک سے بے تکلف ہونا اس کی عادت تھی۔ ہر ایک سے دوستی کر لیتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس کی انہی باتوں پر وہ دل ہی دل میں جلا کرتی تھی۔ اس سے روٹھ بھی جایا کرتی تھی۔

"شہنہ جی۔ آپ خاموش کیوں ہیں۔ ہم سب ہٹر پٹر بولے جا رہی ہیں اور آپ....." سارہ نے شہنہ کی طرف دیکھا۔

"وہ بول بول کر انرجی ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ عمیر آئے گا تو بولے گی جب تک ہم تھک چکے ہوں گے۔ اور منہ سے بات ہی نہ نکلے گی۔" نقی نے کہا تو سب ہنس پڑیں۔

"پھر صرف شہنہ بولیں گی ــــ ہیں نا؟"

"ہاں"

"خاطر جمع رکھو جی۔ مجھے تو ان کے خیال ہی سے شرم آ رہی ہے۔"

"شرم کس بات کی۔ بھئی اپنے ماموں زاد ہی تو ہیں!"

"ہمارے بھی ماموں زاد ہی ہیں۔ پھر بھی....."

لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور شہنہ کے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ "وہ آ گئے۔" کی دو چار صدائیں بلند ہو گئی تھیں۔

گیٹ میں آگے پیچھے دونوں گاڑیاں داخل ہو رہی تھیں اور مہمانوں کو رسیو کرنے کے لیے گھر میں آئے سارے افراد ادھر دوڑ پڑے تھے۔

آپ کا نام.... شاید سارہ" عمیر نے نیلی پیلی پوشاک والی لڑکی سے کہا۔

"جی ہاں۔ تین سالوں میں نام تک بھول گئے عمیر بھائی؟"

"بھولا تو نہیں۔ کنفیوز ہو گیا تھا۔ بھئی آپ ڈھیر ساری لڑکیاں جو جمع ہو گئیں۔"

"بھلا میں کون ہوں؟"

"بانو"

"درست فرمایا۔"

"اور یہ؟"

"غالباً نقی۔"

"جھوٹ بول رہے تھے کہ یاد نہیں رہے نام۔ نقی تو ہم سب میں سے چھوٹی تھی جب آپ گئے تھے۔"

"ہاں اس کی ناک ہمیشہ بہتی رہتی تھی۔"

"ہائے عمیر بھائی اب میں اتنی چھوٹی بھی تو نہ تھی!"

"گویا ناک بہنے والی سٹیج گزر چکی تھی۔"

سب نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

رات کے کھانے کے بعد عمیر اپنی ان کزنز کے پاس آ بیٹھے تھے۔ بڑے بوڑھوں اور بزرگوں کی محبت میں کچھ بے چینی بھی محسوس کر رہے تھے۔ سب کے سب ایک ہی قسم کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے وہ بور

ہو چکے تھے۔

جمو اور ذکی نے یہ بات بھانپ لی تھی۔

اور

انہیں کمال خوبصورتی سے سنجیدہ قسم کے لوگوں کے نرغے سے نکال لائے تھے۔ ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرے میں سب جمع تھے۔ کوئی بیڈ پر نیم دراز تھا کوئی سائڈ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ کسی نے کرسی گھسیٹ لی تھی۔ اور کوئی کشن گودی میں رکھے قالین پر آلتی پالتی مارے تھا۔ ذکی، جمو اور طاری کے علاوہ سارہ بانو، زیبا، شگو، فری، نفی، سیما اور شہنہ بھی تھیں۔ بڑے بوڑھے اپنی انہی باتوں میں الجھے تھے، مدت بعد سب اکٹھے ہوتے تھے۔ باتیں ہی باتیں تھیں۔ رشتوں کے جھگڑے، جائیداد کے قضیئے، کسی کی زیادتی کے قصے، گرما گرم باتیں ہو رہی تھیں۔

اور اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نوجوان نسل اس کمرے میں آگئی تھی۔ خوب کھل کر باتیں ہو رہی تھیں۔ قہقہے اڑا رہے تھے۔ تکلف نامی چیز تھی ہی نہیں۔ لڑکیاں پہلے کچھ کترائیں۔ لیکن جب عمیر بے تکلفی پر اتر آئے تو وہ بھی کان کرنے لگیں۔

ہاں شہنہ حسب عادت چپ تھی۔ کچھ زیادہ دلچسپی ان لوگوں کی باتوں میں نہ لے رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو عمیر کو ان سب لوگوں سے دور کہیں اور لے جاتی۔ جہاں وہ ہوتی اور عمیر۔ اور جہاں خاموشی بولتی۔ جہاں دل کی باتیں کہی سنی جاتیں۔ جہاں تین سالوں کی آپ بیتی دہرائی

جاتی۔ پاس محفل تھا جو وہ بیٹھی تھی۔ ورنہ اسے یہ سب کچھ اچھا تو نہیں لگ رہا تھا۔ عمیر نے اس سے سب جیسا ہی سلوک کیا تھا نا۔ اسے سب سے الگ تھلگ اور منفرد تو نہیں بنایا تھا۔

"آپ پڑھتی ہیں؟" عمیر نے شہنہ کی طرف دیکھا۔

"جی" وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گئی۔ نگاہیں اٹھیں اور جھک گئیں۔ عمیر نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"سکول میں ہیں یا کالج میں؟" عمیر نے جان بوجھ کر چھیڑا۔

شہنہ نے اک نگاہ کا فراد اس پر ڈالی۔ زیبا جلدی سے بول اٹھی۔ "بی اے فائنل میں ہے عمیر صاحب!"

"اور آپ؟" انہوں نے بانو سے پوچھا۔

"تھرڈ ایئر میں۔" بانو کی جگہ ذکی بولے۔

عمیر باری باری سب سے پوچھنے لگے۔ سیما کی باری آئی تو بولے۔

"جناب کیا کر رہی ہیں؟"

"شادی کا انتظار۔" وہ بے دھڑک بولی۔

شہنہ کو تو اس بے باکی پر بڑا ہی تعجب ہوا۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تو وہ ان کا ساتھ بھی نہ دے سکی۔ لیکن اسے حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ اس جواب پر عمیر سب سے زیادہ محظوظ ہوئے تھے۔

"ویری گڈ ..... ویری گڈ۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "سچائی سے سچائی کا اعتراف کرنے والی لڑکیاں مجھے بہت پسند ہیں۔"

سیما عمیر کی اس بات پر جھوم سی گئی "شکریہ صاحب شکریہ!"

شہنہ کی آنکھوں میں اضطراب چھلک گیا۔

رات گئے تک یہ محفل سجی رہی۔

عمیر چھ ہفتے کے لیے آتے تھے۔ ان چھ ہفتوں کے پروگرام بنائے گئے۔ پکنک، پکچرز، دعوتیں، سبھی نے مل جل کر انجوائے کرنے کا پروگرام بنایا۔

"کالج سے چھٹی" زیبا نے ہاتھ اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"دفتر سے چھٹی" اس کے جواب میں جمو نے آواز بلند کی۔

"یہ بات غلط ہے بھئی" عمیر نے سب سے کہا۔ کام پہلے اور باتیں بعد میں۔ کچھ احساسِ فرض بھی ہونا چاہیئے!"

"یار تم کونسا روز روز آؤ گے۔ کام تو روز ہی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے"

"بھئی نہیں۔ میں تم سے اتفاق نہیں کروں گا۔ مجھے اس کی عادت نہیں رہی۔ بہت فرق پڑ گیا ہے سوچنے کے انداز میں!"

"اچھا اچھا۔ اب تقریر نہ شروع کر دینا۔ جو کوئی بھی باہر سے آتا تقریروں کا مواد جمع کر کے لاتا ہے۔ بور کر دیتا ہے" ذکی کی بات پر سب ہنس دیئے۔

یہی طے پایا کہ ہر پروگرام چار بجے کے بعد کا رکھا جائے۔ تاکہ سکول کالج اور دفتری اوقات اس سے متاثر نہ ہوں۔

عمیر کی آمد سے کوٹھی کے خاموش ماحول میں ہلچل مچ گئی تھی۔ اتنی بڑی جہازی سائز کوٹھی میں زبیر، بھابی اور گڈو رانی کا تو پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ کہاں ہیں۔ دو چار نوکر تھے۔ جو کبھی کبھی اونچی آوازوں میں ایک دوسرے سے تکرار کرتے تھے۔ تو پتہ چلتا تھا کوٹھی آباد ہے ورنہ زبیر صبح گئے شام لوٹے۔ بھابی اندر ہی اندر گھر کی سج دھج میں لگی رہیں۔

اور گڈو سکول سے واپسی پر زیادہ وقت شہنہ کے پاس گزارنے کی عادی بن گئی تھی،

اب عمیر آئے تھے تو ہر وقت جیسے ہنگامہ ہی بپا رہتا۔ لڑکیوں لڑکوں کی تشخیص ہی نہ رہی تھی۔ عمیر نے تو چیدہ چیدہ کزنز کا ایک گروپ بنا لیا تھا۔

اور

یہ گروپ ــ جب دیکھو ہلچل پہ آمادہ ہی نظر آتا تھا۔ جمو، ذکی طاری اور راشی تو اس کے پرانے دوست تھے۔ سیما، نقی، زیبا اور سارہ سے اس نے اب دوستی کر لی تھی۔ شہنہ بھی اس گروپ میں شامل تھی۔ لیکن اکثر کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ عمیر کی طرف سے وہ خصوصی توجہ چاہتی تھی لیکن وہ تو جیسے چند دن محض تفریح کے لیے یہاں آتے تھے اور مل جل کر تفریح کرنے کے قائل تھے۔

اس شام پکچر کا پروگرام بنا۔ تین گاڑیوں میں سب نے سینما پہنچنا تھا۔ دو گاڑیاں لد چکیں تیسری عمیر اور اس کے چار ساتھیوں کے لیے تھی۔

"سبھی آگئے؟" عمیر نے گاڑی سٹارٹ کرنے سے پہلے پوچھا۔

"میرا خیال ہے شہنہ نہیں آئی۔" زیبا بولی۔

"ہاں اسے دیکھا نہیں!" ذکی نے کہا۔

"کیوں نہیں آئی؟" عمیر بولے

"پتہ نہیں۔" سارہ نے کہا۔

"اسے علم نہیں تھا کہ آج پکچر پہ جانا ہے؟" عمیر نے پوچھا

"تھا تو۔" زیبا بولی

"پھر؟" عمیر نے پوچھا

"جا کر پوچھ لو۔" ذکی نے عمیر سے کہا

"لیٹ ہو جائیں گے یار۔" عمیر نے گھڑی دیکھی۔

"کوئی بات نہیں۔ شہنہ ناراض ہو جائے گی۔" ذکی بولا۔

"ناراض تو وہ اکثر ہی رہتی ہیں۔" عمیر نے منہ بنا کر کہا تو بات جیسے زیبا کے دل لگی۔ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"عجیب لڑکی ہے یار" عمیر نے ہنس کر کہا۔ "موڈ ہر وقت آف ہی رہتا ہے۔ لگتا ہے ہر وقت کڑھتی ہی رہتی ہے۔ ایسی بدمزاج پہلے تو نہ تھی وہ۔"

"اتنی جلدی اس کے متعلق ایسی رائے قائم نہ کر لو۔" ذکی نے شہنہ کی طرف داری کی۔ زیبا نے ناگواری سے اسے دیکھا لیکن وہ پرواہ کئے بغیر بولا۔

"شہنہ بہت اچھی لڑکی ہے اور میرے خیال میں تمہاری آمد کا جتنا انتظار اسے تھا کسی اور کو نہیں تھا۔"

"کمال ہے یار ذکی۔ یہ بات ہے۔ تو پھر وہ ہنسی خوشی ہر پروگرام میں حصہ کیوں نہیں لیتی۔ بگڑی بگڑی دکھائی دیتی ہے۔"

"تمہارا واہمہ ہے۔"

"میں نے تو یہی محسوس کیا ہے۔"

"اور ٹھیک محسوس کیا ہے۔" زیبا جلدی سے بولی۔ "خدا جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ شاید ہمارا آپ سے فری ہونا اسے پسند نہیں؟"

"کیوں؟"

"یہ تو اسی سے پوچھئے گا۔"

"اچھا بھئی پوچھ تو بعد میں لینا۔ پہلے اسے جا کر بلا تو لاؤ۔"

"کون جائے؟"

"ظاہر ہے عمیر۔"

"اوہ خدایا۔"

عمیر ذکی کے کہنے پر گاڑی سے نکلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے برآمدے کے درمیانی دروازے کو عبور کر کے رحمان چچا کے گھر آگئے۔

چچی غالباً ادھر ہی آ رہی تھیں۔ ان سے عمیر نے پوچھا "شہنہ کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہوگی۔"

"ہم پکچر دیکھنے جا رہے تھے۔ اسے پتہ بھی تھا۔ تیار ہوئی یا ....."

"جا کر دیکھ لو۔" چچی کہتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

عمیر تیز تیز قدم اٹھاتے شہنہ کے کمرے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلا تھا۔ پھر بھی انہوں نے تاک لیا۔

"کون؟"

"آ جاؤں؟"

"اوہ آپ!"

"جی ہیں"

"کیسے آ گئے ادھر؟"

"پکچر کا پروگرام تھا شہنہ!"

"جی تھا تو۔"

"پھر تم تیار کیوں نہیں ہوئیں؟"

"بس"

"بس کیا۔"

"میں نہیں جا رہی"

"کیوں؟"

"میری مرضی!"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"کیا فرق پڑے گا جو میں نہ جاؤں گی عمیر صاحب۔ اور لوگ تو ہیں آپ جائیں۔"

شہنہ کی آواز میں شکوہ تھا۔ طنز تھا اور جانے کیا کیا تھا۔ عمیر کو یہی ایسی باتوں سے ہی تو کوفت ہوتی تھی۔ انہوں نے بھرپور نظروں سے شہنہ کو دیکھا اور بولے۔ "شہنہ تمہیں خیال ہونا چاہیئے کہ سب لوگوں کا پروگرام خراب ہو رہا ہے۔"

"ہونا نہیں چاہیئے۔ ایک میرے نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا۔" وہ بولی۔

"تم ناراض ہو کیا؟" عمیر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "عجیب بات ہے جب سے میں آیا ہوں تمہیں ناراض ہی دیکھ رہا ہوں۔"

"شہنہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"شہنہ۔ مجھے یہ باتیں قطعاً پسند نہیں۔" انہوں نے شہنہ کو کندھے سے پکڑ کر اس کو اپنی طرف گھما لیا۔ "بات کیا ہے آخر؟"

"کچھ نہیں۔"

"پکچر نہیں چلو گی؟"

"نہیں"

"وجہ؟"

شہنہ نے اک نگاہ ان پر ڈالی۔ یہ بولتی ہوئی نگاہ شکوہ ہی شکوہ تھی لیکن عمیر کو غصہ آ رہا تھا۔ اس کا کندھا قدرے جھٹک کر بولے۔ "مجھے بھی اور خواہ مخواہ الجھنے والی لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔"

شہنہ نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھند سی پھیلنے لگی۔

لیکن عمیر اس کی طرف دیکھے بغیر غصے سے پاؤں پٹختے کمرے سے نکل گئے۔

⁂ ⁂ ⁂

عمیر ہاتھ میں ریکٹ پکڑے شہنہ کی طرف آتے جولان کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ "بیڈمنٹن کھیلو گی؟" عمیر نے ریکٹ گھماتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!"

"کھیلنا نہیں آتا؟"

"آتا ہے۔"

"پھر کیوں نہیں کھیلتیں!"

"میری مرضی۔"

"ہر وقت میری مرضی۔ میری مرضی۔ کبھی دوسروں کی مرضی بھی دیکھ لیا کرو۔"

شہنہ نے اداس نگاہوں سے عمیر کو دیکھا۔

"شہنہ۔" ان نگاہوں سے عمیر کچھ کچھ بے چین نظر آئے۔

"جی۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری عادتیں کیسی ہیں؟"

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے انہیں پھیکی پھیکی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"آخر تم اس طرح کیوں کرتی ہو۔ سب لوگ کھیل کے لیے کورٹ کے پاس ہیں۔ اور تم یہاں آگئی ہو؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"ہر پروگرام بدمزہ کرنے میں تمہیں مزہ آتا ہے کیا؟" وہ ناراض ہو کر چل دیئے۔

شہنہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

اس شام سب ڈرائنگ روم کے بغلی کمرے میں جمع تھے۔ کیرم کھیلا جا رہا تھا۔ ذکی اور طاری برابر ہار رہے تھے۔ عمیر اور زیبا کی جیت تھی۔

"طاری تمہیں بالکل کھیلنا نہیں آتا۔" ذکی نے زچ ہو کر کہا۔

"تو پھر کوئی اور پارٹنر ڈھونڈ لو۔" عمیر بولے۔ "پھر بھی ما بدولت کا مقابلہ کرنے سے رہے۔"

"شہنہ بہت اچھا کھیلتی ہے۔" نفی بولی۔ "اسے ساتھی بنا لو۔"

"اوہ کن کا نام لے لیا؟" عمیر نے بیزاری سے کہا۔ زیبا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"زیادتی ہے عمیر۔" ذکی نے گوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" عمیر بولے

"تم شہنہ سے بیزار کیوں ہو؟" ذکی نے پوچھا۔

"میں ہوں یا وہ ہے؟" عمیر جھلائے۔

"تم نے ہمیشہ اسے نظر انداز کیا ہے۔" ذکی نے کہا۔ تو عمیر کے ساتھ سب بھی اس کے پیچھے پڑ گئے۔

"حد ہو گئی۔" طاری بولا۔ "عمیر نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ خود ہی الگ

الگ رہتی ہے۔"

"خاصی بدمزاج ہو رہی ہے ان دنوں۔" زیبا نے کہا۔

"تم تو پلیز چپ ہی رہو تو اچھا ہے۔" ذکی بولا۔

"بھئی وہ ہمارے ساتھ رہنا شاید پسند ہی نہیں کرتی۔ عمیر نے کہا۔

"تم غلط کہتے ہو۔" ذکی نے کہا۔

"عمیر نے کندھے اچکاتے۔ اور جھلاتے ہوئے بولے۔" مجھے تو اس لڑکی کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ہر وقت موڈ آف ہی رہتا ہے۔ مجھے ایسا مزاج بالکل پسند نہیں۔"

"تمہیں اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔" ذکی بولا

"کیوں؟"

"اس لیے کہ شہنہ اور تمہارا عمر بھر کا ساتھ...."

"کیا؟ ....کیا؟ ....کیا؟" عمیر نے گوٹیں پھینکتے ہوئے کہا۔ سب دم بخود ہو گئے۔

"جانتے تو ہو۔ زبیر بھائی نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔" ذکی بولا۔

"کس لیے؟"

"شادی کے لیے۔"

"شادی کے لیے؟ اور وہ بھی شہنہ کے ساتھ ـــ ہوں!" عمیر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ زیبا اور نقی کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل گئیں۔

"ہاں۔ یہ بات طے شدہ ہے۔" ذکی نے کہا۔ "چچی چچا اور زبیر بھائی کل بڑی سنجیدگی سے طے کر رہے تھے۔"

"ناممکن۔" عمیر نے ایک دم کہا۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس بات پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ شہنہ سے تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کیوں ـــ کیا عیب ہے اس میں؟"

"سب سے بڑا عیب .... اس کی تنگ نظری۔"

"کیا مطلب؟"

"اب تم مطلب نہیں سمجھ سکو گے۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے لیے شہنہ کا نام ایک عرصے سے لیا جا رہا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ میں تم صرف کزن کے علاوہ کچھ اور بھی ہو۔" ذکی کی بات پر عمیر نے اک استہزائیہ قہقہہ لگایا۔

✣ ✣ ✣

زبیر اور بھابی، عمیر سے شادی کے مسئلے پر بڑی سنجیدگی سے بات کرنے کے موڈ میں تھے۔ "جانتے ہو تمہیں میں نے کیوں بلایا ہے؟" بھیا نے کہا۔

"جی نہیں۔" وہ جانتے ہوئے بھی انجان بن کر بولے۔

"عمیر ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" بھابی بولی۔

عمیر جواب تک ہنسی مذاق کر رہے تھے ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ بھابی

کی طرف رُخ کرتے ہوئے بولے "میں شادی نہیں کروں گا بھابی!"

"کیوں؟" بھیا اور بھابی ایک دم کہہ اٹھے۔

"بس۔"

"کیا وہاں کوئی...."

"بھابی..... وہاں تو جب جاؤں گا دیکھوں گا۔ ویسے میں آپ سے صاف صاف کہہ دوں کہ یہاں شادی ہرگز نہیں کروں گا۔"

"عمیر!"

"جی بھیا۔"

"تم شاید نہیں جانتے۔ لیکن بزرگوں نے تمہیں شروع ہی سے شہنہ سے منسوب کر دیا تھا۔ چچا چچی کی بھی یہی خواہش ہے اور ہمارے والدین نے بھی یہی چاہا تھا۔"

"میں بلا سوچے سمجھے کئے جانے والے فیصلوں کا پابند نہیں ہوں۔"

"تمہیں ایسی باتیں کہتے ہوئے دکھ نہیں ہوتا۔"

"نہیں۔"

عمیر کے دو ٹوک جواب سے زبیر ششدر رہ گئے۔ وہ شاید تلخ کلامی پر اتر آتے کہ بھابی ان کا عندیہ بھانپ کر نرمی سے بولیں: "عمیر۔ تمہیں امریکہ بھیج دینے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنوں سے یوں کٹ جاؤ۔ شہنہ بہت پیاری بڑی اچھی لڑکی ہے۔ شروع ہی سے وہ سنتی آئی ہے کہ تمہارے ساتھ وابستہ ہوگی۔ اس لیے اس کے ذہن میں تمہاری تصویر کندہ

ہو چکی ہے، کہتے اچھے اچھے رشتے آتے لیکن اس نے کہیں بھی بات نہ کرنے دی۔ کیا اس سے صاف ظاہر نہیں کہ وہ تمہارے نام...."

"اوہ۔ بھابی خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کریں۔ ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ لیکن مجھے اس مزاج کی لڑکی بالکل پسند نہیں۔"

"عمیر...." بھیا نے ڈانٹا۔

عمیر اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن جاتے جاتے بھابی سے کہہ دیا: "میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں یہاں شادی نہیں کروں گا۔"

اگلے کئی دن بحث و تکرار کی نذر ہو گئے۔ شہنہ ان باتوں سے بے خبر نہ تھی۔ اس کا دل بجھ گیا۔ اس کے روشن دیپ ایک ایک کر کے بجھ گئے۔ اسے اپنی دنیا میں چار سو اندھیرا ہی اندھیرا پھیلتا محسوس ہوا۔

عمیر کو بھیا قائل کر سکے نہ بھابی۔ شہنہ کی اداس صورت اور نم آلود آنکھوں سے تو انہیں چڑ سی ہو گئی۔

چھ ہفتے گزار کر وہ واپس چلے گئے۔ اپنے حصے کا بہت سا پیسہ باہر منتقل کرنے کے سوا اور کوئی کام انہوں نے یہاں نہ کیا۔

اداس اور سوگوار چہروں سے انہیں رخصت کیا گیا۔ شہنہ ان سے نہیں ملی۔ اس سے ملنے کی انہوں نے کوشش بھی نہیں کی۔

٭ ٭ ٭

جیکی کی نیلی کانچ ایسی آنکھوں میں ہیروں کی سی چمک ابھر آئی۔ یاقوتی ہونٹوں پر تڑپتی مسکراہٹ لیے وہ عمیر کی طرف بڑھی۔ عمیر کے بازو پھیل

گئے۔ اور انہوں نے حسین جیکی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر لیا۔ سکون، اطمینان اور بھرپور خوشی سے مغلوب ہو کر عمیر نے جیکی کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھتے ہوئے سرگوشی کی: "میں تمہارے لیے واپس آگیا ہوں۔ جیکی ہم جلد شادی کر رہے ہیں۔"

"اوہ — عمیر" جیکی فرطِ جذبات سے مغلوب آواز میں صرف یہی کہہ سکی۔

"میں تمہارے لیے بہت سے بندھن توڑ آیا ہوں جیکی۔ تم میری بنو گی نا"

"میں تمہاری ہوں اور تمہاری رہوں گی۔"

"او مائی سویٹ ہارٹ!"

عمیر بے انتہا خوش تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اپنوں میں نہیں اجنبیوں میں ڈیڑھ ماہ گزار کر آئے ہوں۔ گھٹے گھٹے ماحول میں رہنا انہیں کب پسند تھا۔ جیکی کا نرم و نازک وجود ان کی باہوں میں سمٹا ہوا تھا۔

"محبت اسے کہتے ہیں" وہ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔ ایسے میں لاشعوری طور پر شہنہ کا خیال آرہا تھا۔

"ہونہہ" انہوں نے سوچا "جو لڑکی محبت کے بنیادی آداب ہی سے ناواقف تھی اسے اپنا جیون ساتھی کیوں کر بنا سکتے تھے۔"

⁂ ⁂ ⁂

کئی دوستوں نے حق دوستی نبھانا چاہا۔ مغربی لڑکی سے شادی کرنے

پر منع کیا۔ لیکن عمیر جنہوں نے اپنے بھائی بھابی کی بات نہ مانی تھی۔ چچی چچا کو ناراض کیا تھا۔ شہنہ کی پرواہ نہ کی تھی۔ ان کی کہاں سنتے۔ اپنی من مانی کر ہی لی۔

جیکی سے شادی کر کے انہوں نے یوں سمجھا جیسے خوشیوں کی حسین و رنگین جنت خرید لی ہے۔ پیسہ پاس کافی تھا۔ انہوں نے اپنے لیے ایک خوبصورت علاقے میں چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا تھا۔ اس فلیٹ میں آسائش اور آسودگی کی ہر چیز موجود تھی۔

جیکی بے انتہا خوش تھی۔

"میں تو یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی عمیر کہ کبھی کرائے کے اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر میں اپنے ذاتی مکان میں رہوں گی۔ تم نے میری اک جلتی خواہش کو پورا کیا ہے۔ تم بہت اچھے ہو بہت ہی اچھے۔"

"میں تمہارے لیے ہمیشہ خوشیاں چنتا رہوں گا جیکی — یہ گھر ہماری چھوٹی سی جنت ہے۔"

"بالکل بالکل۔"

"اس جنت میں ہم ایک دوسرے کے اعتماد اور محبت کے سہارے جیئیں گے۔"

"ہاں عمیر!"

"تم ایک اچھی بیوی بنو گی۔"

"اور تم ایک اچھے شوہر۔"

"بالکل"

"ہمارا یہ وعدہ ہمیشہ قائم رہے گا۔"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔"

دونوں ایک دوسرے کی معیت میں بے انتہا خوش تھے۔ عمیر تو کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔ اپنی پسند اور مرضی کی شادی کی تھی۔ جیکی ہر لحاظ سے ان کے معیار پر پوری اترتی تھی۔

"جیکی"۔ ایک دن عمیر نے کہا۔ جیکی کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

"ہوں"

"میرا خیال ہے تم کام چھوڑ دو۔"

"کیوں؟" جیکی نے پوچھا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم آٹھ گھنٹے مشین کی طرح دفتری کام کرو۔ اور اس کے ساتھ گھر کی ذمہ داری بھی نبھاؤ۔"

"ہم نے گھر کے کام بانٹ رکھے ہیں۔ تم بھی تو دونوں کام کرتے ہو۔ نوکری بھی اور گھر کا کام بھی۔"

"اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ تم کام چھوڑ دو۔ تم گھر کا کام کرو میں باہر کا۔ جیکی میں گھریلو کاموں کا عادی نہیں ہوں۔ سچ پوچھو تو ہمارے ہاں ایک ہی بات اچھی ہے وہ یہ کہ مرد کماتا ہے اور عورت گھر کا انتظام سنبھالتی ہے۔"

جیکی نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔ "تمہیں تو اپنے معاشرے کی باتیں پسند ہی نہیں!"

"جو ناپسند ہیں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"یعنی تمہیں وہاں کی عورت کا رویہ پسند نہیں؟"

"محبت کا رویہ"

"وہ واقعی تنگ نظر ہوتی ہے؟"

"ہاں، محبت کے معاملے میں اور یہی بات مجھے ناپسند ہے۔ دیکھو نا۔ ہم بھی تو محبت کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں نے کبھی تمہیں تمہارے دوستوں سے ملنے سے منع نہیں کیا۔ تم نے کبھی مجھے دوستوں سے ملنے سے نہیں روکا۔"

جیکی اترا اترا کر عمیر کو دیکھنے لگی۔ عمیر اکثر اسے اپنے ہاں کی پسندیدہ باتیں بتایا کرتا تھا۔ جس پر جیکی پھولے نہ سماتی تھی۔ اور بڑے طنز و تمسخر سے ان باتوں پر ہنسا کرتی تھی۔

جیکی کا کام عمیر نے چھڑا دیا۔ جیکی کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ وہ صرف اور صرف گھر کی ہو رہے گی۔ کمانے کا تردد نہیں ہوگا۔ اور آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد گھر میں سر سے پیر تک کام کرنا بھی کبھی چھوٹ سکے گا۔

وقت کا چکر چلتا رہا۔

جیکی اور عمیر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے شاہراہِ زندگی پر

قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ جیکی نے ساری گھریلو ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ عمیر کو نوکری کرنے کے سوا کوئی اور کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ جیکی اپنے دوستوں اور ملنے والوں میں بڑی معتبر ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ان سب میں منفرد اور ممتاز سمجھتی تھی۔ اس کی زندگی پر کئی لڑکیاں رشک کرتی تھیں۔

شادی کے چوتھے سال جیکی اور عمیر نے اپنی جنت میں کسی گلہائے رنگین کی تمنا کی۔ "بس بہت آزاد رہ لیا۔ اب ہمارے بچے ہونے چاہئیں۔ پھول سے بچے۔" عمیر نے جیکی کے سامنے اپنی فطری خواہش کا اظہار کیا۔

"میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔ بچوں کے بغیر ہماری یہ جنت سونی ہے۔"

"بالکل بالکل"

جیکی امید سے ہوئی تو طبیعت کچھ مضمحل رہنے لگی وہ گھر کا کام کاج اور ذمہ داری بمشکل نبھا رہی تھی۔

"جیکی" — ایک دن عمیر نے کہا۔

"ہاں"

"ہم کسی نوکرانی کا بندوبست نہ کر لیں؟"

"نوکرانی؟ — جانتے ہو کتنی مہنگی پڑے گی۔ ہم اس کی تنخواہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"یہ بات تو ہے — لیکن تمہیں کتنی تکلیف ہوتی ہے کام کرتے ہوئے"

"وہ تو ہے۔ پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بات نہیں وقت گزر ہی جائے گا۔"

"تمہاری ذمہ داریاں تو اور بھی بڑھ جائیں گی۔"

"ہاں"

"پھر؟"

کیا کریں — سارے کام کرنا ہی پڑیں گے۔"

"مددگار تو ہونا ہی چاہیئے۔"

"تم جو ہو۔"

"اوں ہوں۔ یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتے۔ نوکرانی کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔"

جیکی نے بھلا کب سوچا تھا کہ اسے نوکرانی بھی ملے گی۔ بڑے بڑے امراء ہی وہاں نوکرانیاں رکھتے تھے۔ ورنہ ہر عورت سارے کام کرتی تھی۔ عمیر کو اس کا اس قدر خیال تھا؟ جیکی فخر سے بہکی جاتی تھی۔

وہاں سے نوکرانی کا مسئلہ حل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن عمیر نے یہ مسئلہ حل کر ہی لیا۔ اس نے پاکستان سے اپنے ایک دیرینہ ملازم فضلو کی بیٹی جیرو کو بلا بھیجا جس کا خاوند ایک حادثے میں مر گیا تھا۔ اور وہ باپ کے در پر بوجھ بنی بیٹھی تھی۔

⁂

جیکی اور عمیر اپنا چاند سا بیٹا لے کر ہسپتال سے واپس آئے تو جیرو کے

آنے کی اطلاع ملی۔ جیرو ہفتے کو پہنچ رہی تھی۔

"جیکی خوش ہو جاؤ۔ تمہاری نوکرانی آ رہی ہے۔ کچھ دن اس کے ساتھ محنت کرنا ہوگی۔ اس کے بعد تم ہر کام سے آزاد ہو جاؤ گی۔ وہ سارے کام خود کر لیا کرے گی۔"

"عمیر تم بہت اچھے ہو میرا اتنا خیال رکھتے ہو۔"

"اب تو اپنے بچے کا بھی خیال ہے۔ ماں بیٹے کے لیے نوکرانی منگوانا ہی تھی۔"

"شکریہ!"

جیرو آ گئی۔ سانولے رنگ، بھدے خدوخال اور مضبوط جسم والی جیرو جوان عورت تھی۔ جیکی بے حد خوبصورت تھی۔ جیرو نے اسے دیکھا تو ہنس کر عمیر سے بولی: "بھائی جان آپ کا انتخاب خوب ہے آپ کی میم بہت سوہنی ہے۔" عمیر ہنس پڑے۔

"کیا کہہ رہی ہے۔" جیکی نے عمیر سے پوچھا۔

"تمہاری تعریف کر رہی ہے۔" عمیر نے جواب دیا۔

"بھائی جان یہ گٹ پٹ مجھے تو نہیں آتی۔ بھابی کے ساتھ کام کیسے چلے گا؟" اس نے کہا۔

"بس اشاروں کی زبان سمجھنا۔" عمیر نے کہا۔ "کوشش کرنا آہستہ آہستہ تم بھی گٹ پٹ کرنا شروع کر دو گی۔"

جیرو ہنس پڑی۔ "لو جی ہم کو تو سیدھی اردو بھی نہیں آتی۔ انگریزی

کیسے آئے گی...؟"

عمیر مسکراتے ہوئے بولا "جیکی تمہیں سکھا لے گی۔"

دونوں اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ جیکی کو الجھن ہونے لگی۔ وہ بار بار عمیر سے پوچھتی "کیا کہہ رہی ہے یہ؟"

اور

عمیر کو ترجمان کے فرائض انجام دینا پڑے۔ عمیر کافی دیر تک جیرو سے اپنے دیس اور اپنے گھر والوں کی باتیں کرتے رہے۔ جیکی نے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

جیرو نے سارے کام سنبھال لیے۔ جیکی کی گٹ پٹ تو اسے سمجھ نہ آتی تھی۔ لیکن ہاتھوں، آنکھوں اور اشاروں کی زبان سمجھ لینا مشکل نہ تھا۔ اس کے آنے سے جیکی کو بہت سہولت ہو گئی تھی۔ وہ صبح سو کر اٹھتی تو گھر صاف ستھرا ہوتا۔ کچن کی ایک ایک چیز ٹھکانے پر ہوتی۔ ناشتہ تیار ہوتا۔ بچے کے رات کے نیپی دھلے ہوتے۔ عمیر کے کپڑے استری کیے ہوتے اور جیکی کا لباس بھی خوش ہوتا۔

جیکی خوش تھی۔

اور اس سے زیادہ عمیر خوش تھے۔ گھر کا کام کاج تو جیرو نے اپنے ذمے لے ہی لیا تھا۔ زیادہ خوشی اس وجہ سے تھی کہ اب اپنی زبان میں بولنے چالنے والا ایک ساتھی گھر میں آ گیا تھا۔ وہ جیرو سے گپ شپ لگا کر بہت خوش ہوتے تھے۔

اس دن عمیر دفتر سے واپس آئے تو ایک نیا لفافہ جیب سے نکال کر جیرو کو دکھایا۔

"کیا ہے بھائی جان؟"

"تمہارے بابا کا خط!"

"سٹ کر ہے۔"

جیرو میز پر برتن لگا رہی تھی۔ جیکی بچے کو لے کر صوفے پر بیٹھی تھی۔ عمیر نے دونوں کو دیکھا۔ جیرو کام چھوڑ کر عمیر کے قریب آ کر بولی: "جلدی سے پڑھ کر سنا دیں بھائی جان۔ کیا لکھا ہے بابا نے۔"

"بہت اچھا۔ سنو۔" عمیر نے لفافہ چاک کر کے خط پڑھنا شروع کیا جیرو کے چہرے کے تاثرات کبھی خوشگوار ہو رہے تھے۔ کبھی ان پر دھند سی چھا رہی تھی۔

خط پڑھ کر عمیر نے لفافہ اسے تھما دیا۔

"جواب لکھ دیں گے؟"

"ہاں"

"کب"؟

"شام کو۔"

"اچھا"

بہت ساری باتیں لکھواؤں گی۔"

"لکھوا لینا، لکھوا لینا۔ چلو کھانا لگاؤ۔"

عمیر بچے اور جیکی کی طرف متوجہ ہو گئے، جیرو کھانا لگانے لگی۔ جیکی کے چہرے پر ناگواری سے تاثرات تھے۔

"کیا باتیں ہو رہی تھیں۔" جیکی نے عمیر سے پوچھا: "خط کس کا تھا؟"

عمیر نے مختصراً جواب دیتے ہوئے بچے کو بازوؤں میں بھر لیا۔ اور پیار کرنے لگے۔

⁂ ⁂ ⁂

"جیرو!"

"جی بھائی جان!"

"آج پراٹھے تو بناؤ۔"

"ساتھ انڈوں کا حلوہ بھی اور آلوؤں کی بھجیا بھی۔"

"واہ وا۔ کیا کہنے۔ مزہ آ جائے گا۔" وہ مسکرا دیئے۔

جیرو بھی مسکراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" جیکی دونوں کو مسکراتے دیکھ کر ادھر آ گئی۔

عمیر کو اس کے اس معمول کے سوال پر جھلاہٹ بھی ہوئی۔ لیکن ضبط سے بولے۔ "میں نے اسے اپنی پسند کا ناشتہ بنانے کے لیے کہا ہے۔"

جیکی کی آنکھوں میں شبہ ابھرا۔ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ تو مسکرا رہی تھی۔"

عمیر کو جیسے دھچکا سا لگا۔ جیکی کی طرف حیرانگی سے دیکھا اور بولے۔ "مسکرانے پر کوئی پابندی ہے؟"

جیکی جواب دیئے بغیر دوسری طرف چلی گئی۔

"بھابی جان!"

"ہاں"

"میرا دل اداس ہو گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"ہائے بھابی جان مجھ سے تو یہاں نہ رہا جائے گا۔ خدا جانے آپ اتنے اجنبی لوگوں میں کیسے رہ رہے ہیں۔ کوئی بات بھی تو ہماری ان کی ایک سی نہیں۔"

عمیر جیرو کی بات پر ہنس دیئے۔ جیرو نے حیرانگی سے انہیں دیکھا

"سچ کہتی ہوں بھابی جان۔ مجھے تو بڑی الجھن ہوتی رہتی ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولے "تمہیں زبان جو نہیں آتی۔ کوشش کیا کرو تو سیکھ جاؤ گی۔ جیکی سے باتیں کرنے کی کوشش کیا کرو۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سادگی سے کہا "جیکی بھابی تو شاید مجھ سے نفرت کرتی ہے۔"

عمیر ایک دم چونکے "یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟"

"شاید میں کالی ہوں بھائی جان" سادگی سے وہ بولی "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں۔"

"پگلی" عمیر نے بے خیالی میں اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے

مسکرا کر کہا "وہ تیری زبان نہیں سمجھتی تو اس کی نہیں سمجھتی!"

جیرو نے نفی میں سر ہلایا "یہ بات نہیں۔"

"اور بھی کوئی بات نہیں جیرو۔ جیکی تمہارے آنے سے بہت آرام محسوس کر رہی ہے۔ بچے کی وجہ سے کام بہت بڑھ گیا ہے۔ تمہاری وجہ سے اسے بہت سہولت ہے۔"

دونوں باتیں کر رہے تھے۔ جیرو کا جی نہیں لگتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اڑ کر وطن واپس پہنچ جاتی۔ اس پر جیکی کے سرد رویے سے تو بہت بددل ہو رہی تھی۔

عمیر اسے تسلی اور دلاسے دینے لگے۔ جیکی کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کے لیے کہا "جیکی اب بڑی فراغت سے گھومتی پھرتی ہے سہیلیوں دوستوں سے ملنے ملانے چلی جاتی ہے۔ اگر تم نہ آتیں تو ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ تمہیں ناپسند نہیں کرتی جیرو۔ یہ محض تمہارا خیال ہے۔ تم یہاں ہی دل لگاؤ۔ واپس جا کر کیا کرو گی۔ اور پھر تمہیں آئے ہوئے صرف دو ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔ جانتی ہو نا کتنا کرایہ بنتا ہے یہاں آنے کا؟"

وہ دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔

اور

جیکی ادھر ادھر منڈلاتی پھرتی رہی۔ اسے دونوں کی باتیں تو سمجھ نہ آتی تھیں پھر بھی وہ ان کے آس پاس ہی رہی۔ اس کے ذہن میں الجھاؤ تھے اور یہ الجھاؤ چہرے سے واضح نظر آتے تھے۔

اسی شام جب جیکی اور عمیر باہر گھومنے جانے لگے تو عمیر نے جیرو کو بھی ساتھ تیار کر لیا۔ "تم بھی چلو جیرو۔ ذرا گھوم پھر آؤ گی تو ولیس کی یاد بھول جاؤ گی۔"

جیرو گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے گود میں بچہ اٹھا رکھا تھا۔

جیکی اندر سے آئی۔ جیرو کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا تو آتش زیر پا نظر آئی۔

"یہ کیوں بیٹھی ہے؟" وہ بھڑک کر بولی۔

"اس کا دل اداس ہو گیا ہے سوچا اسے بھی ساتھ لے جائیں۔ گھما پھرا لائیں تو کچھ بہل جائے گی۔" عمیر نے جیکی کے جذبات سے بے خبر سادگی سے کہا۔ پھر ہنس کر جیرو سے بولے۔ "آج تمہیں خوب سیر کرائیں گے۔ یہاں کی چیزیں دیکھو گی تو ولیسی کا نام نہیں لو گی۔"

جیرو منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔ اداسی سے بولی: "اچھا بھائی جان!"

جیکی کو اس کا ساتھ جانا گوارا نہ تھا۔ عمیر کا اس کے ساتھ ہنس کر بات کرنا تو برداشت نہ ہوتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔

گھر کی فضا میں تناؤ آ گیا تھا۔ جیکی برہم برہم رہتی تھی۔ عمیر سے بات بے بات الجھ پڑتی۔ جیرو کو تو ایک آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ ہر وقت ڈانٹتی رہتی۔ جیرو کو اس کی زبان تو نہ سمجھ آتی تھی۔ لیکن رویہ تو جانور بھی جان لیتے ہیں۔ وہ تو انسان تھی۔ لیکن اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ آخر جیکی اس کی بہ

کیوں ہے؟ اس کی خدمت میں اس نے کوئی کوتاہی نہ کی تھی، بچے کو بھی پوری طرح سنبھالتی تھی۔ اس سے کبھی کچھ مانگا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ کبھی پیار کی نظر سے نہ دیکھتی تھی۔ عمیر تھے جو اس کی دلجوئی کر کے جیکی کے رویے کی تلافی کر دیتے تھے لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ اسی بات پر جیکی عمیر کے بھی پیچھے پڑی رہتی تھی۔

اس دن جیکی نے جیرو کو بہت ڈانٹا تو وہ دل برداشتہ ہو گئی، اور جب عمیر گھر آئے تو وہ رو دی۔

"کیا ہوا جیرو؟" عمیر نے اس سے شفقت سے پوچھا

جیرو روتے گئی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے قالین پر بیٹھی روتے گئی۔ عمیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹایا۔

"دل اداس ہو گیا ہے کیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"پگلی۔ کہتی کیوں نہیں کہ سیر سپاٹے کو جی چاہ رہا ہے۔" عمیر نے اسے چھیڑا۔ "چلو بھئی آج تمہیں پھر سیر کروا لائیں گے۔ کیوں ٹھیک؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے روتے گئی۔ "میں واپس جاؤں گی بھائی جان!" وہ بولی۔

"کہاں؟"

"پاکستان"

"بہت آسان ہے نا جانا۔"

"جیسے بھی ہو مجھے واپس بھیج دیں!"

"آخر کیوں؟"

"بس میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے اپنے دیس کی روکھی سوکھی اچھی۔"

عمیر چپ ہو گئے۔

وہ روتے گئی۔

اور جیکی پیچ و تاب کھاتی رہی اور جب عمیر جیرو کو چپ کرانے کے لیے باتیں کرنے لگے تو وہ بپھری ہوئی عمیر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"یہ کیوں رو رہی ہے جیکی؟" عمیر نے اس سے پوچھا۔ "تم نے تو کچھ نہیں کہا اسے؟"

جیکی کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"جیکی یہ اپنا وطن اور اپنے لوگ چھوڑ کر صرف ہماری خدمت کرنے یہاں آئی ہے۔ اس کے ساتھ محبت سے پیش آیا کرو۔"

"محبت سے پیش آنے کے لیے تم جو ہو۔" وہ پھنکاری

"جیکی!" عمیر اس کی بات سے ششدر ہو گئے۔

"میں سب جانتی ہوں۔" وہ چیخی

"جیکی کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ ہوش میں ہو کہ نہیں؟"

"اسے فوراً گھر سے نکال دو۔ یہ اس گھر میں نہیں رہے گی۔"

"آخر کیوں؟"

"تم اس سے محبت کرنے لگے ہو۔ اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

"جیکی!" عمیر چیخے۔ وہ پیر پٹختی اندر چلی گئی۔ عمیر بت بنے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

اور پھر روز ہی لڑائی جھگڑا ہونے لگا۔

"میم صاحب کیوں لڑتی ہیں بھائی جان آپ سے؟" جیرو اکثر پوچھتی۔

"اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" وہ بددل ہو کر کہتے۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے بھائی جان۔ آپ خود بھی پریشان رہتے ہیں۔ آپ ان سے پوچھیں تو سہی کہ انہیں کیا تکلیف ہے؟"

"اسے جو تکلیف ہے میں رفع نہیں کر سکتا۔"

"بری بات ہے بھائی جان۔ وہ غصے میں آتی ہے تو آپ بھی غصے میں آ جاتے ہیں۔ اس طرح تو حالات خراب ہو جائیں گے۔ آپ ہی غصہ نہ دکھایا کریں۔"

"وہ باتیں ہی ایسی کرتی ہے جیرو۔"

"آخر کہتی کیا ہے؟"

جو کچھ وہ کہتی تھی عمیر جیرو کو کیسے بتا سکتے تھے۔ ہاں جیکی کے ذہن سے شکوک دور کرنے کے لیے انہوں نے اپنی طرف سے انتھک کوشش کی تھی۔ لیکن وہ تو کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔ عمیر کا جیرو سے بات کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ لیکن اس کے ذہن نے شک اور حسد سے بہت کچھ بنا لیا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ ایک دن نہیں رہ سکتی۔"

"نہیں رہ سکتی تو دفع ہو جاؤ۔"

"میں طلاق لے لوں گی۔"

"مجھے پرواہ نہیں۔"

"مجھے بچے کی بھی ضرورت نہیں"

"بیٹی، بچے کا بال بھی تمہیں نہیں دوں گا۔"

"میں جا رہی ہوں!"

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے"

روز کی تو تو میں میں ایک دن بہت بڑے جھگڑے پر منتج ہوئی۔ جیکی جس ماحول کی پروردہ تھی اس میں علیحدگی اور طلاق کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ذہنی اذیت تو بڑی بات تھی۔ وہاں تو ذرا ذرا سے اختلاف کو بھی برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ جیکی غصے میں گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ عمیر نے بھی پروا نہیں کی۔ روز کی بک بک چخ چخ سے وہ بھی تنگ آ گئے تھے۔ یہی سوچ چند دنوں بعد خود ہی واپس آ جائے گی۔

جیرو حیران و پریشان تھی سمجھ نہ پاتی تھی کہ جھگڑے کی بنیاد کیا ہے۔ جیکی کے جانے کے بعد وہ عمیر سے ملتجی ہوئی کہ وہ اسے جا کر لے آئیں۔ "وہ کیوں ناراض ہوئی ہے آپ سے بھائی جان؟ — خدا کے لیے مجھے بھی بتائیں۔ آپ نے یہاں گھر آباد کر ہی لیا ہے تو اسے یوں برباد نہ ہونے دیں۔ میم بھابی کو واپس لے آئیں۔"

عمیر جیکی کو کیونکر بتا دیتے کہ جھگڑے کی بنیاد وہ خود ہے۔ بنیاد۔ جو بے بنیاد ہے۔ جسے صرف جیکی کی تنگ نظری نے بنیاد بنایا ہے۔ ورنہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں تھا۔ عمیر تو جیرو کے متعلق اس انداز میں کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے جس انداز میں جیکی نے سوچا تھا۔ وہ تو ان کے خاندانی ملازم کی بیٹی تھی جو صرف ملازمہ تھی جس سے وہ باتیں کرتے تھے کہ اپنی ہم زبان تھی۔ عزیزوں کی زبان بولتے بولتے وہ تنگ آ جاتے تھے تو جیرو سے باتیں کر لیا کرتے تھے۔ اس بات سے انہیں خوشی بھی ملتی تھی اور سکون بھی۔ اپنائیت کا احساس بھی تسکین پاتا تھا۔ اجنبیوں کے دیس میں جیرو انہیں اپنے گھر کا ایک فرد لگتی تھی۔

کئی دن گزر گئے جیکی آئی نہ عمیر گئے۔ لیکن جب معاملہ انتہائی سنجیدہ اور سنگین ہو گیا تو وہ اسے لینے گئے۔

جیکی نہیں آئی۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" اس کا ایک ہی جواب تھا۔ "تم جیرو کے ساتھ خوش ہو۔ اسی کے ساتھ رہو۔"

"جیکی تمہیں ایسی بات کہتے ہوئے شرم آنا چاہیے۔ جیرو میری ملازمہ ہے اور بس۔ میں اس سے ہنستا بولتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ وہ میری ہم زبان ہے۔ تم اس تجربے سے نہیں گزریں کہ اجنبیوں میں کوئی اپنے دیس کا مل جائے تو کیا محسوس ہوتا ہے۔"

انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ جیکی بنیادی نقطہ سمجھ سکے۔ لیکن اس کے

سر پر تو رقابت، حسد و رشک کا بھوت سوار تھا، ان کی کیسے سنتی۔

عمیر کو بھی غصہ آگیا۔ اس کی بیہودگی کو برداشت نہ کر سکے۔ بے نقط سنا ڈالیں۔ اس عورت کی خاطر انہوں نے اپنا دیس، اپنے لوگ اور اپنے عزیز چھوڑے تھے۔ تنگ نظر جان کر شہنہ سے ناطہ نہیں جوڑا تھا۔

لیکن

یہ عورت!

آزاد معاشرے، آزاد فضا کی آزاد عورت کس قدر تنگ نظر تھی۔

انہیں بے حد تلخ تجربہ ہوا تھا۔

جھگڑا نپٹ نہ سکا۔

جیکی نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

اور حالات جو صورت اختیار کر چکے تھے وہ مطالبہ نہ بھی کرتی تو بھی عمیر اب اس کے ساتھ نہ رہنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ ان لوگوں سے، اس معاشرے سے، ان قدروں سے متنفر ہو چکے تھے۔

تلخ تجربوں نے عمیر کو بدل کر دیا تھا۔ وہ جیرو اور اپنے معصوم بچے کے ساتھ وطن واپس آگئے۔ اس دیس میں جسے برسوں پہلے نفرت و حقارت سے چھوڑ گئے تھے جس میں بسنے والوں کی محبت کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں۔ جس کی وفا کے نام پر مرمٹنے والی عورتوں کو تنگ نظر، شکی اور جانے کیا کہہ کر مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اب

ندامتوں کا بوجھ اٹھائے واپس آئے تو ان کا خیال تھا۔ اپنے لوگ بیگانے بن چکے ہوں گے۔ کوئی انہیں منہ نہ لگائے گا۔ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ یہ سزا انہیں ملنا چاہیئے تھی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اپنے اپنے ہی تھے۔ عمیر کو تو شکست خوردہ اور دکھا ہوا جان کر اتنی محبت اور شفقت کا مظاہرہ کیا گیا۔ یہ بار قیامت کا بار تو اس وقت محسوس ہوا جب بھابی نے انہیں شہنہ کے متعلق بتایا۔ اس نے شادی نہیں کی اس کا نام شروع سے تمہارے ساتھ لیا گیا تھا وہ کسی اور کے نام کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکی۔ اس نے ایم۔ اے کر لیا تھا۔ اور اب کالج میں لیکچر رہے۔

عمیر کئی دن شہنہ کا سامنا نہ کر سکے۔ ان میں جرأت و ہمت ہی نہ تھی کہ اس عظیم اور وفا شعار لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکیں۔ اپنا آپ اتنا بے وقعت اور چھوٹا نظر آتا تھا کہ حقیر اور چھوٹے سے ذرے سے بھی کمتر تھے، جی چاہتا تھا اس ذرے کو شہنہ اپنے قدموں تلے روند ڈالے۔

اور

اس روز اچانک ہی ان کا سامنا شہنہ سے ہو گیا۔ وہ اپنے بچے کے کمرے میں اسے دیکھنے گئے تو شہنہ وہاں تھی۔ بچہ اس کی گود میں تھا۔ اور وہ اسے گدگدی کر کے ہنسا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نورانی چمک تھی۔ بچہ قلقل کر کے ہنس رہا تھا۔

عمیر چند لمحے بت بنے ان کو دیکھتے رہے۔

"شہنہ!" — بمشکل ان کے منہ سے نکلا۔

شہنہ کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ چند فٹ کے فاصلے پر عمیر کھڑے تھے، ویران آنکھیں، اداس چہرہ، بالکل لٹے پٹے سے تھے۔

شہنہ نے نظریں جھکا لیں۔

بچہ گدگدی کا منتظر تھا۔ ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے غوں غوں کرنے لگا۔ شہنہ کھو گئی تھی۔ اس نے بچے کو گدگدی نہیں کی۔

اور

جب عمیر دو قدم آگے بڑھے تو اس نے آہستگی سے بچے کو پلنگ پر لٹا دیا۔ اور اٹھتے ہوئے بولی:

"معاف کیجئے گا۔ آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے بچے کو..."

آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے نکل جانے کو مڑی۔

"شہنہ!" عمیر اپنے قدموں پر مڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ بچہ گود کے لمس سے آشنا تھا پلنگ پر پڑتے ہی رونے کا موڈ بنا لیا۔ شہنہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ عمیر اس کے سامنے آ گئے تو اسے رکنا پڑا۔ اک نظر ان پر ڈالی اور آہستگی سے بولی "مجھے جانے دو۔"

"شہنہ میرا جرم تو ناقابلِ معافی ہے پھر بھی.... میں...." عمیر کی آواز ٹوٹ گئی۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔

"پرانی باتیں ہیں۔ عمیر — انہیں چھیڑنے کی ضرورت ہے نہ فائدہ۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ بچہ اب غوں غاں کرتے کرتے رونے لگا۔

"میں معافی مانگ کر گزرے لمحوں کی تلافی تو نہیں کر سکتا شہنہ۔ پر اپنے ضمیر کا کچھ بوجھ تو ہلکا کر سکتا ہوں۔"

شہنہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی۔ وہ عمیر سے زیادہ بچے کی طرف متوجہ تھی جو اب روئے جا رہا تھا۔ "میں نے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا رمنہ کے بل گرا بھی ہوں۔ میں تم سے بیحد شرمندہ ہوں شہنہ۔ مجھے..... معاف کر دو۔" عمیر بھرائی ہوئی آواز میں جانے احساس ندامت سے چور چور کچھ کہے جا رہے تھے۔ شہنہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ انہیں کیا کہے وہ عمیر کو کسی طور معاف نہ کر سکتی تھی۔

بچہ اب پوری آواز سے رو رہا تھا۔ شاید حلق سوکھ گیا تھا۔ رونے کے ساتھ اسے غوطہ بھی لگا۔ شہنہ جلدی سے مڑی اور بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اس کے پھول ایسے گالوں پر ہونٹ رکھ دیئے اس کی آنکھوں کی نمی گالوں پر ڈھلک آئی۔ بچہ چپ ہو گیا۔ لیکن بے آواز سسکتا رہا۔

شہنہ کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بچے کو سینے سے لگائے اس کے گال پر ہونٹ رکھے آنکھیں بند کئے وہ بت کی طرح ساکت تھی۔

عمیر کی آنکھوں پر پردے پڑے تو اٹھ چکے تھے۔ لیکن شہنہ کا یہ نیا اور انوکھا روپ انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اتنے متاثر ہوئے کہ آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے۔ نچلے ہونٹ کا دایاں سرا دانتوں تلے دباتے ہوئے

اس کے سینے میں مچلنے والے جذبات کو قابو میں رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

لیکن — کبھی کبھی — پانی کے منہ زور ریلے — بڑے بڑے مضبوط بہا کر لے جاتے ہیں۔ عمیر اپنے طوفانی اور شوریدہ سر جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ بے اختیارانہ بڑھے اور اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں میں شہنہ کو سمیت بھر لیا۔ شہنہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

کچھ رنجشیں ایسی بھی ہوتی ہیں
جو دلائل سے دور نہیں ہوتیں۔
معافیوں سے نہیں مٹتیں۔
صرف
اور صرف
آنسوؤں سے دھل جاتی ہیں

عمیر اور شہنہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
اور رنجشیں دھل رہی تھیں —— دھل گئی تھیں۔

قیدِ تنہائی

اپنے فلیٹ کے چھوٹے سے پورٹیکو میں موٹر سائیکل کھڑی کرتے ہی ہیل نے زور سے پکارا۔

"ریما"

"جی" ریما کچن کے بیرونی دروازے سے تھوڑا سا سر نکالتے ہوئے بولی۔ "آگئے آپ؟"

"جی ہاں آگیا۔"

"آج باہر ہی سے زوردار آواز لگا دی۔"

"خوشخبری لایا ہوں تمہارے لیے!"

"خوشخبری!" دروازہ جھٹکے سے کھول کر ریما دوڑ کر اس کے پاس آئی۔

وہ اپنی من موہنی سی پیاری سی بیوی کو پیار سے دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔

"ہاں خوشخبری!"

"بتاؤ نا۔"

"خط آیا ہے۔"

"کہاں سے؟"

"یو۔ ایس۔ اے سے۔"

"یو۔ ایس۔ اے سے؟" ریما نے حیران سی سوچ آنکھوں میں سمیٹتے ہو کہا۔ سہیل نے جیب سے نیلا لفافہ نکال کر ریما کو دیتے ہوئے کہا۔

"بوجھو تو بھلا کس کا خط ہو سکتا ہے؟"

"خدا جانے۔" ریما نے پتہ دیکھا۔ تحریر سے کچھ جاننا چاہا لیکن پتہ نہ چل سکا۔ اس کی ایک عزیز ترین سہیلی صبیحہ تھی جس کا کبھی کبھی خط آ جاتا تھا۔ وہ تو یو۔ کے میں تھی۔ یہ خط یو۔ ایس اے سے آیا تھا۔

"پتہ ہے کس کا خط ہے؟" ریما کے خط کھولنے سے پہلے ہی سہیل نے اس کے کان میں سرگوشی کرنے کے بہانے اس کی آوارہ لٹوں کو ہونٹوں سے چھو لیا۔

"اللہ۔" وہ ایک دم بدک کر پرے ہٹ گئی۔ "کمال کرتے ہیں سہیل۔ آپ پورچ میں کھڑے ہیں۔"

"بے وقوفی تمہاری ہے۔" سہیل نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اندر چل کر خط پڑھو۔ اور خوشخبری کا انعام ہمیں وصول کرنے کی اجازت دو۔"

"ہٹئے۔" وہ اسے سرزنش کرتی نظروں سے دیکھتے لیکن متبسم لبوں سے مسرت کا اظہار کرتے دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

سہیل بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔

"ککو۔ زیبی کہاں ہے؟ سہیل نے اپنے دونوں بچوں کا پوچھا

"اپنی دادی اماں کے کمرے میں ہیں۔" ریما خط کھولتے ہوئے بولی۔ خط کھلا ہی تھا۔ چونکہ سہیل کے نام تھا اس لیے وہ دفتر ہی میں پڑھ چکا تھا۔

ریما نے القاب پڑھتے ہی لکھنے والے کا نام پلٹ کر دیکھا۔ "تمہارا بھائی سلیم" لکھا تھا۔

"سلیم بھائی جان کا خط ہے سہیل۔" ریما فرط مسرت سے چہک اٹھی۔

"جی صاحب۔" سہیل نے جواب دیا۔ "مابدولت پڑھ چکے ہیں خط۔ خوشخبری یہی ہے کہ سلیم بھائی جان پاکستان آ رہے ہیں۔"

"اللہ سچ۔" ریما کی بے تابی دید کے قابل تھی۔ وفور مسرت سے اس کی آواز بھرا سی گئی۔ آنکھوں میں نمی آ گئی۔ خط پڑھنا محال ہو گیا۔ جلدی سے بولی۔ "کب؟"

"بھئی پڑھ لو خود۔" سہیل نے کہا۔

ریما خط پڑھتے پڑھتے اپنے کمرے میں آگئی۔ سہیل ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں اس کے دونوں بچے کھیل رہے تھے۔

"ابو آگئے۔" "ابو آگئے۔" دونوں بچے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ سہیل انہیں پیار کرتے ہوئے ماں کے پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے اماں؟" اس نے بڑی عقیدت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"دوائی کھالی تھی؟"

"ہاں بیٹے۔"

دوائی وقت پر لے لیا کریں۔ انشاءاللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"ریما وقت پر دیتی ہے بیٹے۔ خدا زندگی دے اسے بہت خیال رکھتی ہے میرا۔"

"مالش سے بھی افاقہ ہوگا۔"

"کچھ کچھ محسوس ہوتا ہے۔"

ماں کو چند ماہ پہلے فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ دائیں طرف متاثر ہوا تھی۔ بازو اور ٹانگ ہلا تو لیتی تھیں لیکن پوری طرح کام نہ لے سکتی تھیں۔ زیادہ وقت پلنگ پر ہی گزرتا تھا۔ چلنے پھرنے کے قابل اس طرح نہ تھیں کہ بنا سہارے چلا نہ جاتا تھا۔ باتھ روم تک بھی سہارا لے کر جا سکتی تھیں۔

ریما کے ساتھ بحیثیت ساس شروع شروع میں ان کے تعلقات کچھ روائتی سے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ اس پر ناراض ہو کر زیادتی بھی کر جایا کرتی تھیں۔ جسے ریما رو دھو کر برداشت کر لیتی تھیں۔ ساس حالانکہ صرف ساس ہی نہ تھیں پھوپھی بھی تھیں۔

لیکن ساس بہو کے تعلقات کچھ زیادہ دیر تک برداشت کی حدوں سے دور نہ رہ سکے۔ ریما شاید فطرتاً خدمت گزار تھی۔ یا سہیل نے ہی اسے اپنے محبت بھرے اعتماد میں اسیر کر لیا تھا۔ وہ اکثر زیادتیاں درگزر کر دیتی۔ نتیجہ ساس کا رویہ بھی تبدیل اور گھر کا ماحول قدرے پرسکون اور خوشگوار رہنے لگا۔ اب ساس فالج کی مریضہ تھی۔

اور

بہو بے دام غلام۔

ریما ان کا ہر کام خود کرتی تھی۔ صاف ستھرا بستر رکھنے کا اسے ہر دم خیال رہتا تھا۔ کپڑے روزانہ تبدیل کرتی کہ مالش کے تیل سے اکثر کپڑے دھبے دار ہو جاتے تھے۔ تیسرے چوتھے روز غسل بھی خود ہی کرواتی۔ بالوں میں تیل ڈال دیتی۔ کنگھی کرنا بھی روز کا معمول تھا۔ ہلکی سی پرفیوم بھی روزانہ ہی لگا دیتی۔ اگالدان پلنگ کے نیچے ہی رکھا رہتا۔ کمرہ بھی صاف ستھرا ہوتا۔ چھوٹا صوفہ اور دو ایک بید کی کرسیاں اس کمرے میں رکھی رہتیں۔ درمیان میں چھوٹا سا قالین بھی ہوتا۔

ساس کے ساتھ وہ اس کا کمرہ بھی نک سک سے درست رکھتی

تھی ۔ ایک تو یہ بات کہ وہ فطرتاً اچھی تھی۔ ہمدرد اور غمگسار۔ دوسرے لوگوں کا بھی بہت خیال ہوتا تھا۔ بھرے پُرے کنبے قبیلے والی تھی۔ کوئی آتا کوئی جاتا۔ ریما نہیں چاہتی تھی کہ کوئی یہ بات کہہ دے "ہائے ہائے ساس کو ٹھیک طرح سے نہ رکھ سکی"۔

اب تو

یہ خدمت گذاری اس کے معمولات میں شامل ہو گئی تھی اس لیے بار نہ لگتی تھی۔ وہ ساس کے کام بالکل اسی طرح کرتی جس طرح سہیل، ککو اور زیبی کے کرتی تھی۔ سہیل زیبی اور ککو کے کام اسے کبھی گراں گزرے تھے؟ ساس بھی تو سہیل کی ماں تھی۔ اس ناطے سے اس کی بھی ماں تھی اور ماں کی خدمت کا جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ بھی اس کے علم میں تھا۔ معذوروں اور محتاجوں کی دلجوئی بھی اللہ تعالیٰ کی پسند اور مرضی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اسی لیے اسے ساس کے کام کبھی بار نہ لگے تھے۔

اور

اس خدمت گزاری کا صلہ بھی تو اسے مل رہا تھا۔ سہیل کتنا خوش کتنا مطمئن رہتا تھا۔ کس طرح ٹوٹ کر اسے چاہتا تھا۔ شادی کو سات سال ہو چکے تھے یوں لگتا تھا جیسے کل کی بات ہے۔ جذبے توانا اور تنومند ہوں تو پرانے نہیں ہوتے۔

کبھی کبھی سہیل خود ہی کہتا "ریما تم پر اماں کی وجہ سے کام کا بار کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ کسی نوکرانی کا بندوبست کر لو"۔

"نوکر ہے تو" وہ مسکرا کر کہتی۔

"دس بارہ سالہ لڑکا۔ بمشکل کچن کا چھوٹا موٹا ہی تو کام کرتا ہے"۔

"کیا ہوا تمہیں سارا دن کولہو کا بیل بننا پڑتا ہے"۔

"چھوڑو سہیل۔ یہ کام بھی نہ ہوں تو سارا دن بیکار بور نہ ہوتی رہوں"۔

"ہمت ہے تمہاری!"

وہ ہنس پڑتی اور شوخی سے کہتی "پیسے بہت بچنے لگے ہیں تنخواہ میں سے تو نوکرانی کی تنخواہ مجھے دے دیا کرو"۔

"سب کچھ تمہارا ہی ہے جانِ جاں" وہ اس شوخی پر دل تھام کر کہتا "یہاں تو اپنا آپ بھی اپنا نہیں رہا"۔

"اوہو۔ کیا ہوا اپنا آپ؟"

"لٹ گیا"۔

"کہاں؟"

"یہاں" وہ لپک کر ریما کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیتا۔ اور ریما بچوں یا نوکر کے آ جانے کے خوف سے چیخ اٹھتی۔ اپنا آپ اس کے مضبوط بازوؤں سے نکال لیتی۔ اسے گھور کر دیکھتی۔

تو

وہ دل پہ ہاتھ رکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ جواباً وہ بھی ہنس پڑتی۔

زندگی بڑے ہی پرسکون انداز میں گزر رہی تھی۔ سہیل ایک مقامی فرم میں انجنیئر تھا۔ تنخواہ معقول تھی۔ فلیٹ کمپنی کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ دو بچے بیوی اور ماں پر مشتمل کنبہ اس آمدنی سے بطریقِ احسن چل رہا تھا۔ مہنگائی کی وجہ سے گزر بسر کو شاہانہ تو نہ کہا جا سکتا تھا۔ پھر بھی اچھی ہو رہی تھی۔ اخراجات حدود کے اندر ہی تھے۔ وہ ایک ایماندار اور فرض شناس آدمی تھا۔ اس لیے آمدنی میں ناجائز پیسے کا سوال ہی نہ تھا۔ رعیا بھی یہ نکتہ جان گئی تھی۔ جوان عورت ہونے کے ناطے جی تو اس کا بھی بہت کچھ کرنے کو چاہتا تھا۔ کئی آسائشیں تھیں جو آزمائشیں بنتی تھیں لیکن اس نے کبھی ان کو اپنے اعصاب پر مسلط نہ کیا تھا۔ اسی لیے زندگی بڑے سہج سے سہل انداز سے گزر رہی تھی۔

وہ صبح سویرے اٹھتی۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتی۔ پھر چھوٹے موٹے کام کرتے وقت گزر جاتا۔ شام سہیل کے کام سے آنے سے پہلے وہ نہا دھو کر کپڑے بدلتی۔ بال سنوارتی۔ میک اپ کرتی۔ حسین مسکراہٹوں سے وہ اس کا استقبال کرتی۔

سہیل کے چہرے پر اطمینان کی روشنی پھیل جاتی۔ وہ اس سے اس طرح ملتا جیسے برسوں کی جدائی حائل رہی ہو۔ بچے بھی سہیل کی جان تھے وہ انہیں بھی ٹوٹ کر پیار کرتا۔ کپڑے بدلنے سے پہلے دونوں کو پیار کرتا۔ سارے دن کی کارگزاری پوچھتا۔ اماں کی احوال پرسی کرتا اور بچوں کے لیے لائی ہوئی ٹافیاں، چیونگم اور چاکلیٹ انہیں دینا نہ بھولتا۔

اماں کے پلنگ کی پائینتی بیٹھا ان کی احوال پرسی کرتے ہوئے وہ جیب سے ٹافیاں نکال کر ہوا میں اچھالنے لگا۔

زیبی لپک کر آئی۔ "ابو مجھے۔"

ککو اچھلا۔ "مجھے ابو۔"

دونوں بچے ٹافیاں حاصل کرنے کے لیے ابو پر چڑھنے لگے۔

"بیٹے۔" اماں لیٹے لیٹے بولیں

"جی اماں۔"

"روزان کے لیے موٹی ٹافیاں نہ لایا کرو۔ میٹھے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں۔"

"نہیں ہوتے دادی اماں۔" ککو نے اپنے چھوٹے چھوٹے دانت دادی اماں کو دکھائے۔

سہیل ہنس پڑا۔

"چلو کل سے بسکٹ لایا کریں گے۔" سہیل نے کہا

"چاکلیٹ بسکٹ ابو۔" زیبی نے کہا۔

"مجھے بسکٹ ابو۔" ککو نے فرمائش کر دی۔

سہیل نے دونوں بچوں کو بازوؤں میں بھر کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "جو حکم سرکار، تمہارے ہی غلام ہیں۔ جو فرمائش کریں گے تابعدار ہیں۔ پوری کریں گے۔"

بچے ٹافیاں لے کر بھاگ گئے۔

اور

تقریباً انہی کے سے والہانہ انداز میں ریما بھاگی بھاگی اندر آئی۔ فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ بات منہ سے نہ نکل رہی تھی۔

"اماں سلیم بھائی آرہے ہیں امریکہ سے"۔ وہ خط ساس کو دکھاتے ہوئے بولی۔

"سچ" ساس قدرے اٹھتے ہوئے بولی۔

"انہوں نے آپ کو یہ خبر نہیں سنائی؟" ریما نے سہیل کی طرف حیرت سے دیکھا۔

سہیل ہنس کر بولا "بھلی لوگ یہ بات میں اماں کو بتا دیتا تو تیرے حصے میں یہ خوشخبری سنانے کی خوشی کیسے آتی"۔

"کب آرہا ہے سلیم؟" اماں کی آواز بھی اس غیر متوقع خبر سے کچھ بے قابو مسرتوں سے بھرّا گئی۔

اس پچیس کو۔ اماں" پھر جلدی سے انگلیوں پر دن گنتے ہوئے بولی۔

ہفتہ ہفتہ آٹھ۔ ہفتہ پندرہ ۔ آج دس تاریخ ہے۔ ہفتے کو پورے پندرہ دن بعد"

"شکر ہے اس کا جی بھی اپنوں کے لیے تڑپا۔ کیا لکھا ہے مجھے بھی پڑھ کر سناؤ"۔

ریما ان کے قریب بیٹھتے ہوئے خط پڑھنے لگی۔ مختصر سا خط تھا۔ جس میں

انہوں نے آنے کے متعلق لکھا تھا:

"بیوی بچے بھی ساتھ ہوں گے؟" اماں نے پوچھا

"پتہ نہیں" ریما بولی

"لکھا تو کچھ نہیں" سہیل نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اکیلے ہی آرہے ہوں"۔

"ہائے بیوی نہ سہی بچوں کو تو لے آتا۔ اپنا دیس اپنے لوگ اور اپنے خون کے رشتوں سے ہی ملوا لیتا انہیں"۔

"اللہ کرے بیوی بچے بھی ساتھ ہوں۔ ہم کم از کم شکل تو دیکھ لیں ان کی"۔ ریما نے آنکھیں بند کر کے دعا کی۔

سہیل اس پرچھائی جذبوں کی سرشاری اور سچائی کو بڑے پیار سے دیکھتا رہا۔

چند لمحے ساس بہو باتیں کرتی رہیں۔

"ریما صاحبہ" سہیل نے بالآخر کہا

"جی!"

"بھائی صاحب کی آمد کی خوشی میں مجھ غریب کو ابھی سے بھلا بیٹھیں"۔

"کیوں جی؟"

"ہاں جی"

وہ اٹھتے ہوئے بولی "آج میں بہت خوش ہوں۔ اتنی خوشی اتنی خوشی کہ بتا نہیں سکتی"۔

"اس خوشی میں ہمیں بھوکا مارو گی"

ء اللہ میں تو چائے وائے بھول ہی گئی۔ آپ کپڑے بدلتے ہیں میں بنا کر لاتی ہوں۔ اماں کے ساتھ ہی پئیں گے۔"

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کی خوشیوں سے سہیل بھی خوش ہو رہا تھا۔ سلیم ربیا کا سب سے بڑا بھائی تھا۔ پندرہ سال پہلے وہ بہتر مستقبل کی تلاش میں ملک سے باہر گیا اور پھر اسی تلاش میں سرگرداں ملک ملک پھرتا امریکہ جا پہنچا۔ یہ ملک اسے کچھ اتنا بھایا، ایسا راس آیا کہ وہ وہیں کا ہو گیا۔ نوکری کے ساتھ پڑھائی بھی کی، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنا اور ایک اچھی فرم میں ملازم ہو گیا۔ دیارِ غیر اتنا بھایا کہ وہیں ایک امریکن لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ بارہ برس پہلے اس نے پاکستان کا چکر لگایا تھا۔ تب سے اب تک اپنے اس کی شکل دیکھنے کو ترس گئے تھے۔ ماں فوت ہو گئی تھیں۔ باپ داغِ مفارقت دے گیا۔ ان المناک واقعات پر اس نے صرف لمبے چوڑے خط لکھے تھے آ نہ سکا تھا کہ دونوں دفعہ اس کی بیوی اس کے بچے کو جنم دینے والی تھی اور وہ اسے تنہا نہ چھوڑ سکتا تھا۔ ماں باپ ایک براہِ راست وسیلہ تھے۔ وہی نہ رہے تو رابطہ کٹتا ہی گیا۔ کبھی کبھی کسی بھائی کا جی چاہتا تو خط لکھ دیتا کبھی ربیا کو یاد آتی تو وہ خط لکھ دیتی۔ لیکن ہر کوئی یہاں بھی اپنے ہی بندھنوں میں بندھا تھا۔ اپنی ہی بوجھوں تلے دبا تھا۔ فرصت کی گھڑیاں مہنگی تھیں۔ خطوں کا رابطہ بھی تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ربیا کی شادی پر صرف مبارکباد کا تار اس نے بھیجا تھا۔ پھر گزرنے والے سات سالوں میں اس کے صرف دو

آئے تھے۔ ان خطوط میں بھی کنجوسی ہی سے کام لیا ہوتا تھا۔ یا تو وہاں کی زندگی ہی اتنی بھرپور تھی کہ چند سطور لکھنے کو بھی وقت نہ ملتا تھا یا اس کی امریکن بیوی ہی اس کا رابطہ پچھلے عزیزوں سے رکھنے پر خوش نہ ہوتی تھی۔ کچھ نہ کچھ تو وجہ تھی ہی۔ بہرحال یہ بھی غنیمت تھا۔ ربیا صرف چودہ سال کی تھی جب وہ گیا تھا۔ لیکن دوری اور کٹ جانے کے باوجود خون کے رشتے بڑے گرما گرم اور جوشیلے ہوتے ہیں۔ سلیم کی آمد کی خبر پا کر اس کا پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہا تھا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے سلیم بھائی کا جانا کل ہی کی تو بات ہے۔

اسے یاد آ رہا تھا جب وہ گئے تھے تو امی انہیں یاد کر کر کے کتنا رویا کرتی تھیں۔ ربیا ہی سے خط لکھواتی تھیں اور خط لکھتے لکھتے ربیا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ جایا کرتے تھے۔ بارہ سال پہلے جب وہ چند ہفتوں کے لیے آیا تھا تو اماں کس قدر خوش تھیں۔ وہ خود بھی شاد تھی۔ تین سالوں کی جدائی کے بعد سلیم کا ملنا ناقابلِ بیان مسرت تھی۔

وہ واپس آ کر لوٹ گیا تھا۔ اماں کی دنیا جیسے پھر دھندلا گئی تھی، شاید اسی کا غم انہیں کھا گیا تھا۔ مرتے وقت بھی ان کی آنکھوں میں انتظار کی لو تھی۔ کتنے کرب سے انہوں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں آخری وقت کہا تھا: "کاش میں تمہیں دیکھ پاتی سلیم۔"

ابو کے مرتے وقت بھی کچھ ایسے ہی جذبات تھے۔ دم جیسے اس کی آمد کے انتظار میں نہیں نکل رہا تھا۔ کئی گھنٹے وہ جان کنی کے عذاب

میں مبتلا رہے تھے۔ ریما کو یاد تھا اس نے ابو کے آخری لمحات کی پوری روئیداد سلیم بھائی کو اس آس پر لکھی تھی کہ وہ دوڑے آئیں گے۔

لیکن

ان کا دو صفحات پر مشتمل خط آگیا تھا۔ وہ نہیں آئے تھے۔

ریما کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے جنہیں اس نے اپنی انگلی کی پور سے صاف کر لیا۔ پرانی یادوں کے دلخراش نقشے اس نے تصور کے پردے سے ہٹا دیئے۔ سلیم بھائی آ رہے تھے۔ اس کے ماں جائے۔ اس کے اپنے بھائی۔ یہی خوشی کی بات تھی۔ چائے بنا کر وہ اماں کے پاس لے گئی۔ سہیل بھی کپڑے بدل کر آ گئے۔

اور سب

چائے کے گھونٹوں کے ساتھ ساتھ ماضی حال اور مستقبل کی باتیں کرنے لگے۔

سلیم تو پورے پورے امریکی بن گئے تھے۔ رنگت بھی سرخ سرخ ہو گئی تھی۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ پچاس کے لگ بھگ تو لگتے ہی نہ تھے۔ بال گرے ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کے صحت مند چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے۔ بہت خوش باش تھے۔ انگریزی پانی کی سی روانی سے بولنے کی عادت تھی۔ اردو قدرے دشواری سے بولتے تھے۔

وہ سب سے بڑے تپاک سے ملے ان کی شخصیت، امارت اور ساز و سامان سے سبھی مرعوب ہوتے۔ ریما کو تو اک انوکھا سا فخر سا محسوس ہوا۔ وہ ان کی برسوں کی بے رُخی، بے مروتی اور ماں باپ کی میت پر ڈھاڑس نہ دینے کی زیادتی کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔ اتنے امیر بھائی کے آجانے سے اس کا قد کاٹھ جیسے آپ ہی آپ بڑا ہو گیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ سلیم نے سیمسونائٹ کے ڈسوٹ کیس منگوایا۔ وہ سب کے لیے تحفے لائے تھے۔

سوٹ کیس قالین پر رکھ کر کھولا۔ بچے سہیل اور ریما دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

"یہ لو بھئی سہیل" انہوں نے ایک ڈبیہ سہیل کی طرف بڑھائی "لو سی یہ گھڑی تمہارے لیے پسند کی تھی۔"

"دکھائیے" ریما نے ڈبیہ سہیل کے ہاتھ سے پہلے ہی جھپٹ لی۔ کھول کر دیکھی "اف کتنی خوبصورت ہے" "لیجئے!"

"شکریہ!" سہیل مسکرایا۔

"یہ تمہارے لیے ہے ریما" چھوٹی سی نیلی ڈبیہ انہوں نے ریما کو دی۔

"کیا ہے؟"

"کھول کر دیکھو۔"

ریما نے بے تابی سے ڈبیہ کھولی۔ ڈائمنڈ کے ننھے ننھے ٹاپس تھے۔ ریما کی آنکھیں ایک لمحہ کو حیرت سے جھپکنا بھول گئیں۔

"بھئی تمہاری شادی پر کوئی تحفہ نہیں دیا تھا نا۔" سلیم نے مسکرا کر کہا۔

ریما کے چہرے پر جیسے کئی چاندوں کی چاندنی پھیل گئی۔ لیکن منہ بناتے ہوئے بولی:

"بھائی جان شادی میں آپ شریک ہوتے تو شاید یہ شرکت میرے لیے سب سے بڑا تحفہ ہوتی۔"

"کیا فرق پڑا؟" وہ ہنسے۔ "شادی بھی ہو گئی اور اب میں تحفہ بھی لے آیا۔"

"خوشیوں کا بھی ایک وقت اور مقام ہوتا ہے بھائی جان۔" وہ ٹھہر کر پس دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"پرانی باتیں ہیں ریما۔ تم لوگ ابھی تک یہ جان ہی نہیں پائے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ چلو چھوڑو یہ باتیں لو بچو۔ آپ کی چیزیں۔ یہ میرے بچوں لارا اور میگی نے دی ہیں۔ یہ لوسی نے۔ اور میری طرف سے۔" وہ چھوٹے چھوٹے پیکٹ نکال نکال کر بچوں کو تھمانے لگے۔ خوبصورت کھلونے ریڈی میڈ کپڑے۔ جرسیاں اور جینز۔ اسی قسم کی چیزیں تھیں۔

بچے خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ کھلونے ہی ان کی توجہ کا مرکز بنے۔ وہ چابی دے کر کھلونے حرکت میں لانے لگے۔ سہیل اٹھ کر چلا گیا۔ چیزیں سمیٹنے لگی۔

"ہائے اللہ" ایک دم ریما بولی۔ "اماں کے لیے دیا ہوا تحفہ اس کے

پاس تھا۔

"کیا ہے؟" سلیم بولے۔

"اماں کمرے میں اکیلی ہیں۔ اچھا تھا یہ سب چیزیں ان کے کمرے میں ہی کھولتے۔ مجھے بھی بالکل خیال ہی نہ رہا۔"

"نو بج رہے ہیں انہیں کیوں ڈسٹرب کرنا ہے۔" سلیم بولے

"وہ دس گیارہ بجے تک جاگ رہی ہوتی ہیں۔

"انہیں ریسٹ کرنے دیا کرو۔ تم لوگوں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"سب ان کے پاس بیٹھے رہیں۔ ان سے باتیں کریں۔ ان کا دل بہلائیں تنہائی کا احساس نہ ہونے دیں۔ ان کے لیے یہی بہت کچھ ہوتا ہے۔ اماں جان۔"

"تم تو پگلی کی پگلی ہو ابھی تک۔"

"نہیں بھائی جان آیئے ان کے کمرے میں چلتے ہیں۔ آج ہم نے کھانا وہاں نہیں کھایا۔" سلیم نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

سہیل پہلے ہی اماں کے پاس جا بیٹھا تھا۔ وہ سلیم اور بچوں کو بھی ان کے کمرے میں لے آئی۔ گھنٹہ بھر اس کمرے میں بچے شور مچاتے رہے اور بڑے باتیں کرتے رہے۔ سلیم اپنے گھر بار بیوی بچوں کے متعلق بتاتا رہا۔

"بیوی بچوں کو بھی لے آتے بھائی جان۔" ریما نے کہا۔

"ہاں بیٹے کم از کم بچوں کو تو ملا لیتے۔ خون کے رشتوں کی پہچان تو

ہوتی انہیں" پھوپھی نے کہا۔

سلیم ان کی باتوں پر ہنس دیا" وہاں ایک کو دوسرے کی پہچان نہیں رہتی - پھوپھی اماں۔ ان دور کے رشتوں کے متعلق کون سوچتا ہے۔

"یہ کوئی اچھی بات ہے؟" جھٹ سے ریما بولی۔

اتنی بری بھی نہیں" سلیم بولا" کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ لوگ اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں غیر محسوس ہو گئی ہیں"

سہیل آہستگی سے بولا" ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو پیچھے ڈال کر ہی وہ بڑی بڑی جذباتی خوشیوں سے محروم ہو جاتے ہیں"

سلیم نے سہیل کی طرف طنزیہ انداز میں ہنس کر دیکھا اور بولے" لوگوں نے اپنے لیے اتنی خوشیاں تلاش کر لی ہیں کہ ان باتوں کے سوچنا بھی پسند نہیں کرتے"

"وہاں ہر کوئی اپنے لیے جیتا ہے" سہیل بولا۔

"جینا بھی یونہی چاہیے - ہر کوئی اپنی اپنی ذمہ داری اٹھا لے تو کسی کے لیے بوجھ نہیں بنتا"

اماں جو سہیل اور سلیم کی باتیں سن رہی تھیں ہنس کر بولیں" تو خیالات بالکل ہی بدل گئے ہیں سلیم"

"جیسا دیس ویسا بھیس پھوپھی جان" وہ مسکرا کر بولے" کی زندگی قابلِ رشک ہے۔ انسان کو انسان بن کر جینے کا ڈھنگ ہے"

"ہونہہ" سہیل کے نتھنوں سے ہلکی سی آواز نکلی۔ وہ سلیم کی باتوں سے اتفاق نہ کر سکا۔

ریما نے بات بھانپ لی، تلخی کسے گوارا تھی جھٹ سے بات بدل کر بولی۔

"آپ ہماری بھابی اور بچوں کی تصویریں تو ساتھ لائے ہوں گے؟"

"او۔ یس - جاؤ میرے سوٹ کیس سے البم نکال لاؤ"

ریما اٹھ کر گئی۔ سلیم وہاں کی آسائشوں سے بھرپور زندگی گزارنے کی باتیں کرنے لگے۔ سہیل نے کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔

ریما البم اٹھا لائی۔

سب تصویریں دیکھنے لگے۔ سلیم بھابی لوسی۔ لارا اور میگی کے متعلق انہیں بتانے لگے۔

امریکہ میں رہتے ہوئے امریکی عورت کا شوہر بن کر امریکی عورت کے امریکی بچوں کا باپ بن کر وہ امریکہ نواز ہونے سے اپنے آپ کو کیونکر بچا سکتے تھے۔ ان کی زبان پر تعریفیں ہی تعریفیں تھیں۔

سلیم واقعی امریکی بن چکے تھے۔ یہاں کے آداب طور و طریق، رسم و رواج بھول کر بالکل امریکی بن گئے تھے۔ زندگی ان کے لیے خوبصورت تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے یہاں کے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے گن گاتے رہتے۔ ریما اور سہیل جس طرح بچوں سے وابستہ تھے یا اپنی مفلوج ماں کی جس طرح

خدمت کرتے تھے سلیم کو یہ باتیں واقعی عجیب لگتیں۔ لوگوں کا وقت بے وقت
مہمان بن کر نازل ہو جانا۔ عیادت کے لیے گھنٹوں پھوپھی اماں کے پاس آ
کر بیٹھے رہنا انہیں بالکل فضول لگتا تھا۔

وہ ریما سے کہتے "تم لوگوں نے زندگی وبالِ جان بنا رکھی ہے"

ریما ان سے بے حد متاثر تھی۔ بے دلی سے کہتی۔ "پھر کیا کیا جائے
بھائی جان۔ یہاں رسم و رواج ہی ایسے ہیں"

"میں تو دیکھتا ہوں یہاں ہر فرد اپنے اوپر بوجھ ہی بوجھ لادے
رہتا ہے۔ اب سہیل کی مثال لے لو۔ ایک جان سو غم۔ کمانے والا صرف
وہ ہے لیکن اس پر بیوی کا بوجھ، بچوں کا بوجھ، بیمار ماں کا بوجھ،
کیا زندگی ہے اس کی ــ؟"

ریما نے حیرانگی سے کہا "بھائی جان یہ سب کچھ بوجھ تو نہیں۔ بیوی
بچے بیمار ماں!"

وہاں پر تردد نہیں ہوتے نا۔ بچے ذرا بڑے ہوتے تو اپنا بار سنبھال
لیتے۔ مفلوج بوڑھے اولڈ ہاؤسس میں ڈال دیئے۔ میاں بیوی
کی یا اور عیش سے زندگی بسر کی۔ تم لوگ تو پاگل ہو ــ پاگل ــ جانے
زندگی گزار رہے ہو۔ تفریح کا لفظ تو شاید تمہارے لیے ایجاد ہی
نہ ہوا؟"

ریما ان کی باتیں سن کر کچھ پریشان سی ہو جاتی۔

سلیم سہیل سے بھی یہی باتیں کہتے۔ لیکن وہ مرعوب ہونے

بجائے دلائل سے جواب دیتا۔ اسے امریکی زندگی کی خوبصورتیوں کا پتہ تھا
لیکن چند بدصورت پہلو بھی تھے۔ جنہیں وہ سلیم کے سامنے رکھ دیتا۔
سلیم کبھی بھی قائل نہ ہوتے۔

دونوں کی باتیں اکثر بحث مباحثے کی صورت اختیار کر جاتیں۔ بات
بدمزگی تک پہنچنے لگتی تو کبھی ریما اور کبھی اماں موضوع بدل دیتیں۔

وہ چند دنوں کے لیے آئے تھے اور اتنی مدت بعد آئے تھے۔ اس کا
دونوں کو احساس تھا۔

"یار سہیل"

"جی!"

"میری مانو تو چلو میرے ساتھ"

"کہاں؟"

"امریکہ"

"کیوں؟"

وہاں تجھے بہت اچھی جاب مل سکتی ہے۔ یہاں کیا ہے۔ اتنی محنت
کرتے ہو اور ملتا کیا ہے وہاں تمہاری ہزاروں ڈالر کی آمدنی ہو سکتی ہے
ٹھاٹھ سے رہ سکو گے۔ یہاں ساری زندگی جتنا کما نہیں پاؤ گے وہاں
چند سالوں میں کما لو گے"

سہیل دھیرے سے مسکرایا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ریما بولی۔
"واقعی ــ میں تو آپ کے گھر اور بیوی بچوں کی تصویروں سے ہی اندازہ

لگاتی رہتی ہوں۔ کس ٹھاٹھ کی زندگی ہے!"

"واقعی؟" سہیل بولا

"پھر تم بھی چلو نا۔ بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں۔" ریما بولی۔

"یہاں کیا تکلیف ہے؟" ریما کی مرعوبیت سے برا مانتے ہوئے سہیل نے کہا۔

سلیم مسکرا کر بولے۔ "یہ پوچھو کونسی تکلیف نہیں ہے؟"

ریما جلدی سے بولی۔ "یہ بات نہیں ہے بھائی جان یہاں بھی ہم ٹھیک ٹھاک ہی ہیں۔ ویسے بہتر مستقبل کی تلاش میں وہاں جانا کیا برا ہے؟"

"سلیم بھائی کی طرح ہم بھی خون کے رشتے توڑ دیں؟" سہیل نے کہا۔

سلیم کھلکھلا کر ہنسے۔

"کیا فرق پڑتا ہے سہیل۔ تم اتنے جذباتی نہ بنو۔ اطمینان سے سوچو۔"

"بالکل بالکل۔" ریما نے کہا

اور

پھر

اٹھتے بیٹھتے ریما سہیل کو باہر جانے کے لیے مجبور کرنے لگی۔

سلیم کی باتیں بھی پھر پھرا کر اسی موضوع پر ہوتی تھیں۔ سہیل کبھی ان سنی کر دیتا۔ کبھی دلیلوں سے جواب دیتا اور کبھی ریما کو دھیمی سی ڈانٹ

پلا دیتا۔

اُس دن بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ سلیم وہاں کے قصے سنا رہے تھے۔ سہیل وہاں کی زندگی کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کبھی نہ جھجکتا تھا۔

کسی بات پر اس نے بے اختیار کہا۔ "بہت خوب!"

تو ریما جھٹ سے بولی۔ "جن باتوں کے تصور ہی سے انسان جھوم جاتے وہ حقیقت میں کیسی ہوں گی؟"

سلیم نے کہا۔ "وہاں جاؤ تو پتہ چلے گا!"

"اللہ سہیل۔ آپ کیوں نہیں کوشش کرتے؟"

"کس بات کی؟"

"بہت شوق ہے تمہیں؟"

"بالکل ہے۔ بھائی جان کی باتیں سن سن کر جی چاہتا ہے اڑ کر وہاں جا پہنچوں۔"

"تو چلی جاؤ ان کے ساتھ۔ بھابی اور بھتیجے بھتیجیاں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔"

"نہ نہ — نہ" سلیم زور سے ہنسے۔ "یہ بات نہ ہوگی۔ وہاں یہی تو اچھائی ہے سہیل۔ کوئی کسی کو سر آنکھوں پر نہیں بٹھاتا۔ اپنا کماؤ اور اپنا کھاؤ۔"

ریما چپ ہو گئی۔ سہیل نے طنزیہ انداز سے سلیم اور ریما کو دیکھا۔

پھر خوش دلی سے بولا "اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ اس معاشرے کی یہی قدریں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ ہم وہاں جائیں تو ہمیں ابھی انہی قدروں کے مطابق چلنا ہوگا۔"

"تو کیا ہوا؟" ریما پھر بولی

"ریما۔ ہمارے ساتھ اماں بھی ہیں۔" بالآخر سہیل نے کہا۔ "اماں جو بیمار ہیں۔ مفلوج ہیں۔"

"اوہ ہاں۔" ریما بیزاری سے بولی۔ "واقعی ہم بھلا کیسے جا سکتے ہیں؟"

"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں سہیل۔" سلیم بولے۔ "تم وہاں اتنا کما سکتے ہو کہ ان کے لیے ہر ماہ معقول رقم بھجوا سکتے ہو۔ جس سے یہاں ایک ملازم ان کے لیے رکھ سکے۔ ہو جو صرف ان کی دیکھ بھال پر ہی مامور ہو۔"

"انہیں ہماری ضرورت ہے بھائی جان۔ اس عمر اور بیماری میں انہیں نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر امریکہ چلے جانے کی حماقت کم از کم میں تو نہیں کر سکتا۔"

سلیم کھلکھلا کر ہنسے اور قدرے تمسخر سے بولے۔ "سوچ ویسے احمقانہ ہی ہے یہ۔"

سہیل نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اس سے عمر میں بڑے تھے۔ آداب ملحوظ تھا۔ سلیم اسے قائل کرنے کے لیے زوردار دلائل دینے لگے۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ جواب تو اس کے پاس بڑے معقول تھے لیکن وہ چپ ہی رہا۔

"تم لوگ ہر بات کو اپنے اوپر بوجھ بنا کر ڈال لیتے ہو۔ ایک طرف بوڑھوں کے لیے اپنے اوپر دباؤ ڈالے رہتے ہو۔ دوسری طرف بچوں کو مسئلہ بناتے ہوتے ہو۔ وہاں یہ چیزیں نہیں ہیں۔ اب میرے دو بچے ہیں۔ لارا تیرہ سالہ ہے۔ میگی گیارہ سال کی ہے لیکن دونوں اب مجھ پر بار بننے کی بجائے اپنا اپنا کام تلاش کرنے کی فکر میں ہیں۔ لارا تو اپنا جیب خرچ چھوٹے موٹے کام کر کے نکالنے بھی لگا ہے۔ پچھلے سال سے وہ اخباریں بیچتا ہے۔ میگی بھی اس سال کوئی نہ کوئی کام سائڈ پر شروع کر دے گی۔ وہ دونوں خود کمائیں گے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ میری بیوی اپنا کماتی ہے۔ میرے پاس پیسے کی کمی نہیں۔ پھر بھی یہ سب کام کرتے ہیں۔"

سہیل طنز سے مسکرایا۔ "ہم اپنے بزرگوں اور بچوں سے ضرورت سے زیادہ ہی وابستہ ہوتے ہیں نا۔"

"بالکل بالکل۔" سلیم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تم لوگ ماضی اور مستقبل سے چمٹے رہتے ہو۔ وہاں لوگ حال کو دیکھتے ہیں بس۔"

"حال سے ماضی کٹ سکتا ہے یہ مستقبل ہی تو ان لوگوں کی بھول ہے اسی لیے وہ ان خوشیوں سے محروم ہیں جنہیں روحانی خوشیاں کہا جا سکتا ہے۔"

سلیم نے اک زوردار قہقہہ لگایا۔ "خوشیوں کا مفہوم اللہ جانے تمہارے نزدیک کیا ہے۔"

سلیم نے سہیل کے کندھے پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے جب ہنسی پر کچھ قابو پایا تو بولے "میرے عزیز میں تمہارے بھلے ہی کی بات کرتا ہوں۔ کیوں یہاں اپنی صلاحیتیں برباد کر رہے ہو۔ لوگوں کو تو موقع نہیں ملتا۔ تمہارے لئے تو میں آفر دے رہا ہوں۔ تم وہاں آ جاؤ۔۔۔ میرے پاس ٹھہرو۔ کام تلاش کرو۔ پھر ٹھاٹھ سے زندگی گزارو۔ یہاں تم اتنی محنت کرتے ہو۔۔۔ ملتا کیا ہے؟"

"جتنا بھی ملتا ہے اک کنبے کی پُرسکون کفالت کے لیے کافی ہے۔"

"اب تم کج بحثی کرو تو اس کا کیا حل؟۔۔۔ تمہاری مرضی ہی ہے۔"

"مجھے اپنا وطن ملک اپنے لوگ اپنا خاندان چھوڑ کر مادی سہولتوں اور آسائشوں کے پیچھے بھاگنا پسند نہیں بھائی جان۔"

"جب انہیں پسند نہیں تو آپ کیوں زور دیتے ہیں بھائی جان!" ریما دل میں بُرا مان کر بھائی سے کہنے لگی۔

سہیل پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولا "بھائی جان کی سہانی باتیں لگتا ہے تمہیں راس آنے لگی ہیں۔"

"وہ آپ کے بھلے ہی کی بات کرتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن اپنی اپنی طبیعت ہے نا۔ میں انسانی جذبوں کے درمیان جینا چاہتا ہوں۔ وہ ان کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔"

سلیم اس چوٹ پر مسکرا دیئے۔ جلدی سے بولے "بھائی تم نے تو جیسے وہاں کے لوگوں کو جانور ہی جان لیا ہے!"

کم از کم معاشرتی زندگی ایسی ہی ہے۔"

"حد ہو گئی"

"صرف پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بھائی جان۔ زندگی کے لیے اور سہاروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں انسان مشین بن چکا ہے۔ مشین جو جذبوں سے خالی ہوتی ہے۔"

سلیم اس کی بات پر خوب ہنسے۔

پھر

جتنے دن وہ رہے یہی باتیں ہوتی رہیں۔ سلیم تو جیسے وہاں کی طرزِ زندگی کے گن گاتے نہ تھکتے تھے۔ بات بات پہ وہاں کی مثال دینا نہ بھولتے سہیل تو خیر ان کی باتوں سے مرعوب نہ ہوتا۔ ہاں ریما بڑی متاثر ہوتی۔ وہ ان سے سوالات کر کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتی رہتی۔ اور اس کا دل اندر ہی اندر للچانے لگتا۔ کاش سہیل بھائی جان کی بات مان کر امریکہ چلے جائیں۔ وہ اکثر سوچتی۔ لیکن سہیل کے رویے سے ظاہر تھا کہ وہ ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ سب سے بڑا مسئلہ تو اماں کا تھا۔

ریما کو تو جیسے اب جھنجھلاہٹ ہونے لگتی۔ خدا جانے کب تک چارپائی سے لگی رہیں گی۔ اور کب تک اسے ان کی خدمت کرنا پڑے گی۔ آخر اپنی بھی تو کوئی زندگی ہوتی ہے۔ ہم لوگ واقعی بچوں اور بزرگوں کے درمیان پس کر رہ جاتے ہیں۔

سلیم بھائی تین ہفتے کے لیے آئے تھے۔ ان تین ہفتوں میں ریما ان کی باتیں نشے کی طرح اندر اتارتی رہی۔ سلیم کی ہر بات اسے وزنی اور پُر اثر لگتی تھی۔ اس نے بڑا زور مارا کہ سہیل امریکہ جانے کی حامی بھر لے۔ اس بارے میں اس سے تلخ کلامی بھی کی۔ پیار سے منایا۔ لیکن وہ نہ تو سلیم کی باتوں سے مرعوب ہُوا تھا نہ متاثر۔ وہ اکثر ریما سے کہتا:

"وہاں زندگی کھوکھلی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ بیشک خوبصورت ہے لیکن کچھ بھی نہیں!" ریما بُرا مان جاتی۔

تین ہفتے بعد سلیم چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی گھر کی فضا خاصے دنوں متاثر رہی۔

سہیل کو بڑا افسوس ہوتا۔ اس کے گھر کی فضا بڑی پُرسکون تھی اور زندگی بڑے خوشگوار طریقے سے رواں دواں تھی۔ بڑے بڑے خواب انہوں نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی چنتے رہتے تھے۔

لیکن

اب

ریما کی آنکھوں میں مغرب کی چکا چوند زندگی کے عکس لہریں لیتے دکھائی دیتے تھے۔

سہولتوں اور آسائشوں کی آزمائش ستاتی تھی۔

اب تو اسے گھر کے کام کرتے بھی الجھن ہوتی تھی۔

بچوں کو بھی کسی وقت وبالِ جان سمجھنے لگتی۔ وہ یہی سوچتی رہتی کہ آخر اس کی اپنی زندگی کیا ہے؟

اور

اماں کے کام بھی اب اسے جنجال لگنے لگے تھے۔

"یہ کیا مصیبت ہے؟" وہ اکثر بڑبڑاتی۔

سہیل اس کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ عقلمند آدمی تھا۔ کسی بات پر اسے سرزنش نہیں کی۔ جانتا تھا امریکہ کا نشہ ہے۔ اب بھائی چلے گئے ہیں۔ تو آہستہ آہستہ خود ہی اُتر جائے گا۔

اس دن جانے کس بات پر ریما نے زیبی اور ککو کی پٹائی کی۔ سہیل آیا تو دونوں بچے روتے روتے باپ سے لپٹ گئے۔

"کیا ہوا بھئی؟" اس نے پوچھا۔

"امی نے مارا ہے!"

"کوئی شرارت کی ہوگی نا؟"

بچوں کے بولنے سے پہلے ریما جھلاتی ہوئی بولی: "جان کھا گئے ہیں کم بخت!"

"جان تو یہ عمر بھر کھاتے رہیں گے۔" سہیل ہنسا۔

سارے عذاب ہم لوگوں کے لیے ہی ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ امریکی لوگوں کے مزے ہیں نا۔ وہاں رہنے والے سب لوگوں کے بھی۔"

"سہیل نے ہنس کر چوٹ کی۔"

"اور نہیں تو کیا۔" ریما جھٹ سے بولی۔

"ریما جان۔" سہیل نے بڑے پیار سے کہا اور پھر زیبی اور گڈو سے پیار کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری امی بڑی جذباتی ہو جاتی ہیں۔"

پھر بڑی ملائمت سے وہ ریما کو سمجھاتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "یہ آج ہماری جان کھا رہے ہیں۔ کل ہم ان کی کھانے کا حق رکھیں گے۔ تو لو اور دو کا معاملہ ہے۔"

ریما نے سر جھٹک کر اسے دیکھا۔ بچے باپ سے پیار پا کر کھیلنے لگے۔

"ہاں۔ جانِ جاناں۔" وہ پھر ہنس کر بولا۔ "سلیم بھائی تمہارے دل و دماغ پر جو سائے ڈال گئے ہیں انہیں جھٹک دو۔ ہم انسان ہیں۔ اپنے بچوں کو انسانوں کی طرح پالتے پوستے ہیں۔ بڑا کرتے ہیں۔ ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔"

"وہ لوگ تو جانور ہیں نا؟" ریما نے جھٹ سے طنز کیا۔

"جانور تو نہیں۔ لیکن کچھ جانوروں کی سی ضرور عادتیں اپنا چکے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"یہی بچوں کا معاملہ لے لو۔ وہ بچے پیدا کرتے ہیں۔ رو دھو کر پال لیتے ہیں۔"

"رو دھو کر؟"

"جی ہاں مائیں کام کرتی ہوں تو بچوں کا پالنا رونے دھونے کے مترادف ہی ہوتا ہے۔ جو بچے نرسنگ ہومز یا بے بی سٹرز کے پاس پلتے ہیں وہ ماں باپ کے خون کی خوشبو کو بھول جاتے ہیں۔"

"ہونہہ"

"یہ بچے جب پوری طرح اپنی پہچان بھی نہیں کر پاتے۔ رشتوں اور جذبوں سے بھی پوری طرح متعارف نہیں ہوتے تو انہیں عملی زندگی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ وہ خود کمانے کی سوچنے لگتے ہیں۔ خود اپنے آپ کو بنانے کا سوچتے ہیں۔ سلیم بھائی اپنے بچوں کا ہی حوالہ دے رہے تھے نا؟"

"تو کوئی بری بات ہے؟"

"شاید بری بات نہ ہو لیکن اس کے اثرات واقعی برے ہیں۔"

"آپ کے خیال میں۔"

"نہیں ریما جانی۔ یہ حقیقت ہے۔ یہی بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ماں باپ ان کے لیے اجنبیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جس طرح والدین نے ان کی کوئی ذمہ داری نہیں اٹھائی ہوتی اسی طرح وہ بھی اپنے والدین کی ذمہ داری نہیں اٹھاتے۔"

"ان کی بھی تو گزر رہی جاتی ہے۔"

"اچھی کسی طور نہیں گزرتی۔"

"اپنا اپنا خیال ہی ہے نا۔" وہ بحث کے موڈ میں تھی۔ سہیل اس میں

الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے بولا "اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ چائے بنا دو اور ساتھ ہی کچھ کھانے کو بھی دے دو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

ریما کچن میں چلی گئی۔ سہیل اماں کے کمرے میں آ بیٹھا۔ ان کی احوال پرسی کی۔ ریما چائے لے آئی۔ بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گئے۔ چھوٹا سا کنبہ ایک کمرے میں جمع ہو گیا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ سہیل کا اندازہ ٹھیک تھا۔ ریما کے دماغ میں سلیم بھائی کی باتیں جو گھر کر گئی تھیں آہستہ آہستہ بے گھر ہونے لگیں۔ زندگی اپنی سچائیوں کے ساتھ پھر سامنے تھی۔ ساس، شوہر اور بچے یہی زندگی کا محور تھا وہ اسی کے گرد گھومنے لگی۔

پھر دو بچے اور ہو گئے۔ اماں فوت ہو گئیں۔ دکھ سکھ کے سایوں میں وقت گزرتا چلا گیا۔

بچے جوان ہو گئے۔ ریما اور سہیل نے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ دیئے۔ زیبی کی شادی ہو گئی۔ گگو ڈاکٹر بن گیا۔ رضی انجینئرنگ کے آخری سال میں پہنچ گیا۔ جیدی نے کمیشن لے لی۔ زندگی بھرپور اور مسرور تھی۔ تفکرات اور پریشانیاں بھی تھیں۔ لیکن ایک دوسرے کے ساتھ خلوص محبت اور تعاون کی جو دوڑ بندھی تھی ان پر قابو پانا مشکل نہ تھا۔ مشترکہ گھر کی مشترکہ خوشیاں تھیں۔ مشترکہ غم تھے

ہر کوئی دوسرے کی تکلیف شیئر کرتا تھا۔ بے لوث خدمت کے لیے کمربستہ رہتا تھا۔

بچوں نے ماں باپ کو تو آنکھ کا تارا بنا رکھا تھا۔ ان کی خدمت اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ دونوں میں سے کسی کی طبیعت بھی خراب ہو جاتی تو بچوں کی جیسے جان پر بن آتی۔ ہر طرح کا آرام و آسائش پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے۔ گھر میں سکون ہی سکون تھا۔

ریما کی طبیعت کچھ دنوں سے خراب تھی۔ دائیں گھٹنے میں تکلیف تھی ہلکا ہلکا بخار بھی رہتا تھا۔ اور سینے میں خراش بھی ہوتی تھی۔ عمر کے تقاضوں کے لحاظ سے یہ کوئی سنجیدہ قسم کی بیماری نہ تھی۔ پھر بھی بچوں کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی۔

زیبی ہر روز اپنے میاں کے ساتھ انہیں دیکھنے آتی۔ باتیں کرتی۔ مرد باتی گھٹنے پر مالش کرتی۔

گگو خود ڈاکٹر تھا لیکن پھر بھی تسلی کے لیے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مشورے لے رہا تھا۔ گھٹنے کا ایکسرے کروا کے بون سپیشلسٹ سے مشورہ کیا تھا۔ خون ٹسٹ کروایا تھا۔ خود نگہداشت کرتا تھا۔ ماں کے بیڈ پر ان کی پائنتی بیٹھ کر ہولے ہولے ماں کے پاؤں دباتا رہتا تھا۔

رضی بھی مقدور بھر خدمت کرتا۔ دوا یوں کے لیے بھاگ دوڑ اسی کا کام تھا۔ جیدی نوکری کے سلسلے میں دور تھا لیکن فون پر ہر روز ہی ماں کی

خیریت دریافت کرتا تھا۔

اس رات سب ریما کے کمرے میں تھے۔ گگو حسب عادت ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ زیبی سرہانے بیٹھی تھی۔ رضی جیدی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ سہیل اپنی اس پھلواری کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہا تھا۔

"ماں کی اتنی خدمت کر رہے ہو۔" سہیل نے ہنس کر کہا۔ "اسے خدمت کروانے کا چسکا پڑ گیا تو بستر سے اٹھے گی ہی نہیں۔"

ریما ہنس کر بولی۔ "آپ کیوں جلتے ہیں؟"

"مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

"خدا ان سب کو شاد و آباد رکھے۔"

"آمین۔"

"فرمانبردار اور سعادت مند بچے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں۔"

"واقعی۔"

ماں باپ کی باتیں سن کر گگو بولا۔ "یہ ہمارا فرض ہے ابو۔"

زیبی نے کہا۔ "آپ نے بھی تو اپنے ماں باپ کی ایسے ہی خدمت کی تھی۔ مجھے یاد ہے جب دادی اماں بیمار تھیں۔"

زیبی اور گگو بچپن کی یادیں تازہ کرنے لگے۔ اور انہی کے حوالے سے سلیم کا ذکر آ گیا۔ برس ہا برس گزر گئے تھے ان کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ پانچ سال پہلے ایک خط آیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ان کی بیوی کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئی ہے۔

ریما کی طبیعت اب سنبھل گئی تھی پھر بھی بچے اسی طرح خدمت گزاری رہے تھے۔ چند دنوں کی چھٹی لے کر جیدی بھی آ گیا تھا۔

گھر میں خوب رونق اور گہما گہمی تھی۔

کھانا کھا کر سب امی کے پاس تھے۔ زیبی حسب عادت سر دبا رہی تھی۔ گگو پاؤں گود میں رکھے تھا۔ جیدی ماں کے ساتھ لیٹا باتیں کر رہا تھا۔ رضی ابا کی بغل میں بیٹھا تھا۔ مسرور اور شاد ماں لوگ ننھی منی خوشیاں سمیٹ رہے تھے۔

دروازے پر کسی نے دستک دی۔

اور پھر بیل بجنے لگی۔

"دیکھو تو کون ہے؟" سہیل نے رضی سے کہا۔ رضی باہر چلا گیا۔

"اللہ خیر کرے اس وقت کون آیا ہے؟" ریما نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"امی آپ تو ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔ اس وقت کی کیا بات ابھی تو ساڑھے دس ہی بجے ہیں، گگو نے کہا۔

"ساڑھے دس ہی ہیں؟" ریما نے جواب دیا۔ "کون آ سکتا ہے اس وقت؟"

"جو بھی ہے ابھی پتہ چل جاتا ہے۔" سہیل نے کہا

"رضی پتہ کرنے گیا ہے آپ آرام سے لیٹی رہیں۔" زیبی نے تکیے کے سہارے اونچا ہونے والی امی کو آرام سے بستر میں لیٹنے کی تاکید کی۔

ریما لیٹ گئی۔ جیدی نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پیار کر لیا۔
رضی چند منٹ بعد اندر آ گیا۔ اس نے ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا
"کون آیا ہے؟" تقریباً سبھی نے سوٹ کیس دیکھ کر پوچھا۔
نیا اور خوبصورت غیر ملکی سوٹ کیس دیکھ کر ریما ابھی کچھ کہنے ہی
کو تھی کہ دروازے میں آنے والا آن کھڑا ہوا۔
"سلیم بھائی" سہیل نے انہیں پہچانتے ہی کہا اور بے تابی سے اٹھ
کر ان سے بغلگیر ہو گیا۔ ریما اپنی کمزوری اور بیماری بھول بھال کر بستر
سے نکلی اور سلیم کے پھیلے بازوؤں میں آ گئی۔
زیبی لکو بھی اٹھ کر قریب آ گئے۔ جیدی اور رضی ان سب کو
تکنے لگے۔
سلیم بھائی ایک طویل عرصے کے بعد بغیر اطلاع کے آ گئے تھے۔
کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔
سہیل اور ریما نے جس گرمجوشی سے استقبال کیا اور جس محبت اور
خلوص سے اچانک بغیر اطلاع کے آ جانے کا پوچھا۔ سلیم کی آنکھیں
ڈبڈبانے لگیں۔ انہوں نے بہہ جانے والے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے
روکا۔
سہیل کا دل تڑپ گیا۔ ریما بھی بے چین ہو گئی۔
بچوں نے باری باری ماموں کو آداب کیا۔ سلیم انہیں گلے سے لگا
بے اختیار رو پڑے۔

اور پھر جب انہیں سہیل نے سہارا دے کر اپنے قریب صوفے پر
بٹھا لیا تو بھی وہ سسک سسک کر روتے رہے۔
چند لمحے بڑی بوجھل سی خاموشی چھائی رہی۔ دیکھا دیکھی سبھی کی
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ریما تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
سہیل بھی آبدیدہ ہو گئے۔ لیکن اسے حیرانگی نے بھی گھیرے
رکھا۔ سلیم بھائی کے اس طرح رونے کی وجہ سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔
جب وہ قدرے پرسکون ہوئے تو سہیل نے بوجھل آواز میں
کہا: "آپ اطلاع دیتے ہم آپ کو ایئرپورٹ لینے آ جاتے۔ سلیم بھائی
— آپ — آپ آ کیسے گئے؟"
سلیم نے سر جھکا لیا۔ وہ بہت دل گرفتہ اور ٹوٹے پھوٹے لگ رہے
تھے۔ جب ریما نے بھی سہیل والا سوال دہرایا۔
تو
وہ
آہستگی سے بولے: "تنہائی سے گھبرا کر۔"
سہیل نے معنی خیز نظروں سے ریما کو دیکھا۔ ریما ان نظروں کا
مفہوم سمجھ گئی۔ سر جھکاتے ہوئے بولی۔
"لوسی کے مرنے کا پتہ چلا تھا لیکن آپ کے بچے —؟"
سلیم کے دونوں بچے لارا اور میگی ٹھیک ٹھاک تھے۔ لارا کسی انشورنس
کمپنی میں معقول مشاہرہ پر ملازم تھا۔ شادی کر لی تھی۔ بچے تھے اور میگی

بھی کسی ایئر لائن میں جاب کر رہی تھی۔ اس نے شادی تو نہ کی تھی ہاں اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ اس معاشرے کے مطابق یہ سب کچھ ٹھیک تھا۔ دونوں بچے سال میں ایک بار باپ کی برتھ ڈے پر کارڈ ضرور بھیجتے۔ اور کبھی کبھار فون کر لیتے۔ سلیم خود بھی انہیں دیکھنے چلے جاتے۔ لیکن یہ جانا دنوں کا نہیں لمحوں کا ہوتا۔ یوں سلیم ایک طرح کی قید تنہائی کاٹ رہے تھے۔

اس زہر کو اندر اتار رہے تھے۔

سب سے کٹ کر جینے کی تلخی کا تجربہ کر رہے تھے۔

وہ تنگ آ گئے اور انہوں نے دونوں بچوں کو زبردستی بلا بھیجا۔

وہ دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

لیکن

دونوں نے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے معذرت کر دی۔ وہ ان کا ساتھ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اتنی فاسٹ زندگی میں ایک ستر بہتر سالہ آدمی کا ہاتھ پکڑ کر کون چل سکتا تھا؟

کون چلنا پسند کرتا تھا۔

اس معاشرے میں تو اس بات کی کوئی قید بھی نہ تھی۔

دونوں نے انکار کر دیا۔

لیکن دونوں نے ہی متفقہ فیصلے سے سلیم کو کسی بوڑھوں کے ہوسٹل میں داخل کروانے کا سوچا۔ جہاں بوڑھے، مفلوج اور محتاج بوڑھے اکٹھے رہتے ہیں۔ جہاں ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ لیکن جہاں وہ اپنوں سے کٹ کر تنہائیوں کا زہر پیتے پیتے موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

سلیم

گھبرا کر پاکستان بھاگ آئے تھے کہ یہاں بوڑھوں کو بیکار شے سمجھ کر الگ تھلگ پھینک نہیں دیا جاتا۔

یہاں بوڑھے تنہائیوں کا زہر نہیں پیتے۔

یہاں ان کی قدر کی جاتی ہے۔

ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جاتا ہے۔

سلیم کی روئیداد سن کر سب خاص طور پر رہیا کانپ کانپ گئی۔ شکر ہے بھائی جان آپ کے کہنے پر ہم وہاں نہ چلے گئے ورنہ آج — آج دیکھتے ہمارے بچے — ہمارے بچے...!"

سلیم نے شکست کا اعتراف کرتے ہوئے سر جھکا لیا اور پھر آہستگی سے بولے:

"میں تم سب پر بار نہیں بنوں گا۔ میرے پاس کافی پیسہ ہے لیکن — لیکن وعدہ کرو — کہ مجھے تنہائی کے کرب سے —"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی جان۔" سہیل نے ان کے گلے میں بازو ڈال کر بڑی محبت سے کہا۔ "آپ ہمارے بزرگ ہیں اور ہمارے آداب، ہمارے رسم و رواج اور ہماری قدریں بزرگوں کو زحمت نہیں ۔۔ رحمت بنا دیتی ہیں ۔ میں، میری بیوی اور میرے بچے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔"

سہیل کی بات پر ریما اور سبھی بچوں نے تائید کی۔
سلیم کی آنکھیں جھک گئیں۔
اور سہیل کا سینہ فخر سے تن گیا۔

میں چپ رہوں گی

اونچے شیشے لگے چوبی تکیئے والے پلنگ پر بوسکی کی کڑھائی والی چادر پڑی تھی۔ بوسکی کا جھالروں والا تکیہ بھی تھا اور اس پر ریشمی دھاگے سے بڑے بڑے پھول بنے تھے۔

رابعہ اس پلنگ پر کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ اس نے کیسری رنگ کے سلمہ ستارہ لگے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کہنیوں تک طلائی چوڑیاں تھیں، کانوں میں بالے تھے۔ گلے میں جڑاؤ ہار تھے۔ اس کی ساس نے آج بڑے اصرار سے اسے یہ کپڑے پہنائے تھے۔ زیور سے لادا تھا اور پلنگ پر آرام سے لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ برکتے کو اس نے کہا تھا۔

"بی بی کے پاؤں اور پنڈلیاں ہولے ہولے دباتی رہو"

برکتے پائنتی کی طرف آن بیٹھی تھی اور رابعہ کے پاؤں دباتی رہی تھی وہ

بہت خوش تھی ـــــــ

لیکن ـــــــ

رابعہ چپ تھی ـــــــ

چپ چپ تو وہ اسی دن سے تھی۔ جب کرامتوں والے پیر کے در سے لوٹی تھی۔ لیکن آج اسے خوش ہونا چاہیئے تھا۔

ہنسنا مسکرانا چاہیئے ـــــــ

برکتے پاؤں دباتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

کئی دفعہ اس نے رابعہ سے بات بھی کرنا چاہی تھی۔

لیکن ـــــــ

رابعہ پر تو اک گمبھیر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دالان کافی کشادہ تھا۔ رابعہ کے پلنگ جیسا پلنگ دیوار کے ساتھ بھی بچھا ہوا تھا۔ اس پر بھی ریشمی بستر تھا یہ پلنگ اس کے شوہر چودھری اکرم کا تھا۔

دالان کافی سجا ہوا تھا۔ فرش پر سبز دری تھی۔ درمیان میں چیتے کی کھال تھی۔ ایک طرف مخملی کرسیاں تھیں جن کے تکیئے اونچے اور شیشوں سے مزین تھے ـــــــ

دیواروں پر ہلکے فیروزی رنگ کی قلعی تھی اور جگہ جگہ بڑے بڑے فریموں والی تصویریں لگی تھیں ایک طرف دیوار کے ساتھ بندوق لٹک رہی تھی۔ دوسری طرف کھونٹی تھی جس پر رابعہ کے ریشمی کپڑے اور چودھری اکرم

کی کلف شدہ پگڑی اور کالی اچکن بھی تھی۔

ایک طرف مینٹل پیس تھی۔ جس پر بڑے سے فریم والا آئینہ تھا۔ آئینے کے دونوں طرف پیتل کے منقش گلدان تھے جن میں کاغذی پھول تھے۔ آئینے پر کروشیئے کا رومال تھا۔

پرانے طرز کی بڑی سی حویلی کا یہ کشادہ دالان اکرم اور رابعہ کی خوابگاہ تھا ـــــــ

چودھری اکرم سجیلا جوان تھا۔ بیحد جرأت مند اور جیالا۔ دشمنوں کا دشمن اور سجنوں کا سجن ـــ وہ تقریباً پورے گاؤں کا مالک تھا۔ کئی مربع زمین نہر کے پار بھی تھی۔ اور تھوڑی سی ساتھ والے گاؤں میں بھی تھی جو اسے ننھیال سے ملی تھی۔

زمینوں کی دیکھ بھال وہ خود کرتا تھا۔ دوسرے زمینداروں کی طرح وہ زمینوں کی کمائی شہر میں منتقل نہیں کر رہا تھا۔ اس کے چچازاد بھائی زمینوں کا بٹوارہ کر کے شہروں میں صنعتیں لگا رہے تھے۔ زمینیں بیچ رہے تھے۔ کچھ یہیں تھے۔

لیکن ـــــــ

زمینوں کی دیکھ بھال میں عار سمجھتے تھے۔

اکرم کے نزدیک زمین بیچنا گناہ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی اور یہ دھرتی ماں ـــ ماں کی ممتا کی طرح اس پر دھن نچھاور کر رہی تھی۔ اکرم کی زمین سونا اگل رہی تھی۔

بوائی کٹائی اور زمینوں کی سیرابی وہ اپنی زیر نگرانی کرواتا تھا۔ مزارعے بھی تھے اور ان کا حق وہ انہیں دیتا بھی تھا۔ لیکن نگہداشت اپنی تھی مزارعے اس سے خوش تھے۔

اور ——

وہ مزارعوں سے خوش ——

وہ دل کا سادہ اور کھرا آدمی تھا۔ ہیرا پھیری اسے نہیں آتی تھی محنت کرتا تھا اور اس کا صلہ پاتا تھا۔

اس نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ گاؤں کے اسکول ہی میں پڑھ لیا تھا — اس کی سادگی اور سادہ لوحی کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ اس نے شہری ماحول میں خود کو نہیں ڈھالا تھا۔

وہ ——

شہر اسی وقت جاتا جب اس کی ضرورت پڑتی، اسے شہری ماحول میں وحشت ہونے لگتی تھی۔

اس کے تایا زاد چچا زاد شہروں میں رہتے تھے۔ انہوں نے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی تھی۔ دو ایک تو بیرون ملک بھی گئے تھے۔ انہوں نے اکرم کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہا تھا۔ اس کے ایک تایا نے تو بڑا اصرار بھی کیا تھا کہ اکرم شہر میں جا کر تعلیم حاصل کرے۔

لیکن ——

اس کا رجحان نہیں تھا اسے اپنی زمینوں سے محبت تھی اور وہ سارا

وقت زمینوں کی دیکھ بھال میں گزارتا تھا۔

لیکن

اس میں اس بات سے عدم اعتمادی نہیں آئی تھی۔ تعلیم نہ تھی تو کیا ہوا، سوجھ سمجھ اور سوجھ بوجھ تو خدا داد تھی۔ زمینوں کا وسیع کام — اس نے سنبھالا ہوا تھا۔

اور

دوسرے زمینداروں سے کہیں زیادہ اس کے کھیت سرسبز تھے اور غلہ فی ایکڑ ان سے کہیں زیادہ ملتا تھا۔ ساتھ والے دونوں گاؤں اس کے چچا اور تایا کے تھے۔ وہاں بھی یہی سنہری مٹی والی زمین تھی۔ ایسا ہی ٹیوب ویلوں کا چاندی طرح چمکتا پانی تھا۔

لیکن

کئی کئی مربعے ویران پڑے تھے۔ چچا اور تایا کی اولادیں شہروں میں جا بسی تھیں۔ ایک ایک دو دو بیٹے یہاں رہ گئے تھے وہ بھی زمینوں میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔

مزارعے جو کچھ کرتے وہی تھا وہ شہروں میں جا کر نہیں بسے تھے۔ لیکن زمینوں کی دولت شہروں میں لٹانے ضرور جاتے تھے۔ حصے بخرے ہونے سے اراضی بٹ بھی گئی تھی۔ اکرم ایک اکیلا بیٹا تھا اس لئے ساری زرعی زمینیں اسے وراثت میں ملی تھیں۔ باپ چھوڑا سے تو نانا کے ترکے میں بھی دو مربعے ملے تھے۔ چچا زاد، تایا زاد اندر ہی اندر اس

سے جلتے بھی تھے۔

چھ سات سال پہلے جب اکرم کی ماں رحیم بی بی نے اپنے اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرے کے پھول سجانے کی تمنا کی تھی تو کئی رشتے دار اور بڑے بڑے چودھریوں نے غیر متعلقہ لوگوں کی وساطت سے رشتے کے لئے کہلوایا۔

چودھری نواز جو اکرم کا چھوٹا چچا تھا۔ خود اس کی ماں کے پاس آیا اس کی دو جوان بیٹیاں تھیں۔

اکرم جیسا گبرو سجیلا جوان اور کئی مربعوں کا تنہا مالک تھا اور اپنا خون بھی تھا۔ زیادہ کشش دولت ہی کی تھی۔ اس نے رحیم بی بی سے خود اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"بھابی — میری بیٹیاں تیری بیٹیاں ہیں، تو جس پر ہاتھ رکھ دے تیری جھولی میں ڈال دوں گا۔"

رحیم بی بی کی جیسے دلی مراد بر آئی۔ جلدی سے بولی۔

"ویر جی بیٹیاں بھی اپنی، بیٹا بھی اپنا — تو نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے یہ بات منہ پر اس لئے نہ لائی تھی کہ تیری بیٹیاں شہر میں رہتی ہیں۔ سکولوں کالجوں کی پڑھی ہیں۔ اکرم نے تو دس بھی پاس نہیں کیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے چودھرانی — اکرم جیسا گبرو جوان جس کا نام گاؤں گن گاتا ہے، جو شریف ہے سادہ مزاج ہے، محنتی اور ایماندار ہے

جس بچی کا جیون ساتھی بنے گا اس کا نصیبہ جاگ جائے گا۔"

"میں اکرم سے پوچھ لوں — پھر تمہارے ہاں آؤں گی جھولی پھیلانے —"

"اکرم کیا انکار کرے گا"

"کیا خبر بھائی جی — اس کی پسند ناپسند بھی تو دیکھنی ہے نا مجھے تو بلو کو بہو بنانے سے خوشی ہوگی۔ پر اپنے راجے سے بھی تو پوچھ لوں۔"

لیکن

جب ماں نے راجے سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"ماں جی۔ آپ نے کیسے یہ بات کہہ دی۔ بلو سے میرا رشتہ کرنے کا آپ نے سوچا بھی کیونکر —؟"

"وہ تیرے چچا کی بیٹی ہے۔ خوبصورت ہے، کام کاج کی تیز ہے پھر اپنا خون ہے۔"

"ماں جی — وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ میں نے تو کسی ڈھنگ کے سکول میں بھی نہیں پڑھا۔ اس نے تو شہر کے اسکول میں تعلیم پائی ہے اور اب کالج میں پڑھ رہی ہے۔ اتنی پڑھی لکھی اور فیشن ایبل لڑکی سے میں شادی کروں گا — نہیں ماں جی — نہیں — میں ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔"

"تیرے چچا کی خواہش ہے بیٹے۔ جب انہیں کوئی اعتراض نہیں تو پھر تم انکار کیوں کرتے ہو؟"

"اس لئے کہ میں بلّو سے شادی نہیں کروں گا چاہے بلو خود بھی اپنی رضا مندی کا اظہار کر دے۔"

"کیوں ——؟"

اس کیوں کا جواب اکرم ایک دم نہ دے سکا۔ ہاں اس کی خوبصورت سیاہ اور گہری گہری آنکھوں میں چاندنی کے عکس لہرا گئے اور اس کی بڑی بڑی مونچھوں تلے بھرے بھرے ہونٹ مسکرانے لگے۔

ماں نے بڑے غور سے دیکھا۔

اور آہستگی سے بولی۔

"کہیں اٹ سٹ لڑا رکھی ہے۔"؟

اس نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔

اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

ماں تجسس سے بولی۔

"کون ہے وہ ——؟"

"ہے ایک لڑکی ——"

"لڑکی ہی ہوگی لیکن ہے کون ——"

"بتا دوں گا ——"

"اب کیوں نہیں بتاتا ——"

اس نے بڑی خوبصورت اور پیار بھری نظروں سے اماں کو دیکھا، ہولے سے مسکرایا اور بولا۔ "جب میری شادی کرنے کا تیرا پکا پکا

خیال ہو جائے گا نا ماں — تو خود ہی بتا دونگا ——"

ماں پوچھتی رہی کریدتی رہی لیکن وہ خوبصورتی سے ٹال گیا۔

ان دنوں وہ رابعہ کی زلف گرہ کا اسیر تھا۔ رابعہ اس کی زندگی میں غیر توقع اور اچانک آن ٹپکی تھی۔

سیاہ بالوں اور کالی کالی ہرنی جیسی آنکھوں والی یہ سانولی سلونی لڑکی اس کے دل و دماغ پر بالکل ڈرامائی انداز میں چھا گئی تھی۔

وہ ——

اک خوشبوؤں اور روشنیوں سے بھری صبح تھی۔ کھیتوں میں ہریالی تھی۔ گندم کی فصل لہلہا رہی تھی۔ کوئی کوئی کھیت سنہری ہو رہے تھے اور موتیوں جیسی گندم کے خوشے لہرا رہے تھے۔ کٹائی بھی کہیں کہیں ہو رہی تھی۔ کھیتوں میں گہما گہمی تھی۔

اکرم نہر کے پار والی زمینوں کو دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ نہر کے کنارے کنارے آموں کے درخت تھے۔ جو امبیوں سے لدے ہوئے تھے۔ ایک گھنے بیر درخت تلے گاؤں کی الہڑ مٹیاریں جمع تھیں۔ کھٹی کھٹی امبیاں توڑ توڑ کر کھانا ان کا روز کا مشغلہ تھا۔

اپنے باپوں اور بھائیوں کو روٹی اور لسی کے گڑوے دے کر ان درختوں تلے جمع ہو جاتی تھیں۔ کاغذ کی پڑیوں میں سرخ مرچ اور نمک گھر سے لے کر آتیں — ایک لڑکی اوپر چڑھ جاتی اور کچی کچی کھٹی کھٹی امبیاں توڑ کر نیچے پھینکتی۔

جب کافی امبیاں جمع ہو جاتیں تو پھر سب انہی درخت تلے بیٹھ
کر خوب چٹخارے لے لے کر امبیاں کھاتیں۔ کھٹاس اور نمک مرچ مز
تو دیتی لیکن منہ جلا کر بھی رکھ دیتی وہ سب شوں شوں کیے جاتیں لیکن
کھانے سے باز نہ آتیں۔

اس روز بھی لڑکیاں درخت تلے جمع تھیں اور ان میں سے ایک
لڑکی کچے آم توڑ توڑ کر نیچے پھینک رہی تھی۔ یہ علاقہ اکرم ہی کا تھا لڑکیا
بالیاں چوری چوری آم توڑا کرتیں تھیں۔

نیچے کھڑی لڑکیوں میں سے کسی نے اکرم کو آتے دیکھا تو بھاگتے
چیخی "دوڑو — بھاگو — وہ چودھری آ رہا ہے۔ جان کھا جائے گا
کے آم توڑ رہی ہو —"

ہلچل سی مچی اور لڑکیاں بھاگنے لگیں۔ درخت کے اوپر چڑھی
لڑکی زور سے چیخی۔

"ٹھہرو تو — مجھے بھی آ لینے دو —"

اکرم درخت کے اوپر دیکھتے ہوئے بولا۔

"کون ہو تم —؟"

"میں — میں —" لڑکی ہکلائی۔

اور —

جانے کیا ہوا — پیر جس ڈال پر رکھا وہ لچک گئی۔
دوسرے ہی لمحے لڑکی اپنی چیخ کی گونج کے ساتھ ہی نیچے آ رہی

لیکن —

وہ زمین پر نہیں گری —

گرنے سے پہلے ہی اکرم کے مضبوط بازو پھیلے اور اس نے لڑکی کو
بول سمیٹ لیا جیسے پکا ہوا پھل جھولی میں آن گرا ہو۔ لڑکی کو سمیٹنے میں دھکا
سا ضرور لگا۔ چودھری سنبھل نہ سکا وہ گرا اور لڑکی اس کے اوپر آ رہی

لیکن —

یہ ایک لمحہ کی بات تھی۔

لڑکی گھبرا کر اٹھی اور اکرم مسکراتے ہوئے۔

لیکن یہ لمحہ بڑا جاندار، بڑا خوبصورت اور بڑا پائیدار تھا اس لمحے
نے جذبات کے خفیہ سوتے جگا دیئے۔ پسند کی آنکھ کھول دی اور دل
نے دامن وا کر دیا۔

اکرم کو کالی کالی آنکھوں والی یہ لڑکی اتنی بھائی کہ وہ اسے ایک ٹک
نگارہ گیا۔

بھرے بھرے بدن کالی آنکھوں کالے بالوں والی یہ من موہنی سی
وان لڑکی اس کے سامنے لجائی شرمائی کھڑی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا —؟" اکرم نے پوچھا۔

"رابعہ —"

"کہاں رہتی ہو —؟"

رابعہ نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

"وہاں تو کئی مکان ہیں ——"

"ایک ہمارا ہے ——"

اس کی آہٹ ادا پر اکرم دل تھام کر رہ گیا۔

مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور پوچھا۔

"کس کی بیٹی ہو ——؟"

"کیوں بتاؤں ——؟" رابعہ شوخی سے اپنی حسین آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔ "میری شکایت کرنا چاہتے ہو نا۔ نہ بتاؤں گی نام ——"

اس نے اکرم کو ٹھینگا دکھایا۔ اور ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی وہاں سے بھاگ گئی۔

اکرم مسحور سا چند لمحے کھڑا رہا۔ رابعہ کے نرم و گداز جسم کا لمس اس کے بدن میں محفوظ ہو گیا۔

رابعہ کو تلاش کرنا کونسا مشکل کام تھا۔ لیکن اکرم کو تلاش کرنا ہی پڑا۔ دوسری شام وہ کھیتوں سے گھر واپس آ رہا تھا کہ پگڈنڈی پر رابعہ نظر آ گئی۔

اس نے سر پر چنگیر اور سلور کا ڈونگا رکھا ہوا تھا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ رحمت دین نے اکرم کو رک کر سلام کیا۔

"کیا حال ہے چاچا۔" اکرم نے دزدیدہ نظروں سے رابعہ کو دیکھا باپ کے پیچھے چھپی جا رہی تھی۔

"بس جی اللہ کا شکر ہے ——"

"کٹائی شروع ہو گئی تمہارے کھیتوں کی ——؟"

"بس جی —— ایک دو دن میں شروع ہو جائے گی ——"

"یہ کون ہے ——؟" اکرم نے جان بوجھ کر رابعہ کا پوچھا۔

"میری بیٹی ہے چودھری —— تمہیں نہیں پتہ اس کا ——؟" رحمت دین نے کہا۔

"چوری سے باز کر لو اسے چاچا ——"

"کیا ——؟"

"میرا آم کا پورا کا پورا درخت اس نے اور اس کی سہیلیوں نے اجاڑ دیا ہے ——"

"نہیں چاچا چودھری ایسے ہی کہہ رہا ہے دو چار امبیاں توڑی تھیں لگا الزام لگا دے —— ہونہہ ——"

رابعہ منہ بنا کر وہاں سے چلدی۔

اکرم مسکرانے لگا۔

رحمت دین بولا۔

"بڑی نٹ کھٹ سی ہے۔ برا نہ منانا چودھری میں اسے منع کر دوں گا آئندہ ہاتھ نہیں لگائے گی آموں کو ——"

"نہیں چاچا ——" اکرم جلدی سے بولا۔ "میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ لڑکیاں بالیاں کچے آموں کی شوقین ہوتی ہی ہیں۔ اسے کچھ نہ کہنا۔ ویسے آج میں نے انہیں آم توڑتے دیکھ لیا تھا تو سب ڈر کے مارے بھاگ

گئی تھیں پاگل ہیں مجھ سے ڈرنے کی کیا بات، آموں پر آپ سب لوگوں کا بھی تو حق ہے ——"

"جیو چودھری ——"

دونوں تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے پھر مخالف سمت میں چل دیئے۔ رحمت دین اکرم کا مزارع تھا۔ اس کی تھوڑی سی اپنی زمین بھی تھی۔ لیکن زیادہ تر اکرم ہی کی زمین پر کاشت کرتا تھا۔

اکرم سرشار و مخمور رہنے لگا۔ چند دنوں ہی میں رابعہ اور وہ ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ رابعہ سکھیوں سہیلیوں کو بھول کر اکرم کی ذات کے گرد ہی گھومتی رہی۔

رات اکرم مہکتی اور خنک فضاؤں میں اپنی بانسری کی لے پر دل کا درد بکھیرتا — اور رابعہ جہاں بھی ہوتی مست ناگن کی طرح جو بین کی آواز پر کھنچی چلی آتی ہے اکرم کے پاس پہنچ جاتی۔ گھنے گھنے درختوں تلے جہاں پھلوں کی خوشبو پھیلتی دونوں ایک دوسرے میں محو گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ پاگل کر دینے والی خنک چاندنی میں اونچے نیچے ٹیلوں پر رات گئے تک بیٹھے دل کی باتیں کرتے۔

بوجھل اندھیاروں میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دونوں ساتھ ساتھ ہوتے۔

اکرم رابعہ کی محبت میں ڈوبتا جا رہا تھا اسے من کی رانی بنا لیا تھا۔ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اس لئے بڑا پُر اعتماد تھا۔

لیکن ——

کبھی کبھی رابعہ خوفزدہ سی ہو جاتی۔ گھبرا کر اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیتی ——

"اکرم مجھے اسی طرح پیار کرتے رہو گے نا ——"؟

"ہاں کیوں نہیں — اس سے بھی زیادہ رابعہ — تُو تو میرے من کی رانی ہے میری جان ہے، میری زندگی ہے۔"

"لیکن ——"

"لیکن کیا ——"

"تو بڑے باپ کا بیٹا ہے اکرم۔ اتنا بڑا چودھری ہے۔"

"پھر کیا ہوا ——؟"

"میں —— میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں — تیری ماں مجھے قبول کر لے گی۔"

"دل نے قبول کر لیا ہے رابی — اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے تجھ سے دور نہیں رکھ سکتی — رہی میری ماں — تو اس کی فکر نہ کر وہ میری بات ٹالنا جانتی ہی نہیں۔ میں اس کا اکلوتا بیٹا ہوں نا۔"

رابعہ مطمئن ہو جاتی ——

لیکن ——

کبھی کبھی وسوسے اسے پریشان ضرور کر دیتے۔ مالی تفاوت تھا تقریباً پورے گاؤں کا مالک تھا اکرم۔ دھن دولت عزت وقار سب

کچھ تھا اس کے پاس۔ خوبصورت بھی تھا اور گبرو بھی تھا ــــ جب بھی رابعہ ان سب باتوں کو یکجا کرتی تو مایوسی کی سرد کر دینے والی لہر اس کے اندر ہی اندر دوڑ جاتی۔

وہ گھبرا جاتی کہ اب اکرم ہی اس کی زندگی تھا۔ اپنے پیار میں سچی اور پکی تھی وہ ــــ

دن گزر رہے تھے ہر گزرنے والا دن بندھن کی ایک اور گرہ لگا دیتا۔ دونوں ایک دوسرے میں سما جانے، کھو جانے اور ایک دوسرے کا ہو جانے کی لگن سے بے تاب ہو جاتے۔

ایک رات دونوں ایک ٹیلے کی اوٹ میں بھیگی ہوئی چاندنی میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اکرم نے رابعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اسے جذباتی انداز میں ہولے ہولے تھپتھپا رہا تھا۔ رابعہ بے سدھ سی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا سر اکرم کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور اس کی زلفوں کی گھٹا اکرم کے سینے پر بکھر گئی۔

"اکرم ــــ"

"ہوں ــــ"

"تو مجھے چھوڑ تو نہیں دے گا ــــ؟"

"کیسی باتیں کرتی ہے رابعہ ــــ"

"دل ہول کھاتا رہتا ہے ــــ"

"تیرا دل پاگل ہے ــــ جو اسے میری اٹوٹ محبت کا یقین ہی

نہیں آتا ــــ"

"آتا ہے ــــ"

"پھر ــــ؟"

"پھر ــــ" اس نے سر اٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تیرے لئے بڑے بڑے گھروں سے رشتے آ رہے ہیں ــــ"

وہ ہنس پڑا ــــ

اور اپنے مضبوط بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے اسے اپنے قریب کھینچ کر بولا۔

"رشتے آ رہے ہیں تو تجھے کیا فکر ہے"

"اکرم ــــ مذاق میں بات نہ ٹالو ــــ تم ــــ تم نے مجھے چھوڑ دیا نا۔ تو میں مر جاؤں گی۔"

"تو اکیلی نہیں مرے گی۔ رابعہ ایسا کوئی موقع آیا نا تو تیرا اکرم بھی نہیں جیئے گا۔"

رابعہ نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ایسی بات نہ کرو اکرم تم ہمیشہ جیو جگ جگ جیو ــــ"

اکرم نے شوخی سے رابعہ کی انگلی کو کاٹ لیا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچا۔ اکرم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

پھر ــــ

وہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں آج ہی بات کرونگا۔

فکر نہ کر میری رانی بہت جلد تجھے دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا"

اکرم نے اسی رات ماں سے بات کی۔ ماں ششدر سی رہ گئی۔ چودھرانی تھی۔ کئی مربعوں کا مالک بیٹا عام سی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے ناقابل قبول بات تھی۔

ماں بیٹے میں جتنے دن بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ رابعہ کی روح سولی پر چڑھی رہی۔ اکرم اسے اتنے دن ملے نہیں وہ اکیلی ہی بھیگی راتوں میں آوارہ روح کی طرح ان ان جگہوں پر منڈلاتی پھری جن جگہوں پر اس کے پیار کے نشان تھے۔

اور

پھر

جب کئی دنوں بعد اکرم اس سے ملا تو منہ لٹکائے پریشان حال تھا رابعہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دماغ چکرا رہا تھا آنکھوں میں اندھا اندھیرا پھیل گیا۔

"نہیں اکرم ـــــ" وہ اکرم کی کوئی بات سنے بغیر ہی پاگلوں کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ "میں ـــ میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہوں گی اکرم مجھے کوئی منحوس خبر نہ سنانا نہ سنانا اکرم"

وہ اکرم کے بازوؤں میں جھول گئی۔

اکرم ایکدم گھبرا گیا۔

شوخی بھول گیا۔

رابعہ کو سنانے کے لئے وہ سوانگ بھرے تھا ورنہ وہ تو آج اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری سنانے آیا تھا۔

رابعہ پر جو بیتی۔ اس نے اکرم کے دل میں محبت و پیار کے سمندر موجزن کر دیئے۔

رابعہ اسے اتنا چاہتی ہے۔ یہ بات خوشی اور مسرت کا باعث ہی تھی نا۔ اس نے بیخود ہو کر رابعہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے یوں لگا لیا جیسے اس متاعِ عزیز کو سینے میں سمو لینا چاہتا ہے۔ زمانے کی نظروں سے چھپا لینا چاہتا ہو۔ اس نے اپنی جذبات میں ڈوبی بوجھل آواز میں رابعہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"میری جان، میری زندگی، میں تم سے بچھڑ کر جی نہیں سکتا تھا کبھی ہم زندگی بھر کے لئے ایک ہو رہے ہیں رابعہ ـــ ہمیں تو کبھی موت نے بھی جدا کرنا چاہا تو ہم اس سے بھی ٹکرا جائیں گے"

رابعہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آ رہا تھا بار بار پوچھنے لگی۔

"سچ کہہ رہے ہو نا۔ تمہاری ماں مان گئی؟ میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو جاؤں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے"

دونوں بے انتہا خوش تھے۔ آنے والے حسین دنوں کے تصور میں کھو کر رہ گئے۔

پھر

پھر وہ دن آگیا جب رابعہ سونے میں پیلی لال سہاگ کا جوڑا پہن کر اکرم کی بانہوں میں سما گئی۔

اس کی زندگی میں جنت کی رعنائیاں بھر گئیں۔ نغموں کا ترنم بس گیا ہر جوان لڑکی کی طرح اس کے حسین خواب بھی یہی تھے کہ ایک جوان مرد کی مضبوط بانہوں میں جھول جائے۔ ہر طرف سے محبت اور پیار کی پھوار برسے اور سدا کی پیاسی روح جی بھر کر سیراب ہو جائے۔

اس شادی سے کئی دل ڈوب گئے۔ کئی اُمیدوار مایوسی کی ٹھنڈک میں منجمد ہو گئے۔

لیکن ——

آس لگانے والوں میں چاچے بھی تھے۔ اور رشتے دار بھی۔ شادی میں تو ہنسی خوشی شریک ہوئے۔ لیکن دلوں میں اپنی سبکی اور رسوائی میخ کی طرح گڑ گئی۔ دلہا دلہن کی خوشحالی کے لیے کسی نے چھوٹے منہ سے بھی دعا نہ کی۔

لیکن ——

اس کی پرواہ اکرم کو کب تھی۔

اور ——

رابعہ کو کیونکر ہوتی۔ ان کے تو شب و روز رنگین و حسین تھے۔ ایک دوسرے میں اس طرح کھو گئے کہ گرد و پیش کا ہوش رہا تھا نہ خبر ——

اکرم کی ماں بھی خوش تھی۔ بیٹے کی خوشی مقصود تھی۔ پھر رابعہ جیسی پرکشش اور من موہنی لڑکی دل میں اترنے کی ساری صلاحیتیں رکھتی تھی۔ رابعہ نے اکرم کی ماں کو اپنی ماں جانا۔ چند ہی دنوں میں اس نے رحیم بی بی کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ شادی کو ایک مہینہ گزرا۔

پھر دوسرا ——

اور تیسرا ——

اکرم اور رابعہ تو فردوسی رعنائیوں میں گم تھے۔ ہاں رحیم بی بی دن گننے لگی تھی۔ آس کے دیپ جلانا شروع کر دیے تھے اپنے آنگن میں ننھے منے پھول کھلنے کی تمنا بے جا بھی تو نہ تھی۔

اُس دن رابعہ کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ وہ معمول کی طرح آج صبح نہیں اٹھی۔

اکرم کام پر چلا گیا اور وہ بستر سے نہ نکلی۔ صحن میں کام کاج کرنے والی عورتیں بھی آگئی تھیں۔ اور رحیم بی بی بھی اپنے کاموں سے فارغ ہو گئی تھی۔

"آج رابعہ نہیں اٹھی ——؟" رحیم بی بی نے برکتے سے پوچھا۔

"جا کر پتہ تو کرو ——"

رابعہ بستر ہی میں تھی۔ برکتے آئی۔ "کیا بات ہے بی بی جی! اٹھنا نہیں آج ——"

"طبیعت اچھی نہیں برکتے ——"

"کیا ہوا ——؟"

"پتہ نہیں ——"

"جی خراب ہو رہا ہے ——؟"

"نہیں کمر دکھ رہی ہے۔ جسم بھی ٹوٹ رہا ہے۔ لگتا ہے پت پڑھ ہوا ہے ——"

"اے اللہ نہ کرے بی بی ——" برکتے جانے کیا سمجھ کر مسکرائی "طبیعت خراب ہوتی ہی ہے۔ تپ کیوں چڑھے گا۔"

وہ ——

مسکراتی ہوئی بڑے دالان سے باہر آئی اور رنگین پایوں والی پلنگ پر بیٹھی رحیم بی بی کے پاس زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مبارک ہو چودھرانی ——"

"کس بات کی ——؟"

برکتے آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔ "خیر سے بی بی کی طبیعت خراب ہے۔"

"اے نہیں ——"

"رب کی قسم ——"

رحیم بی بی کے چہرے پر نورانی صبح کا عکس لہرا گیا۔ خوشی سے کانپتے ہوئے جلدی سے اٹھی۔

اور ——

تیزی سے دالان میں آ گئی۔

رابعہ جمائیاں لیتے ہوئے بستر سے اٹھ رہی تھی۔ رحیم بی بی نے ہنس کر اسے دیکھا۔

"طبیعت خراب ہے۔ جی متلاتا ہے۔ کھٹا لا دوں اے بیٹی آرام سے نہ رکھنا ——"

رحیم بی بی وارے نیارے ہو رہی تھی۔

رابعہ پہلے تو کچھ سمجھی نہیں۔

لیکن ——

جب اس کی باتوں سے بات سمجھ میں آئی۔ تو شرما گئی۔ لجا کر بولی۔

"نہیں ماں جی وہ بات نہیں ہے کچھ ٹھنڈ لگ گئی ہے مجھے اس لئے جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

رحیم بی بی کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔

اس نے یقین کے لئے بار بار رابعہ سے پوچھا۔ واقعی ایسی کوئی بات نہ تھی۔

وہ مایوسی کا تاثر لئے باہر آئی تو برکتے، نوراں بیگی جمو اور دوسری رانیوں کو رابعہ کے اُمید سے ہونے کی بات پر ٹھاٹھا کر رہا تھی۔

"برکتے ——" رحیم بی بی نے اسے پکارا۔

"جی بی بی جی ——"

"کیا کہہ رہی ہے سب سے ——؟"

"جی —— بی بی کی گود ہری ہو گئی ——"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ——"

"ہائے بی بی جی ——"

"ہاں —— ویسے ہی رابعہ کی طبیعت خراب ہے" رحیم بی بی نے کہا۔

اور ——

پھر ——

یہ تماشا آئے دن ہونے لگا۔

رابعہ کبھی سست ہو جاتی، سر میں درد ہوتا، یا کوئی پیٹ کی تکلیف ہوتی۔ تو فوراً یہ قیاس لگا لیا جاتا کہ وہ اُمید سے ہے۔ لیکن ہمیشہ ہی (اُمید؟) ہوتی۔

یوں کئی ماہ گزر گئے۔

لیکن ——

رحیم بی بی کو اُمید بر نہ آئی۔ اب تو اسے تشویش نے گھیر لیا۔ ہر آنے جانے والے سے یہ بات ضرور ہوتی۔ "دعا کرو —— اللہ میرے بچے کو بچہ دے۔"

پورا ایک سال گزر گیا۔ رابعہ اور اکرم کی محبت میں کمی تو نہ آئی لیکن

جذباتی مرحلے گزر گئے۔

بے ہوش کو جیسے ہوش آیا۔ رابعہ کو احساس ہوا۔ اکرم نے محسوس کیا۔ زندگی کچھ سونی سونی ہونے لگی تھی۔ بچے کے بغیر ان کی ذاتی تکمیل ہو رہی تھی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

آنگن سونا ہی رہا۔ رحیم بی بی کا دل ڈوب گیا۔ دعائیں کر کے ہار گئی لیکن رابعہ کی گود ہری ہونے میں نہ آئی۔ اب علاج معالجے کی ضرورت تھی۔ گاؤں میں کئی سیانی دائیاں تھیں حکیم تھے۔ رحیم بی بی نے سب ہی کو آزمایا۔

لیکن

گوہر امید ہاتھ نہ آیا۔

اب تو لوگ بھی باتیں بنانے لگے تھے اور وہ لوگ جو اس شادی سے خوش نہیں تھے —— بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ رحیم بی بی یہ باتیں سنتی۔

اکرم سنتا۔

رابعہ سنتی۔

زندگی ان دنوں تلخ ہوئی جا رہی تھی۔

رحیم بی بی متفکر تھیں کہ ایک ہی .... بیٹا تھا۔ مربعوں اراضی تھی دولت کا حساب نہیں تھا۔ اگر بچہ نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ اس ساری زمین

جائیداد اور دولت کا وارث ضروری تھا ورنہ یہ سب کچھ شریک ہتھیا کر لے جائیں گے۔

اکرم اپنی جگہ سونا پن محسوس کرتا۔ ننھے منے پیارے پیارے بچے کی لگن اسے بھی تھی۔ جب وہ کام کاج سے تھکا ہارا گھر لوٹتے تو منے سے بچے کی تلقاریاں اس کی تکان کو دور کر دیں۔

رابعہ ان سب سے زیادہ متفکر تھی۔ بچہ نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ یہ بھرپور آسائش زندگی درہم برہم ہو سکتی تھی۔ اکرم بھی اس سے بچھڑ سکتا تھا لیکن

وہ یہ تو تصور بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اکرم کے بغیر وہ تھی ہی کیا۔ اس کے بغیر جینا تو ایک طرف وہ سانس بھی نہ لے سکتی تھی۔

علاج معالجے میں نہ رحیم بی بی نے کسر چھوڑی نہ ہی رابعہ نے۔

رحیم بی بی اسے جہاں بھی لے گئی۔ اس نے علاج کروانے سے انکار نہیں کیا۔ حکیموں دائیوں کے علاج کے علاوہ تعویذ گنڈوں سے بھی گریز نہ کیا۔

ایک سال گزرا۔

پھر دوسرا ——

اور تیسرا بھی گزر گیا۔

اب تو تشویش حق بجانب تھی۔ یہ تشویش رابعہ کی صحت پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔ لوگوں کی باتیں وہ بھی سنتی تھی۔ اکرم کے چچا اور تا

نش تھے۔

اس دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ماں صحن میں تھی۔ ارد گرد بیٹھی دکرانیاں اسے لوگوں کی باتیں بتا رہی تھیں۔ اور وہ ٹھنڈی آہیں بھر بھر رہی تھی۔

"نظر ہی کھا گئی لوگوں کی۔ سونا آنگن آباد نہیں ہوا۔ کیا بنے گا؟"

رابعہ کا ہول گیا۔ وہ چپ چپ کر رویا کرتی تھی۔ خدا سے دعائیں مانگا کرتی تھی۔ آج بھی اس کا دل بھر آیا۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔

رات اکرم آیا۔

رابعہ کی سرخ و متورم آنکھیں دیکھیں تو گھبرا گیا۔

"کیا ہوا ——؟"

"کچھ نہیں ——"

"کسی نے کچھ کہہ دیا؟"

"نہیں ——"

"ماں سے تو جھگڑا نہیں ہوا؟"

"ایسی بات مت کہو اکرم۔"

"پھر رونی کیوں ہو ——؟"

وہ پھر رونے لگی۔

اکرم کی چھاتی پر سر رکھ کر وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ اسے چمکارتا پاؤ چھتا رہا۔

"بتاؤ نا ـــــ رابعہ کیوں رو رہی ہو۔ کوئی بات بھی ہو"

"اکرم ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"ہمارا بچہ نہ ہوا ـــــ تو ـــــ تو تم دوسری شادی ....."

"رابعہ ـــــ خدا ہمیں ضرور بچہ دے گا"

"لوگ بڑی باتیں کرتے ہیں"

"شریک ہیں کریں گے ہی۔ ہماری زمین پر ان کی نظریں ہیں۔ لیکن ان کے منہ میں خاک۔ خدا ان زمینوں کا وارث ضرور دے گا"

اس نے رابعہ کو پیار کیا۔ یقین دلایا کہ وہ ایسا ظلم کبھی نہیں کرے گا۔ رابعہ اس کی زندگی ہے ـــــ اور وہ اس زندگی سے منہ موڑ کر جی نہیں سکتا۔

ایک سال اور بیت گیا۔

اب تو رحیم بی بی کا صبر بھی جواب دے گیا۔ دوائیں اور دعائیں کارگر نہ ہو رہی تھیں۔

منتیں مانی تھیں۔ تعویذ گنڈے کیے تھے۔ پیروں فقیروں کے آستانوں کی خاک چھانی تھی۔

ایک دن وہ اکرم سے بولی۔ "رابعہ کو شہر لے جاؤ۔ کسی ڈاکٹر کو دکھا کر علاج کروائیں"

"ہاں ماں ـــــ تم شہر لے جاؤ۔ وہاں کہتے ہیں ایسے ڈاکٹر زنانہ

بانجھ عورتوں کا علاج کرتی ہیں"

"ٹھیک ہے لے جاؤں گی"

وہ رابعہ کو شہر لے گئی۔

اکرم کے تایا زاد شہر میں رہتے تھے۔ انہی کے ہاں دونوں ٹھہریں۔ تایا کی بہو عاصمہ پڑھی لکھی عورت تھی۔ وہ رابعہ کو ایک مشہور اور قابل گائنا کالوجسٹ کے پاس لے گئی۔

اس نے رابعہ کا معائنہ کیا۔ سارا چیک اپ ہوا۔ رپورٹ حوصلہ افزا تھی۔ اس نے عاصمہ سے کہا۔ "یہ ٹھیک ٹھاک ہیں بچہ پیدا کر سکتی ہیں۔ کوئی نقص نہیں"

"پھر چار سال ہو گئے ہیں ڈاکٹر" عاصمہ نے کہا۔

"میرے خیال میں تو انہیں کسی علاج کی ضرورت ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے آدمی میں کوئی نقص ہو۔ ان کا چیک اپ بھی ہونا چاہیئے"

عاصمہ نے دو ایک اور ڈاکٹروں کو بھی دکھایا۔

سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ رابعہ میں کوئی نقص نہیں۔ بہتر ہے کہ اس کا شوہر بھی اپنا چیک اپ کروا لے۔

عاصمہ نے یہ بات رحیم بی بی سے کہی تو وہ بھڑک اٹھیں۔ "میرا بیٹا ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایسا صحت مند اور گبرو جوان ہے۔ ڈاکٹرنیاں بکواس کرتی ہیں"

وہ رابعہ کو لے کر واپس آ گئی۔

اکرم کا ردِ عمل بھی ماں کا سا تھا۔ دونوں بھڑک اٹھے تھے۔ ڈاکٹروں کو بُرا بھلا کہا۔ عاصمہ کو گالیاں دیں۔ رابعہ کو بھی نہ چھوڑا۔ اکرم غصے میں بھر کر اس سے بولا۔

"یہ بات دل میں نہ بٹھا لینا عاصمہ کونسی ہماری سگی ہے یا ہماری بھلائی چاہنے والوں میں سے ہے۔ اس نے یہ نیا شوشہ چھیڑا ہے وہ تو سب یہی چاہتے ہیں کہ میں بے اولاد ہی رہوں۔ بے اولاد مروں اور یہ میری زمینوں جائیداد اور دولت پر قابض ہو جائیں۔ نقص تم ہی میں ہے، تمہاری وجہ سے میں بے اولاد ہوں۔"

ماں بیٹے کی شہ پر بولی۔

"تو کیوں بے اولاد رہے اور ان ڈاکٹروں کے منہ میں خاک، میں تیرا گھر پھر سے آباد کروں گی۔ تجھے خدا چاند سا بیٹا دے گا۔"

رابعہ کا دل ڈوب گیا۔ رونے دھونے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی اسے اکرم سے توقع نہ تھی۔

ماں کی بات کو اس نے ردّ نہیں کیا تھا۔

رابعہ کی دنیا جیسے اندھیر ہو گئی۔ دن رات مایوسیوں میں گھری سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی، کیا ہرج تھا اگر اکرم بھی کسی ڈاکٹر سے معائنہ کروا لیتا؟

لیکن

ایسی بات وہ منہ سے نہ نکال سکتی تھی۔

زندگی موسم اور رتوں کی طرح بدل رہی تھی۔ آنگن ویران تھا۔ یہ ویرانی سب کے اندر اتر رہی تھی۔

اکرم اب بے حد چڑچڑا رہنے لگا تھا۔ کڑواہٹ رحیم بی بی کے لہجے میں بھی کھل رہی تھی۔

سارا بار سارا عذاب رابعہ پر نازل ہو رہا تھا۔ بے چاری چکّی کے پاٹوں میں آ گئی تھی۔ اندر ہی اندر گھلنے لگی تھی۔ کچھ بھی تو سمجھ نہ پاتی کہ کرے تو کیا کرے۔

فرد سی رعنائیوں سے بھرپور ازدواجی زندگی کہاں گم ہو گئی تھی۔ اکرم بھی تو کہیں کھو گیا تھا۔ اس کے دم کے ساتھ دم دینے والا اکرم اب الجھا ہوا چڑچڑا اور اکھڑا اکھڑا بن گیا تھا۔

کبھی

کبھی اکرم کا موڈ ٹھیک ہوتا تو رابعہ اس کی چھاتی پر سر رکھ کر بے اختیار .... رو دیتی۔ بے چارگی سے کہتی۔

"میرا کیا قصور ہے اکرم۔ کیا میں بھی نہیں چاہتی کہ میری آغوش میں پھول مہکیں، میری بانہوں میں ننھا منا وجود جھولے۔ میری دنیا آباد ہو۔ میرے کانوں میں منے منے قہقہے گونجیں، چیں چیں اور ریں ریں کی آوازیں اتریں۔ تم کیا جانو اکرم کہ میرے سونے پن سے مجھ پر کیا بیتتی ہے۔"

اکرم کبھی کبھی اسے سرسری سی تسلی دے دیتا۔

اور

کبھی
منہ موڑ کر پڑ رہتا۔
رابعہ کی اب رحیم بی بی کو پرواہ نہ تھی۔ چھٹا سال شروع ہو چکا تھا
ہر طرف دوڑ دھوپ کر چکی تھی۔ اب چارہ یہی رہ گیا تھا کہ اولاد کی خاطر اکرم
کی دوسری شادی کر دے۔
لڑکی ڈھونڈنے کی ایسی ضرورت بھی نہ تھی۔ اچھے اچھے لوگ اور
بڑے گھروں کی آس اب بھی اکرم سے بندھی تھی۔ رابعہ تو اب مایوسی
کے اتھاہ ساگر میں ڈوب چکی تھی۔
اب تو آنکھوں کے آنسو بھی سوکھ چکے تھے۔ سب کچھ دیکھ رہی
تھی۔ لیکن کر کچھ نہ سکتی تھی۔ کرتی بھی کس برتے پر۔ ہاں کبھی کبھی
ڈاکٹروں کی باتوں کو چیخ چیخ کر سب کو سنانے کے لئے دل ضرور
تڑپ اٹھتا۔
انہی دنوں جب ماں شادی کے لئے بیٹے کو ذہنی طور پر آمادہ
رہی تھی۔
اکرم بھی کچھ کچھ رضامند ہو گیا تھا۔
برکتے کہیں سے آس کے چراغ لے آئی۔ اس نے
بی بی سے کہا۔
"چودھرانی ۔ جہاں اتنا معالجہ کیا ہے۔ ایک در اور بھی
لے ——؟

"کونسا ——؟"
"یہاں سے سترہ کوس میلانی گاؤں ہے چھوٹا سا ۔ وہاں ایک
بزرگ صاحب ہیں بی بی۔ جو بھی اس در پر گیا خالی ہاتھ نہیں آیا۔ کرامتوں والے
بزرگ مشہور ہیں۔"
"مجھے وہاں لے چلو ۔ برکتے مجھے وہاں لے چلو۔"
رحیم بی بی کے کچھ کہنے سے پہلے رابعہ بول اٹھی۔ "میں جاؤں
وہاں۔"
رحیم بی بی سہج سے بولی۔ "کہاں کہاں ٹکریں نہیں ماریں برکتے۔"
"ایک در اور سہی ۔ چودھرانی وہاں سے تو بارہ بارہ پندرہ پندرہ سال
بانجھ عورتوں کی گود ہری ہوئی ہے۔"
"سب ایسا ہی کہتے ہیں۔" رحیم بی بی بولی۔
"نہیں بی بی۔ صغریٰ نے مجھے بتایا ہے اس گاؤں کی ایک عورت
کے تیرہ سال بعد بچہ ہوا ہے۔ چودھری ہیں وہ بھی۔ صغراں خود دیکھ کر
آئی ہے وہ بچہ۔"
"یقین نہیں آتا۔"
"وہ لوگ بھی مایوس ہو چکے تھے بی بی اور ہمارے چودھری کی
طرح ان پر ہر طرح کی اللہ کی رحمت تھی۔ وارث نہیں تھا بس۔ خدا نے
تیرہ سال بعد بچہ دیا ہے۔ صغراں اس چودھرانی کو خود دیکھ کر آئی ہے۔"
"ہوں"

"برکتے ۔ میں وہاں جاؤں گی ۔۔۔" رابعہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"دیکھ لیتے ہیں" رحیم بی بی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بی بی ۔ وہاں سے ضرور مراد ملے گی ۔ صغراں بتا رہی تھی کئی بانجھ عورتوں نے وہاں سے مراد پائی ہے۔ اس کے گاؤں کی چودھرنی کی مثال تو سامنے ہے ۔ کرامتوں والے پیر کا بڑا چرچا ہے چودھرانی آزماؤ تو سہی"

آس کے دیپ ایک بار پھر لو دینے لگے۔ رابعہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہی تھی ۔ ایک بار پھر سنبھل گئی۔

جانے اسے کیوں یقین سا ہو گیا کہ وہ گوہر مراد پائے گی ۔ اس کے آنگن میں پھول کھلیں گے ۔ اور وہ جائیداد کا وارث چودھری اکرم کو ضرور دے گی"

رحیم بی بی برکتے کی باتوں سے سوچ میں پڑ گئی۔ برکتے اسے یقین دلانے کے لئے صغریٰ کو بلا لائی۔

صغراں نے رحیم بی بی کو سارا واقعہ سنایا۔

"میں خود اس سے ملوں گی" رحیم بی بی بولی۔

دوسرے دن رحیم بی بی ۔ برکتے ۔ صغراں اور فضل دین ماچھی کو ساتھ لے کر اس گاؤں گئی۔

برکتے کی بات سچ تھی ۔

اس چودھرانی کا بھی انہی لوگوں کا سا واقعہ تھا۔ حکیموں ویدوں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اس کے خاوند کے متعلق بھی ڈاکٹروں نے ایسی ہی باتیں کی تھیں۔

لیکن ۔۔۔

تیرہ سال بعد اس کی گود ہری ہو گئی تھی یہ اس پیر جی کے دم دعا کا اثر تھا۔ کرامتوں والے کی۔

رحیم بی بی گھر لوٹی تو بے حد خوش تھی۔ اُمید کا روشن اور چمکتا دمکتا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔

آتے ہی اس نے رابعہ کو گلے سے لگا لیا ۔۔۔ اور پیار کرتے ہوئے بولی۔

"بالکل ہمارے ہی والا معاملہ تھا ان کا۔ ایک اکیلا بچہ اور کئی مربعے زمین ۔ خدا نے اسے وارث دے ہی دیا چل تو تیار ہو جا۔ ہم کل ہی روانہ ہو جائیں گے"

رابعہ کی آنکھیں خوشی سے بھر آئیں۔

شام اکرم سے ماں نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

وہ ۔۔۔

رابعہ سے کچھ شرمندہ سا ہوا۔

سر جھکاتے ہوئے بولا۔ "تیری مرضی ہے ماں۔ لے جا اسے پیر جی کے پاس۔ شاید ہمارے گھر میں بھی اُجالا ہو جائے۔ کرامتوں

والے پیر جی عنایت ہم پر بھی ہو ہی جائے۔ ہمارا سونا گھر بھی شاید آباد ہو جائے۔"

"ضرور ہوگا میرے بچے ضرور ہوگا ——— میرا دل گواہی دے رہا ہے۔"

"تو پھر کب لے جاؤ گی اسے؟"

"کل صبح سویرے یہاں سے چل دیں گے۔"

"کتنی دور ہے گاؤں؟"

"سترہ میل۔ میلانی نام کا کوئی چھوٹا سا گاؤں ہے ———" ماں نے بتایا۔

"کیسے جاؤ گی ———؟"

"بڑی سڑک تک تانگے میں۔ وہاں سے بس ملے گی۔ برکتے ساتھ ہوگی اور اس چودھری کو آدمی بھی ساتھ ہوگا۔ چودھرانی نے کہہ دیا تھا اس سے سہولت ہو جائے گی وہاں تک پہنچنے میں۔ پیدل بھی چلنا پڑا تو کوئی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے ———"

اس رات اکرم پہلے والا اکرم تھا۔

رابعہ کی ہر بات پر مسکرا مسکرا کر محبت سے اسے دیکھ رہا تھا خوب پیار کر رہا تھا۔

یہ تبدیلی گو خوشگوار تھی۔

لیکن ———

رابعہ کا من خوش نہیں تھا۔

اکرم نے رویہ بدل کر اس سے جو زیادتی کی تھی۔ اس کا زخم دل میں ما، وہ سوچ رہی تھی۔

کہ ———

بچہ ہی سب کچھ ہے۔ وہ بذاتِ خود کچھ نہیں۔ اکرم کی وہ محبت ش اور جولانی مٹ کیوں گئی تھی۔ اس سونے سمندر میں پھر اس لئے ل رہا تھا کہ بچے کی امید بندھ گئی ہے۔

اکرم اسے پیار کر رہا تھا۔

اور ———

وہ دل ہی دل میں نفرت کے تنومند ریلے محسوس کر رہی تھی۔ ہ جو اس کا محبوب تھا۔ اس کی زندگی تھا۔ اس کا پیار تھا اس وقت سے دنیا کی ذلیل ترین مخلوق لگ رہا تھا۔

یہی اکرم تھا نا ——— جو دوسری شادی کرنے پر تیار ہو رہا تھا۔ ل کا جی چاہا پیار کے بدلے میں اپنی نفرتوں کا کھولتا لاوا اس پر گل دے۔

لیکن ———

وہ چپ رہی ———

دوسرے دن رحیم بی بی، برکتے، فضل دین اور رابعہ چودھرانی

کے بھیجے ہوئے آدمی کی رہنمائی میں منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں تھے۔

اور

آج

گھر میں رونقیں اتر آئی تھیں، خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، رحیم بی بی کا پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہا تھا۔

اکرم کا سینہ فخر سے تن گیا تھا۔

ماں نے آج دیگ پکوائی تھی۔ منتیں تو اس نے خدا جانے کہاں کہاں کی مان رکھی تھیں۔

چڑھاوے کس کس جگہ چڑھائے تھے۔ کرامتوں والے پیر جی کی نذر کیا کچھ کرنا تھا۔ یہ میٹھی دیگ تو اس نے یہ خوشخبری سُن کر پکوائی تھی کہ رابعہ اُمید سے ہے۔

کچھ دن اوپر چلے گئے ہیں۔

آج صبح وہ ابکائیاں بھی تو کر رہی تھی۔ کل ہی نوا سے پتہ چلا تھا کہ رابعہ اُمید سے ہے۔

صحن میں نوکرانیوں نے شور و غل مچا رکھا تھا چودھرانی کو بڑھ بڑھ کر مبارکیں دے رہی تھیں۔

کوئی کہہ رہی تھی "بی بی پوتا ہوگا تو میں سونے کے کنگن لوں گی۔"

کوئی کہہ رہی تھی، "میں تو اس خوشخبری پر بالے لوں گی، نیا جوڑا تو میرا حق ہے ہی۔ اللہ نے پوتا دیا تو میرا منہ سونے موتی سے بھروگی بی بی۔"

رحیم بی بی خوشی سے باؤلی ہو رہی تھی۔ ہر ایک سے وعدہ کر رہی تھی۔

"کرامتوں والے پیر نے یہ دن دکھایا ہے، خدا خیر رکھے، پوتا ہوا تو جھولیاں بھر بھر کر دھن لٹاؤں گی۔"

"اے تیری خیر ہو چودھرانی، جگ جگ جیو، خوشیاں دیکھو، سات پوتوں کا منہ دھوؤ۔"

رحیم بی بی کھلکھلا کر ہنس پڑی بولی۔ "اے ابھی ایک تو ہونے دو، ایک ہی کی خوشی نہیں سنبھل پا رہی مجھ سے۔ اسے کرامتوں والے پیر یہ کرامت دکھائی ہے۔ اب خیر خیریت سے وقت بھی گزارنا اور چاند سا پوتا بھی میری جھولی میں ڈالنا۔"

رحیم بی بی آنکھیں بند کر کے دامن پھیلائے کہہ رہی تھی۔

رابعہ سب کچھ سن رہی تھی۔

وہ گم صم تھی۔

چپ تھی۔

برکتے اسے دیر سے دبا رہی تھی۔ اس نے ایک بات بھی برکتے سے نہ کی تھی۔

باہر صحن میں ہنسی مذاق اور شور و غل ہو رہا تھا۔

برکتے بولی۔

"رابعہ بی بی۔ آپ چپ کیوں ہیں۔ اتنی بڑی خوشی کرامتوں والے پیر کی دعا سے آپ کو ملی ہے۔"

"ہاں" رابعہ جیسے خواب میں بولی۔ "کرامتوں والے پیر نے۔ کرامت دکھائی ہے۔"

"بالکل جی۔ بالکل۔ اسی لئے تو کہتی ہوں۔ آپ بھی ہنسیں بولیں۔"

"نہیں۔ میں چپ رہوں گی۔" وہ جیسے کہیں دور سے بول رہی تھی۔

"کیا؟" برکتے آگے ہو کر بولی۔

"میں چپ رہوں گی" رابعہ نے دھیمی آواز میں یہ الفاظ دہرائے برکتے کو یوں لگا جیسے یہ رابعہ نہیں کوئی اور بول رہا ہو۔

"رابعہ بی بی۔" برکتے نے اس کا پاؤں زور سے ہلا کر آواز دی

لیکن

وہ چپ رہی۔

وہ چپ تھی۔

اور

اسے چپ رہنا تھا۔

کرامتوں والے پیر نے اپنے نیم تاریک حجرے میں کرامت دکھانے کے بعد جب اسے باہر جانے کی اجازت دی تھی۔ تو گرج کر کہا۔

"تجھے چپ رہنا ہوگا۔ کسی کو کچھ بتایا تو تباہ و برباد ہو جائے گی بول۔ کہ میں چپ رہوں گی۔"

اس وقت اس کی حالت معمول کی سی تھی۔ جو عامل کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ اس نے کہہ دیا تھا۔

"میں چپ رہوں گی۔"

اب اس کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے۔ کبھی آتش فشاں سے پھٹنے لگے۔ کبھی برفانی ٹھنڈک پھیل جاتی۔

اُس کا ضمیر چیخ رہا تھا۔ وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔

لیکن

تباہ و برباد ہونے کا خوف چپ رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

وہ

چپ

تھی۔

یوں بھی ہوتا ہے

ڈرائنگ روم میں آٹھ دس عورتیں صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھی باتیں
کر رہی تھیں۔ مسز اشرف نے اپنی دوستوں اور ملنے والیوں کو چائے
پر بلایا تھا کبھی کبھی وہ پر تکلف سی چائے کیا کرتی تھیں۔ ایک دوسرے
سے ملنے گپ شپ لگانے اور رابطہ پیدا کرنے کے لئے یہ
بڑا مہذب اور خوبصورت طریقہ تھا۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور
اسی وجہ سے وہ کافی مقبول و معروف بھی تھیں۔
کبھی کبھی یہ ٹی پارٹی وہ کسی خاص مقصد کے لئے بھی کیا
کرتی تھیں ——
آج بھی چائے خاص مقصد کے لئے ہی تھی ——
پچھلے ہفتے وہ صائمہ امجد سے ملی تھیں۔ صائمہ ان کے
والوں میں سے تھی۔ اچھی گپ شپ تھی۔

صائمہ نے باتوں کے دوران کہا تھا۔ "مسز اشرف! کوئی اچھی سی
لڑکی ہے آپ کی نظر میں ——؟"
"کیوں ——؟"
"چاہیئے ——"!
"تمہارا مطلب ملازمہ سے ہے ——"
"ہائے نہیں مسز اشرف ——"
صائمہ ہنس پڑی —— اس کا خوبصورت چہرہ گلگوں ہو گیا اور
چمکتی آنکھیں کچھ اور چمک اٹھیں۔ مسز اشرف کی بات سے وہ چند
لمحے لطف اندوز ہوتی رہی۔
پچیس چھبیس سالہ خوبصورت اور ہنس مکھ صائمہ کو ان دنوں اپنے
دیور کے لئے لڑکی ڈھونڈنے کا خبط ہو رہا تھا۔ جہاں جاتی، جس سے
ملتی اچھی سی لڑکی کا ذکر ضرور ہونے لگتا۔ صائمہ کی شادی کو تین سال
ہو چکے تھے۔
ایم اے کے بعد ایک سال تک لیکچرر رہی تھیں۔ پھر امجد
سے شادی ہو گئی —— امجد کا کاروبار خاصا وسیع تھا۔ اس لئے
نوکرانی کی ضرورت نہ رہی تھی۔
ساجد امجد سے تین سال چھوٹا تھا۔ دو ہی بھائی تھے آپس
میں بہت پیار تھا ——
صائمہ فطرتاً اچھی تھی۔ پڑھی لکھی اور سمجھدار بھی۔ اس لئے ساجد

سے سلوک بھائیوں کا سا تھا وہ بھی بھابی پر فدا تھا۔ شادی کے لئے بھی وہ ماں اور بہنوں سے زیادہ صائمہ پر اعتماد کرتا تھا۔

اسی لئے صائمہ لڑکی تلاش کر رہی تھی۔

"مسز اشرف ——— ! مجھے ملازمہ کی نہیں ——— دیورانی کی ضرورت ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

تو ———

مسز اشرف بھی ہنس پڑیں ———

"کوئی اچھی سی لڑکی ہو ——— اچھے گھرانے کی ———؟" اس نے کہا ———

"ہوں ———"

"ہے کوئی آپ کی نظر میں ———؟"

"ہیں تو دو چار ——— بلکہ ان کی ماؤں اور گھر والوں نے مجھے کہہ رکھا ہے ———"

"تو پھر تعارف کرا دیں نا ———؟"

"ضرور ——— ضرور ——— ویسے تمہارے دیور کی تعلیم کیا ہے اور کرتا کیا ہے؟"

"ایم اے میں چھوڑ دیا تھا ——— امجد نے کاروبار میں ساتھ ہی لگا لیا۔ دونوں بھائیوں کا اکٹھا ہی کام ہے اور آپ کو معلوم ہے ہی کہ خاندانی اچھا کاروبار ہے۔"

"ہوں ———"

"کام چونکہ اکٹھا ہے اس لئے رہنا بھی اکٹھا ہوگا ——— اسی لئے میں چاہتی ہوں ——— کوئی اصیل و شریف لڑکی ملے ——— بنا کر سکے۔" وہ بولی ———

"بالکل بالکل ——— تمہاری ساس بھی تو ہیں ———"

"ہاں ——— مجھ سے تو بہت خوش ہیں۔ دوسری بہو بھی مجھ ایسی ہی چاہتی ہیں۔ ویسے میری ساس خود بھی بہت اچھی ہیں۔"

"تمہارے دیور کی عمر کیا ہوگی ———؟"

"یہی کوئی چوبیس سال ——— مجھ سے چھوٹا ہے ویسے ہے بہت اچھا۔ کوئی عیب نہیں اس میں۔ جو لڑکی اس کی شریک حیات بنے گی، عیش کرے گی۔"

"تمہارا میاں بھی تو بہت اچھا ہے ———؟"

"بہت نہیں مسز اشرف، بہت بہت بہت ہی اچھا ———" صائمہ بولی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— اس کی ہنسی میں خوشی اطمینان اور اعتماد تھا ———

مسز اشرف نے صائمہ کو ان لڑکیوں اور ان کی ماؤں سے ملنے کا وعدہ کیا ——— "میں سب کو چائے پر بلا لوں گی۔ تم مل لینا جو دل لگے مجھے بتا دینا ———"

"ٹھیک ہے ——"

مسز اشرف نے چائے پر ان سب کو بلایا ——

صائمہ بھی آگئی ——

صوفیہ نوید، فائزہ افضل، نورینہ جمیل اور راحیلہ سعید بھی مدعو تھیں چاروں اسمارٹ اور خوش حلق لڑکیاں تھیں اور سچی بات تو یہ کہ صائمہ کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ نظر انتخاب کس پر ڈالے۔

صوفیہ سرخ و سپید، نیلی آنکھوں والی باتونی سی لڑکی تھی، ایسی لڑکیاں صائمہ کی کمزوری تھی۔

فائزہ متین و سنجیدہ —— لیکن بے حد پرکشش تھی، خاندان بھی اچھا تھا ——

نورینہ کی آواز تو جیسے نقرئی گھنٹیوں جیسی تھی، سادگی میں ہر کاری تھی، بہت اچھی لگ رہی تھی ——

راحیلہ ریشمی ریشمی گلابی لچھوں ایسے جسم والی سبک سے ناک نقشے کی لڑکی تھی ——

کچھ دیر سب عورتیں اور لڑکیاں ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ مسز اشرف نے نئے لوگوں کا آپس میں تعارف کرایا صائمہ سب سے بڑے تپاک سے ملی۔

چائے کے بعد بھی کچھ دیر عورتیں گپ شپ میں مصروف رہیں۔ صائمہ کو چاروں لڑکیوں سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ وہ کسی سے

مرغوب ہوئی کسی سے متاثر ——

صائمہ مسز اشرف کے پاس ہی رک گئی۔ سب مہمان چلے گئے۔ تو صائمہ نے ہنس کر مسز اشرف سے کہا۔

"آپ نے تو مجھے پزل کر دیا ہے ——"

"کیوں ——؟"

"سمجھ نہیں آتی کہ کس کا انتخاب کروں —— سبھی اتنی اچھی اور پیاری لڑکیاں ہیں ——"

"ٹھیک ہے —— لیکن میں کہوں گی تمہارے لئے راحیلہ موزوں رہے گی ——"

"صوفیہ کیوں نہیں ——؟"

"وہ بہت تیز ہے۔ ساس نندوں والے گھروں میں اتنی تیز لڑکیاں اچھی نہیں رہتیں ——"

"یہ بات تو ٹھیک کہی آپ نے ——"

"نورینہ بھی اچھی ہے —— لیکن —— اس کی ماں بہت ہوشیار عورت ہے ——"

صائمہ پھر ہنس پڑی ——

مسز اشرف بولی۔ "ویسے تو جسے تم پسند کرو گی بات کروا دوں گی۔ میرا اپنا خیال ہے۔ راحیلہ اچھی رہے گی۔"

"مجھے تو فائزہ بھی بہت اچھی لگتی ہے۔"

"ٹھیک ہے ـــــ ہاں وہ بھی اچھی رہے گی۔ اس بے چاری کی ماں نہیں ہے۔ باپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔" مسز اشرف فائزہ کے متعلق تفصیل سے بتانے لگی۔

صائمہ کو فائزہ کے متعلق حالات سن کر ہمدردی سی ہوئی اپنے گھریلو حالات کے لحاظ سے بھی یہ لڑکی موزوں لگی۔

"ٹھیک ہے مسز اشرف ـــــ!" صائمہ نے کہا "میں امجد ساجد اور امی سے بات کر لوں۔ پھر آپ ہماری مدد کیجئے گا۔"

"ضرور ضرور ـــــ"

"اللہ ـــــ امجد اتنی اچھی لڑکی ہے فائزہ کیا بتاؤں ـــــ؟"

"تم سے اچھی یقیناً نہیں ہوگی ـــــ"

"آپ تو بات مذاق میں ٹال دیتے ہیں۔"

"تو پھر اور کیا کروں ـــــ؟ مجھ سے کیا پوچھتی ہو ـــــ ساجد سے پوچھو یا امی سے ـــــ میرا کیا ہے ـــــ؟ جو لڑکی بھی لے آؤ گی۔ ٹھیک رہے گی۔"

"امی رضامند ہیں ـــــ"

"اور ساجد ـــــ؟"

"کہتا ہے پہلے دیکھوں گا اسے ـــــ"

"ہرج کیا ہے ـــــ دکھا دو ـــــ لڑکی پردہ تھوڑا ہی کرتی ہوگی۔"

"نہیں ـــــ پردہ تو نہیں کرتی ـــــ"

"پھر دکھا دینے میں ہرج کیا ہے؟ تمہاری پسند اتنی بری بھی نہیں کہ ساجد انکار کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بندوبست کرتی ہوں۔"

"کیا کرو گی ـــــ؟"

"چائے پر بلا لوں گی، چند لوگوں کو ـــــ"

"ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ـــــ"

"ساجد اسے ضرور پسند کرے گا۔ بڑی پیاری لڑکی ہے ماں بھی نہیں بے چاری کی۔ سچی بات پوچھو نا امجد، تو میں نے اس لڑکی کو ساجد کے لئے منتخب ہی اسی ہمدردی کی بنا پر کیا ہے۔ سوتیلی ماں ہے بے چاری کی زندگی تلخ تو ضرور ہوگی۔"

"تم اسے دیورانی بنا کر تلخی کو شیرینی میں بدلنا چاہتی ہو ـــــ" امجد نے کہا۔

"بالکل بالکل۔ خدا کرے وہ اس گھر کی بہو بنے۔ اس کی زندگی خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بن جائے۔"

"آمین ـــــ!"

چائے پر چند عورتیں آئی تھیں ان میں فائزہ بھی تھی۔ مسز اشرف کے ساتھ وہ بھی آئی تھی ـــ

فائزہ اس بات سے بے خبر تھی کہ آج اس کی زندگی کا خوبصورت موڑ سامنے ہے اور یہاں سے وہ ازدواجی زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھنے والی ہے وہ صائمہ کے ساتھ اب بے تکلف تھی اور بڑی خوبصورتی اور وقار سے باتیں کر رہی تھی۔

ساجد نے اسے مسز اشرف کی گاڑی سے نکلتے ہی دیکھا تھا۔ تو پسند کر لیا تھا۔ متوازن اور مقناطیسی کشش رکھنے والے نقش و نگار کی یہ لڑکی پہلی نظر ہی میں دل میں اتر گئی۔

ڈرائنگ روم میں بھی وہ دو تین دفعہ آیا۔ اور چائے کے بعد جب مسز اشرف اور فائزہ، صائمہ کے رکنے پر اکیلی رہ گئیں تو امجد اور ساجد بھی اندر آ گئے۔

پھر گھنٹہ گپ شپ رہی ——

فائزہ بڑے اعتماد سے بیٹھی رہی۔ پرکشش پروقار سی لڑکی ساجد کو پسند آئی ——

امجد کو بھی موزوں لگی ——

دونوں نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ امی کا فیصلہ تو صائمہ کے حق میں تھا۔

لہٰذا ——

کوئی دقت نہ رہی ——

صائمہ خوشی خوشی دوڑ دھوپ میں لگ گئی۔

دو تین پھیرے ہی فائزہ کے ہاں ڈالے اور گوہر مقصود مل گیا وہ منگنی کی تیاریوں میں لگ گئی

روپے پیسے کی کمی نہ تھی اور پھر جو کچھ تھا۔ دونوں بھائیوں ہی کا تھا۔ دونوں نندیں تو اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں — ساس تھی۔ تو وہ بھی صائمہ کا شوق اور خوشی دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ صائمہ اس کے بیٹے ہی کے لئے سب کچھ کر رہی تھی — اپنے بھائی کے لئے کرتی تو شاید اسے گراں بھی گزرتا۔ ساس ہے نا —

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ صائمہ کی دوڑ دھوپ ولولہ اور چاہت دیکھ کر اس کے بلند کردار کا پتہ چلتا تھا۔ وہ تو یوں چاؤ پورے کر رہی تھی جیسے دیور نہیں بیٹے کو بیاہنے جا رہی ہو — کون سا شگن تھا جو اس نے نہیں کیا — کونسا ارمان تھا جو اس نے نہیں نکالا۔

کپڑے اتنے خوبصورت بنوائے فائزہ کے لئے کہ جس نے دیکھے واہ واہ کر اٹھا۔ زیور بھی حیثیت سے کچھ زیادہ ہی بنوائے امجد زیادہ آخراجات کرنے کا قائل نہیں تھا یوں بھی کاروبار سے روپیہ نکال نکال کر اس انداز سے خرچ کرنا اس کے نزدیک بے مصرف ہی تھا۔

لیکن ——

صائمہ نے تو لڑ جھگڑ کر بھی اس سے پیسہ لینا پڑا تو لیا۔

"ایک ہی ... تو بھائی ہے آپ کا" وہ کہتی۔ "باپ بھی نہیں آپ کو تو اس کا باپ بن کر سوچنا چاہیئے۔ ہماری شادی ابا مرحوم نے ایسے ہی کر دی تھی کیا؟"

"ایسے تو تم ساجد کی بھی نہیں کر سکتیں —— لیکن تھوڑا سا ہاتھ کھینچنا چاہیئے۔"

"نہیں —— میں تو ہر شوق پورا کروں گی۔"

امجد صائمہ کی طرف پیار سے دیکھتا —— کوئی بھابی اس نے اس جیسی نہیں دیکھی تھی۔ اسے ساجد سے پیار بھی بڑا تھا نا —

امجد تو خیر امجد، خود ساجد اور اس کی ساس نے بھی کہا تھا۔

"اتنا زیادہ خرچہ نہ تھا۔"

"کمانے کس لئے ہو ——؟ شادی روز روز تو نہیں ہوتی۔"

صائمہ نے ساجد کا منہ بند کر دیا تھا۔

اور ——

ساس سے بھی یہی کہا۔ "یہ دن زندگی میں ایک بار ہی آتا ہے پھر آپ کا تو یہ آخری بیٹا ہے۔ اس لئے ہر ارمان نکالنا چاہتے۔"

ساجد کے دل میں بھابی کا احترام اور عقیدت اور بڑھ گیا ساس بھی دعائیں دیتی۔ اتنی اچھی بہو ملی تھی اسے ——

شادی کا سارا کام سارا انتظام صائمہ ہی نے کیا۔ ساس نندوں کو بیٹھائے رکھا جیسے وہ مہمان ہوں۔ گانے بجانے میں بھی پیش پیش رہی۔

لڈی ڈالی ——

بھنگڑا ڈالا ——

گانے گائے ——

سہاگ گیت گائے۔ فلمی گانے جو کچھ بھی آتا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ گاتی رہی۔ اسے نہ تو باقاعدہ ناچنا آتا تھا نہ گانا۔ یہ تو خوشی کے جذبوں کا اظہار تھا۔ جو وہ کر رہی تھی۔

فائزہ دلہن بن کر آئی ——

شکل و صورت کی اچھی تھی۔ زیور اور زرق برق لباس نے حسن میں اضافہ کر دیا۔

جس نے دلہن کو دیکھا۔ ماشاءاللہ ماشاءاللہ ہی کہا۔ یہ گویا صائمہ کا دل رہی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ ہر کسی سے پوچھتی۔ "خوبصورت ہے نا؟"

"پیاری ہے نا ——؟"

"کتنی پرکشش ہے ——"

"ایسا روپ آیا ہے کہ کبھی کسی پر نہ آیا ہوگا۔"

"دیکھ لی میری پسند ——"

"کیسی بے مثال لڑکی ڈھونڈی ہے ——"

اس نے امجد سے بھی یہی کہا ——

امجد نے والہانہ طور پر اسے بازوؤں میں بھر لیا اور پیار کرتے ہوئے بولا۔

"صائمہ جواب نہیں تمہارا ——؟"

"میرا یا فائزہ کا ——؟"

"فائزہ کا ہوگا ساجد کے لیے۔ اپنے لیے تو تم سا کوئی نہیں ہے سمجھیں ——"

صائمہ کو اس سے زیادہ داد اور کیا مل سکتی تھی۔

لہراتی مسکراتی چھری ——

"لاؤ فائزہ ——! میں رولر لگا دوں ——"

"لیجیے ——"

فائزہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی تھی۔ پیٹی کوٹ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بالوں میں رولر لگا رہی تھی۔ ٹھیک سے لگ رہے تھے۔

صائمہ اس کی بھاری بنارسی ساڑھی پر ہلکی ہلکی استری پھیر رہی تھی آج اس نے بڑی نند کے ہاں ڈنر پر جانا تھا۔ صائمہ نے ہی بھاری ساڑھی نکالی تھی۔ اس کے زیور والے ڈبے بھی نکالے تھے

تیار ہونے میں مدد دے رہی تھی۔

ساڑھی بیڈ پر پھیلا کر صائمہ فائزہ کی طرف آگئی اور الیکٹرک رولر فائزہ کے بالوں میں سلیقے سے لگانے لگی۔

رولر لگا چکی تو فائزہ نے صائمہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آئینے میں اس سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔

"بھابی —— آپ کتنی اچھی ہیں ——"

صائمہ مسکرائی ——

"میں آپ کی احسان مند ہوں بھابی —— آپ کی وجہ سے مجھے اچھا گھر ملا ہے۔ یقین کریں بھابی —— میں پیار کے دو بولوں کو ترستی تھی۔ ابو نے جب سے دوسری شادی کی ہے۔ میرا وجود ان کے لئے بھار بن گیا تھا۔ مہینوں بات نہیں کیا کرتے تھے ماں جی سوتیلی ——"

فائزہ کی خوبصورت آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ صائمہ نے جھک کر اس کے گال سے اپنا گال لگایا اور بڑے دلار سے بولی۔ "جی میلا نہ کرو پیاری پیاری فائزہ —— یہاں تم سب کچھ بھول جاؤ گی پیار ملے گا کہ کوئی حسرت باقی نہ رہے گی۔"

فائزہ کی نگاہیں تشکر سے جھک گئیں۔

صائمہ نے سرگوشی کی۔ "ساجد کو تو دو دن ہی میں دیوانہ بنا لیا ہے ——"

فائزہ شرما گئی ——

وہ بے حد خوش تھی —— اور اس خوشی کا کریڈٹ صائمہ کو جاتا تھا ——

"بھابی —— آپ بھی تیار ہو جائیں ——" فائزہ نے کہا۔

"ہو جاؤں گی۔ میں نے کونسا دلہن بننا ہے۔"

"پھر بھی —— بچوں کو تیار کر لیں ——"

"پنکی کے کپڑے بدل دیئے ہیں۔ گل یہیں رہے گا ——" صائمہ نے کہا ——

صائمہ فائزہ کا میک اپ ٹھیک کرنے لگی ——

"صائمہ ——!" باہر سے امجد کی آواز آئی۔

"جی —— آئی ——"

"بھئی کہاں غائب ہو ——؟"

"آپ کی بھابی کو تیار کر رہی ہوں ——؟"

"ہمیں کون تیار کرے گا ——؟"

"آتی ہوں ——"

"جایئے بھابی —— اب میں ساڑھی خود ہی پہن لوں گی" صائمہ نے کہا۔

"اچھا —— زیور دیکھ لو —— کوئی اور سیٹ پہننا ہو تو ان میں سے لے لینا۔"

آپ کی پسند ہی کا پہنوں گی ——"

صائمہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی۔

امجد وہیں کھڑا تھا اسے دیکھتے ہی بولا۔

"بس بہت ہو گیا —— اب کچھ اپنی بھی خبر لو —— تم تو دلہن لگ رہی ہو جیسے پاگل ہو رہی ہو ——"

صائمہ نے مسکراتے ہوئے شوخ نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کمرے میں گھس گئی ——

امجد بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔

"اللہ ——! اتنی پیاری لگ رہی ہے نا فائزہ، ابھی صرف میک اپ کیا ہے۔ ساڑھی پہنے گی تو....."

"تو حور بن جائے گی ——"

"آپ کو تو چڑ سی ہو گئی ہے۔"

"ہو گئیں نا —— تمہیں تو ہم سب بھول ہی گئے ہیں۔ نہ کپڑے نئے ہوں اور نہ اور کسی قسم کا خیال کرتی ہو۔ میں نے کہا نا کہ بہت ہو گیا اب ہماری طرف بھی دھیان دو جناب ——"

امجد نے شوخی سے بازو پھیلا دیئے اور صائمہ اک ادائے ناز سے اسے تکتے ہوئے ان بازوؤں میں سما گئی۔

دن گزرتے چلے گئے۔ گھر میں خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ فائزہ اور صائمہ کا پیار مثالی تھا۔ ساس مطمئن تھیں۔ امجد اور ساجد خوش تھے۔ معمول کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

پیار کو ترسی ہوئی فائزہ کو تو یوں لگتا تھا جیسے تپتے ہوئے صحراؤں میں چلتے چلتے ایک دم گھنیرے سایوں تلے بہنے والے قلقل قلقل کرتے چشموں کے کنارے آ بیٹھی ہو۔

واقعی وہ تلخیاں بھول گئی تھی۔ سوتیلی کا رویہ اور باپ کا برتاؤ بھول ہی گئی تھی۔ اسے یاد کرنے کی فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ وہ تو اپنی مسرتوں سے بھرپور ازدواجی زندگی میں کوئی فالتو لمحہ ہی نہ پاتی تھی۔ جو گزرے دنوں کا ماتم کر سکے۔

صائمہ کے پیار میں بھی کوئی کمی نہ آئی تھی۔ فائزہ کے آجانے سے اس کے کام کا بار بھی بٹ گیا تھا۔ مہینوں تک تو اس نے فائزہ کو کسی کام کو ہاتھ لگانے دیا تھا۔

لیکن ——

فائزہ کہتی ——

"میں بے کار بیٹھی بور ہوتی رہتی ہوں بھابی! مجھے آتا جاتا تو کچھ نہیں سیکھنے ہی دیں ——"

"بالکل —— اب بھابی کا بار تمہیں بانٹنا ہی چاہیئے ——" ساجد کہتا۔

صائمہ مسکرا کر کہتی ——

"ایسا کون سا بار ہے بھیا —— اکام تو وہی ہے فائزہ کے آنے سے بڑھ تو نہیں گیا ——"

"پھر بھی بیٹی ——" ساس پیار سے کہتی "دونوں مل کر کیا کرو —— فائزہ بھی سیکھ لے گی۔"

"اور کیا —— ورنہ یوں تو بیٹھ بیٹھ کر موٹی ہو جائے گی۔ اور مجھے موٹی عورتوں سے بیر ہے بھابی۔ پلیز فائزہ کو کام کرنے دیا کریں۔ ورنہ خواہ مخواہ ہماری ناچاقی ہو جائے گی۔" ساجد ہنستا۔

"اللہ نہ کرے ——"

صائمہ اس کی بات ٹوک دیتی ——

فائزہ اب صائمہ کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔

ذہین لڑکی تھی —— بہت جلد گھر والوں کی پسند اور ناپسند سمجھ گئی —— امجد کی پسند کے کھانے بنانے لگی۔ ساجد کی پسندیدہ ڈشیں تیار کرنے لگی ——

صائمہ کو اب واقعی کچھ وقت فرصت کا نصیب ہوا تھا وہ اس کے لئے فائزہ کی ممنون احسان تھی۔

شادی کے بعد اسے بہت کم میکے جانا نصیب ہوا تھا دو ان کے لئے جاتی تو پیچھے ہی پیغام پہنچ جاتا۔ کبھی اماں کے اکیلے پن اور کبھی امجد کی روٹی کا فکر —— جاتی بھی تو اُلٹے پاؤں

لوٹ آتی۔

فائزہ کے آنے سے یہ مسئلہ حل ہوگیا تھا۔

اب تو میں اطمینان سے میکے رہ سکتی ہوں ——" اس نے امجد سے کہا۔

"کیوں ——؟"

"اب فائزہ ہے نا گھر پہ —— امی کو اکیلا پن محسوس نہیں ہوگا —— اور —— آپ کو روٹی کی تکلیف کا بہانہ بھی نہیں بنانا پڑے گا ——"

"لیکن ——؟"

"کیا ——؟"

"تمہارے جانے سے جو سُونا پن مجھے محسوس ہوتا ہے اس کا کیا ہوگا ——"

"کبھی کبھی ایسا ہونا چاہیئے ——"

"کیوں ——؟"

"پیار بڑھتا ہے ——"

"اس تجربے کی ہمیں ضرورت نہیں جناب ——"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ امجد نے اسے بازوؤں میں لپیٹ لیا۔

وقت کا چکر چلتا رہا —— دن ہفتوں ہفتے، مہینوں اور مہینے سالوں میں ڈھلتے گئے۔ فائزہ کی آغوش میں پھول کھلا۔ بہت پیارا بچہ تھا لڑکا —— اس سال صائمہ کے بھی دوسرا بیٹا پیدا ہوا گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

چاروں بچے بہت پیارے تھے۔ سب کی آنکھوں کے تارے تھے، کوئی تشخیص نہ تھی کہ تین بچے امجد کے ہیں اور ایک ساجد کا —— یہاں تو ہر چیز سانجھ کی تھی۔

بچے بھی سانجھے تھے۔ کاروبار میں بھی دن دُگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی۔ ساس کہتی۔ یہ سب صائمہ کی نیک نیتی کا نتیجہ ہے اور صائمہ کہتی یہ فائزہ کی قسمت کا اعجاز ہے جب سے وہ اس گھر میں آئی ہے ہُن برسنے لگا ہے۔

اگلے سال فائزہ کے بچی پیدا ہوئی۔ اتفاق کہیئے یا قسمت، جس دن بچی پیدا ہوئی اسی دن امجد اور ساجد کو بھی ایک بہت بڑا اور منافع بخش آرڈر ملا ——

صائمہ نے پیار سے فائزہ کو دیکھا اور ساس سے بولی۔ "میں نے کہا تھا نا کہ یہ سب فائزہ کی قسمت ہے۔"

"فائزہ کی جگہ اس کی بچی کی قسمت کہو اب تو ——" امجد نے نومولود بچی کی طرف پیار سے دیکھا —— "اس کی آمد خوش بختی کی علامت ہے۔"

فائزہ اور ساجد ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی سے مسکرا دیئے۔

"اللہ نظر بد سے بچائے رکھے ——" ساس بولی۔

"آمین ——" سبھی نے کہا۔

اس دن سب کھانے کی میز پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے

"یہ گھر اب چھوٹا ہو گیا ہے۔" امجد نے کہا۔

"دل چھوٹے نہیں ہونے چاہییں ——" صائمہ بولی۔

"میرا خیال ہے ہم بڑا گھر بنوالیں ——" امجد نے خیال ظاہر کیا ——

"زمین تو ہے ——" ساجد بولا۔

"ہاں —— اس پر ڈوپلیکس بن سکتا ہے ——" امجد نے کہا ——

"ڈوپلیکس کیوں ——؟" صائمہ جلدی سے بولی "ایک ہی گھر بنے گا۔ بیڈ روم چاہے جتنے بنالیں۔"

"نہیں بھابی ——" ساجد بولا "بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں دو چھوٹے چھوٹے انڈیپنڈنٹ پورشن بن جائیں۔ باہر سے گھر ایک دکھائی دے گا۔"

"بالکل بالکل ——" امجد نے کہا۔

"اچھا ——" صائمہ کچھ اداس ہو گئی۔ "تم لوگ ایک گھر میں رہتے رہتے شاید بیزار ہو گئے ہو۔"

"یہ بات نہیں بھابی ——" فائزہ بولی۔

"تو پھر کیا بات ہے ——؟"

"اماں جی یہی چاہتی ہیں ——"

"کیوں امی ——؟"

ساس نے سب بچوں پر نگاہ ڈالی۔

پھر سنجیدگی سے بولیں۔ "صائمہ بیٹی اس میں کوئی ہرج نہیں خدا تم سب کو سلوک و اتفاق دے۔ ساتھ ساتھ رہو گے لیکن بہتر ہو گا کہ دونوں اپنے اپنے بار سنبھالو۔ فائزہ اپنا اور اپنے بچوں کا —— اور تم اپنا اور اپنے بچوں کا۔ اب ماشاءاللہ تمہارے تین بچے ہیں —— دو فائزہ کے ——"

صائمہ جلدی سے بولی —— "میں نے کبھی یہ نہیں سمجھا ماں جی کہ میرے تین بچے ہیں —— ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ پانچ بچوں کی ماں ہوں ——"

"مجھے بھی سدا یہی لگا ہے بھابی ——" فائزہ بولی۔

صائمہ نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تو چاہتی تھی کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ ایک گھر میں ایک کنبے کی حیثیت سے رہیں۔ آپ لوگوں کی مرضی ہے —— الگ گھر بنانا چاہتے ہیں تو....

شوق سے ——"

"نہیں ——" ساجد ایک دم بول اٹھا "آپ کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہی سب کچھ ہوگا بھابی۔ ہم چھ بیڈ روم کا گھر بنائیں گے بہت بڑا۔ لیکن ایک گھر ——"

امجد بھی چپ ہوگیا ——

جب رہنے والوں کو اکٹھا رہنے پر اعتراض نہیں تھا تو وہ کیوں مُصر ہوتا الگ الگ گھر بنانے پر ——

اگلے ہفتے گھر کا نقشہ بننے کے لئے دے دیا گیا۔ صائمہ اور فائزہ نے مل کر خاکہ سا تیار کیا۔ انہی خطوط پر نقشہ بننے دیا گیا۔

پورے چودہ ماہ میں کوٹھی تیار ہوئی۔ بڑے ارمانوں اور بڑے شوق سے اسے بنوایا گیا۔ صائمہ اور فائزہ خود جا کر دیکھتی تھیں مشورے دیتی تھیں۔

اور ضرورت کی ہر چیز بنواتی تھیں۔ کشادہ سا ڈرائنگ روم اس سے ملحقہ ڈرائنگ روم —— ایک ایک سائیڈ پر تین تین بیڈ روم اور کچن کافی بڑا تھا۔

دونوں نے مل کر ہی اسے سجایا ——

اور ——

جس دن سب لوگ اس گھر میں شفٹ ہوئے وہ دن ان سب خوشیوں کی انتہا کا دن تھا ——

اور ——

وہ ——

شاید ——

انتہا کا دن ہی تھا ——

خوشیاں ابھی انتہاؤں کو چھو رہی تھیں ——

کہ ——

بہت بڑا ——

اور بڑا ہی جانکاہ حادثہ ہوگیا ——

اندھیر ہوگیا ——

قیامت ٹوٹ پڑی ——

طوفان آیا اور گھر بھر کی خوشیاں سمیٹ کر لے گیا۔

ساجد کام پر جاتے ہوئے ٹرک سے ٹکرا گیا۔ شدید زخمی حالت میں اسے ہوسپٹل پہنچایا گیا —— ساجد کی موٹر چکنا چور ہوگئی۔ وہ خود بھی چکنا چور ہوگیا —— ایک دن اور ایک رات ہسپتال میں بیہوش رہنے کے بعد بے ہوشی ہی میں دم توڑ گیا۔

گھر والوں پر جو بیت رہی تھی۔ اور فائزہ کا جو حال تھا۔ ساجد ہوش میں ہوتا تو بے ہوش ہوتا۔ اس نے شاید آنکھ اسی لئے نہ کھولی

تھی کہ اپنے پیاروں کی تڑپ دیکھنے کا یارا نہیں تھا۔ ماں سینہ پیٹ رہی تھی۔ صائمہ کی چیخیں دل تڑپا رہی تھیں۔ امجد کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا ——

اور ——

فائزہ ——

اس کی تو دنیا لُٹ گئی تھی وہ تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ بار بار غش کے دورے پڑتے تھے۔ ہوش میں آتی تو پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگتی دیکھنے والوں سے برداشت نہ ہو پاتا۔ آنکھیں برسنے لگتیں۔

زندگی نے ایکا ایکی ایسا پلٹا کھایا تھا کہ سب بوکھلا گئے تھے امجد کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی۔

معمر ساس جیتے جی مر گئی ——

اور ——

فائزہ تو سمجھ ہی نہ پاتی تھی کہ کیا ہوا ہے۔

کئی ماہ گزر گئے —— فائزہ گھر بار اور بچوں سے بے خبر اپنے دکھوں میں ڈوبی رہی۔ اس سے جب برداشت نہ ہو پاتا تو چیخ اٹھتی "میں کیا کروں؟ میں کیا کروں گی؟ میں کہاں جاؤں گی؟ زندگی کیسے بسر کروں گی؟؟؟

صائمہ بھی اس کے ساتھ آنسو بہاتی اور جب فائزہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر فریاد کرتی تو وہ اسے سینے سے لگا لیتی۔ اتنی محبت اور اتنے پیار سے ——

جیسے ——

وہ اس کی ماں ہو —— ممتا کا اُبلتا ہوا سمندر سینے میں موجزن ہوتا اور فائزہ کی بے سکون اور درد آشنا زندگی کو سہارا دینے کے لئے وہ پوری پوری کوشش کرتی۔

فائزہ مجسم غم تھی۔ اس کا غم ساس کا بھی غم تھا۔ صائمہ کا بھی اور امجد کا بھی۔ امجد تو اس کے دکھ کو بہت زیادہ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتا۔

روپے پیسے کی کمی نہ تھی —— فائزہ کے سہارے اخراجات فراغت سے پورے کر رہا تھا۔

لیکن ——

وہ ——

پھر بھی بے چین و مضطرب رہتی ——

"میں کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی ——؟" اس دن فواد نے ابّو کے متعلق پوچھا تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

"ایسا کیوں کہتی ہو فائزہ ——؟" صائمہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بچے کو اپنی گود میں لے کر بولی۔ "میرا پیارا پیارا بچہ"

"ابو کہاں ہیں ——؟" فواد نے معصومیت سے پوچھا۔

صائمہ کا دل بھر آیا۔

بچے کو اٹھا کر امجد کے پاس لے گئی اور بڑے اعتماد سے بچے کو یقین دلانے لگی۔

"یہ ہیں آپ کے ابّو ——"

"وہ ابو کہاں ہیں ——؟" بچے نے پھر کہا۔

صائمہ نے بچے کو امجد کی جھولی میں ڈال کر کہا۔

"امجد اسے اتنا پیار کرو کہ یہ تمہیں ابو سمجھنے لگے۔ یہ اور وہ کی تمیز بھول جائے۔"

امجد نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔

صائمہ نے فائزہ سے بھی یہی کہا "فائزہ اب بچوں کی طرح تم حوصلہ کرو۔ تقدیر کے فیصلے انمٹ ہوتے ہیں۔ تم بار بار یہ کیوں کہتی ہو کہ کہاں جاؤں گی۔ یہ تمہارا گھر ہے فائزہ۔ اس گھر پر اور کاروبار پر تمہارا پورا پورا حق ہے۔ یہ تمہارے مرحوم شوہر کا گھر ہے۔ تمہارے بچوں کا گھر ہے تمہارے بچوں کا گھر ہے —— تم ایسا کیوں سوچتی ہو —— کیوں پریشان ہوتی ہو۔"

وہ بھابی سے لپٹ کر رو دی۔ ہچکیوں کے درمیان بولی "میرا آپ کے سوا اب کوئی بھی نہیں ہے بھابی۔ ماں باپ کو تو آپ نے دیکھ لیا —— پلٹ کر پوچھا تک نہیں تھا —— مجھے اس گھر کی

چوکھٹ سے جدا نہ کیجئے گا بھابی —— کہ میرا کوئی نہیں —— کوئی بھی نہیں ——"

"تمہارے سب ہیں فائزہ —— ساجد کو ہم لوٹا تو نہیں سکتے ہیں لیکن اور کسی طرح کی تکلیف تمہیں جیتے جی نہ ہونے دیں گے اب تم ہمت کرو گی۔ تو وقت گزرے گا۔"

"بہت کرتی ہوں بھابی —— لیکن جب بچے ابو کا پوچھتے ہیں تو میں بکھر جاتی ہوں ——"

"بچوں کو میں سنبھال لوں گی۔ فکر نہ کرو۔ تم بھی انہیں یقین دلایا کرو کہ اب ان کے ابّو امجد ہیں —— امجد انہیں باپ کا سا ہی پیار دیں گے۔"

فائزہ نے سر جھکا لیا ——

صائمہ اسے تسلیاں دیتی رہی۔ اس کا حوصلہ بندھاتی رہی بچے سمجھ دار ہو جائیں تو انہیں پھر بچہ کہے ہی کون۔ گھریلو حالات کی تلخی و ترشی بڑے تو سمجھتے تھے۔

لیکن ——

بچوں کو کون سمجھایا ——

پنکی اور گل، فواد سے عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ابھی تو بچپنے کی حدود ہی تھیں نا —— کیسے سمجھ لیتے کہ فواد کو بہلانے کے لئے ان کے ابّو فواد کے ابّو بن گئے ہیں۔

فواد صائمہ اور فائزہ کی کاوشوں سے امجد کو ابو سمجھنے لگا تھا لیکن جب بھی وہ پنکی، گل یا جگی کے سامنے امجد کو ابو کہتا۔ تینوں بھاگ کر اپنے ابو سے چمٹ جاتے۔

"ہو تم ——— یہ ہمارے ابو ہیں ——— تمہارے ابو تو اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔"

فواد منہ تکنے لگتا۔

اس کے چہرے پر محرومیت کے سائے اتنے واضح ہوتے کہ فائزہ تڑپ جاتی۔

ایسے میں اکثر امجد اپنے بچوں کو ڈانٹ دیتا۔ "خبردار جو ایسی بات منہ سے نکالی۔ میں تم سب کا ابو ہوں۔"

وہ اپنے بچوں کو پرے ہٹا کر فواد کو گلے لگا لیتا۔ بچے اس منطق کو بھلا کیسے سمجھتے۔

کبھی ———

کبھی تو وہ اس بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے اور کبھی ششدر سے کھڑے اپنے ابو کو دیکھتے رہتے۔ معاملہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

لیکن ———

اپنی حق تلفی کو ضرور محسوس کرتے تھے۔ یہ حق تلفی دل میں نفرت کا بیج بو رہی تھی۔

انہیں فواد اور اس کی بہن جگی سے دلی نفرت محسوس ہوتی۔ اس نفرت کا اظہار وہ اس وقت کرتے جب امی ابو سامنے نہ ہوتے فواد کی چیزیں چھین لیتے ——— جگی کو دھکا دے کر گرا دیتے۔ ان کے کھلونے توڑ پھوڑ دیتے۔

اور ———

تو ———

اور ———

وہ تو کسی کسی وقت ابو سے بھی متنفر ہو جاتے۔ ابو جو گھر میں داخل ہوتے ہی جگی کو اٹھا لیتے، فواد کو پیار کرتے ——— اور بازار سے لائے ہوئے پھل اور ٹافیاں کے لفافے ان سے پہلے فواد اور جگی کو پکڑا دیتے۔

گل ذرا زیادہ ہی لاڈلا تھا۔ امجد کے برتاؤ نے بڑے غیر محسوس طریق سے اس کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو متاثر کر دیا۔ اب وہ ڈھٹائی پر اتر آیا تھا۔

ابو کی بات نہ سنتا تھا۔

گستاخی سے جواب دیتا۔

روٹھ جاتا اور منہ بسورے رہتا۔ وہی کام کرتا جس سے ابو منع کرتے یہ اس کے کچلے ہوئے جذبوں کا اظہار تھا۔

بچوں کی لڑائیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ بات فائزہ کے تکلیف دہ

تھی۔ تو صائمہ کے لئے باعث تشویش۔ دادی بھی اکثر پنکی گل اور جبی ہی کو ڈانٹتی۔

تیمیم بچوں کی دلجوئی ان کا فرض تھا نا ——

بچے بگڑتے جا رہے تھے۔

اس کا اثر گھر کی فضا پر بھی پڑ رہا تھا۔ فائزہ اکثر پنکی اور گل کو ان کی زیادتی پر ڈانٹ دیتی۔

صائمہ کو برا بھی لگتا۔ بچے ہی تھے نا۔ یہی باتیں پیار و محبت سے بھی سمجھائی جا سکتی تھیں۔

گھریلو فضا میں ایک غیر محسوس سا تناؤ آتا جا رہا تھا۔ وہ رونق وہ گہما گہمی تو ساجد کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ پھر بھی صائمہ کی بھرپور کوشش تھی کہ گھریلو فضا مکدر نہ ہو۔ اپنی طرف سے اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔

بچوں کو امجد سے مانوس کیا تھا۔ فائزہ کے دکھ کو اپنا دکھ جانا تھا۔ اس نے تو خود بھی بناؤ سنگھار کرنا محض اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ فائزہ بیوہ تھی اور اس سے بناؤ سنگھار کا حق چھن گیا تھا۔

لیکن ——

حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔

صائمہ بازار سے واپس آئی۔ تو گھر میں ہنگامہ بپا تھا۔ پنکی اور گل ہا پھاڑ کر چلا رہے تھے۔ فواد اور جبی بھی فائزہ کی گود میں گھسے رو رہے تھے۔

فائزہ پنکی اور گل کو کوس رہی تھی۔ اس نے بچوں کو تھپڑ بھی مارے تھے اور بددعائیں بھی دی تھیں۔

صائمہ ششدر سی کھڑی رہ گئی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بچوں کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑے گا۔

بچے ماں سے لپٹ گئے۔

"امی آنٹی نے مجھے چانٹا مارا ہے۔"

"امی یہ دیکھیں میرے گال پر کتنے زور سے چٹکی کاٹی ہے۔"

"امی فواد نے میرا کھلونا توڑا تھا۔"

"میری کاپی پھاڑ دی تھی۔"

"میں ہلکا سا تھپڑ مارا —— آنٹی نے مجھے اتنے زور سے مارا ——"

بچے شکایتیں لگانے لگے۔

صائمہ نے دونوں کو پیار کرتے ہوئے فائزہ سے کہا۔ "فائزہ بچے ہی ہیں نا آخر —— میں نے تو اپنے اور تمہارے بچوں میں کبھی فرق نہیں سمجھا۔"

"مجھے تو تقدیر نے مار ڈالا ہے بھابی —— آپ بھی چوچا ہیں

کہہ لیں ـــــ بچوں کی باتیں سن کر یقین کر لیں ـــــ مجھ سے تو پوچھتیں ہوا کیا ہے ؟"

"لڑائی ہوئی ہوگی بچوں میں اور کیا ہوا ہوگا۔"

"بچے آپ ہی کی شہہ پر ایسا کرتے ہیں نا ـــــ" فائزہ رونے لگی۔

صائمہ حیرانگی سے اس کا منہ تکنے لگی۔

"میرا اور کوئی ٹھکانہ ہوتا تو میں خود ہی چلی جاتی۔ اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں۔"

وہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگی۔ ساس بھی اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔

"دکھے دل کو دکھانا بری بات ہے صائمہ۔" ساس نے بھی یہی کہا تو صائمہ پریشان ہوگئی۔ اس نے تو فائزہ کا دل دکھانے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

وہ بددل سی ہو کر اپنے کمرے میں آگئی۔

حالات غیر محسوس طریق سے بدل رہے تھے ساس کی ہمدردیاں فائزہ کے ساتھ تھیں۔ جوان جہاں بہو بیوگی کے پہاڑ تلے دبی تھی جب بھی وہ دکھ سے کراہتی، زخموں میں ٹیس سی اٹھتی جواں مرگ

بیٹے کا سانحہ تازہ ہو جاتا۔

صائمہ بیچاری پریشان ہو جاتی۔ اس کا کیا قصور تھا۔ اس نے تو مقدور بھر فائزہ کا ساتھ دیا تھا اور دے رہی تھی۔ امجد کے دل میں اس نے خود ہمدردیاں جگائی تھیں۔ ساجد کے بچوں کا باپ بنانے کے لئے اپنے بچوں کی حق تلفی کی تھی۔ سب کچھ دیکھتی تھی ـــــ

لیکن گلا کبھی نہ کیا تھا ـــــ

لیکن

کچھ اندیشے اور وسوسے اس کے ذہن میں پچھلے کئی دنوں سے رینگنے لگے تھے۔ امجد صرف بچوں ہی کو پیار دلاسہ نہیں دے رہا تھا۔ فائزہ سے بھی ٹوٹ کر ہمدردی کر رہا تھا۔

صائمہ کے اندر ایک خاموش سی جنگ ہو رہی تھی۔ وہ ان وسوسوں اور اندیشوں کو سختی سے کچل دیتی۔ لاحول پڑھتی۔ شک کو گناہ قرار دیتی۔

لیکن

کچھ تو تھا ـــــ

بے نام سی ـــ بے وجود سی ـــ

لیکن محسوسات کے آلے اسے جانچ رہے تھے پرکھ رہے تھے۔

وہ شام بڑی بے رونق اور اداس تھی۔ صائمہ پریشان تھی وسوسے برابر ذہن میں رینگ رہے تھے۔ خدشے پریشان کر رہے تھے۔ وہ جمی کو بستر میں لئے نیم دراز تھی۔

امجد فیکٹریاں سے آیا تھا۔ کپڑے بھی نہ بدلے تھے کہ فواد کمرے میں آتے ہی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹے" امجد نے اسے اٹھا کر پیار کر لیا۔

"ابو امی رو رہی ہیں"

"کیوں ـــ کیا ہوا ہے"

"پتہ نہیں"

امجد نے بچے کو گود سے اتارتے ہوئے صائمہ کی طرف دیکھا

"کوئی بات ہوئی ہے"

"پتہ نہیں ـــ میں تو یہیں ہوں کافی دیر ہے" صائمہ بولی "جمی کو بخار سا ہے"

امجد نے جیسے صائمہ کی بات ہی نہیں سنی جمی کے بخار کی پروا بھی نہیں کی۔ اور کمرے سے نکل گیا۔

صائمہ کافی دیر انتظار کرتی رہی۔

امجد نہیں آیا ـــ

پنکی کمرے میں آئی تو صائمہ نے پوچھا۔

"تمہارے ابو کہاں ہیں؟"

"آنٹی کے پاس"

صائمہ کے دل کو دھچکا سا لگا جانے کیوں شک و شبہے مچل گئے جمی کے پاس پنکی کو بٹھا کر وہ بستر سے نکلی اور فائزہ کے کمرے کی طرف گئی وہ کھڑکی کے پاس چند لمحے رکی۔

امجد فائزہ سے کہہ رہا تھا۔

"میرے ہوتے ہوئے تم ایسا کیوں کہتی ہو فائزہ ـــ یہ تمہارا اپنا گھر ہے ـــ ایسے مت سوچا کرو۔ بات بات پر یوں روتی کڑھتی رہو گی تو زندگی کیسے گزرے گی ـــ؟ بچوں کی خاطر ہی اپنا دکھ بھلا دو ـــ"

صائمہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ یہ باتیں معمول کی باتیں تھیں۔ اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔

لیکن ـــ

بعض باتیں ہوتی نہیں ـــ

لیکن پھر بھی ہوتی ہیں ـــ

بے وجود حقیقتیں بعض اوقات وجودی حقیقتوں سے زیادہ زوردار اور پریشان کن ہوتی ہیں۔

وہ وہاں سے ہٹی اور دروازے سے اندر آ گئی۔

امجد ایک دم پرے ہٹ گیا۔

اور ـــ

صائمہ کے دل نے فوراً کہا جب کوئی بات ہی نہیں تھی تو اس طرح گھبرا کیوں گئے۔

وہ تھوڑی دیر فائزہ کے پاس بیٹھی رہی۔

لیکن ——

اس کا ذہن شک و شبہے کی گرفت میں تھا۔ ایسے چھوٹے بڑے کئی واقعات رونما ہونے لگے۔

"اتنی پہاڑ سی زندگی فائزہ کیسے کاٹے گی؟" اس دن صائمہ کی ساس نے خود ہی بات کی۔

"ہاں امی —" ساس نے جیسے صائمہ کے دل کی بات کہہ دی تھی "ابھی تو پچیس سال کی بھی نہیں ہوئی۔"

ساس دکھ بھری آواز میں بولی۔ "کیا کروں —؟ دکھ بانٹا بھی نہیں جا سکتا۔"

دونوں کچھ دیر فائزہ کے دکھ کی باتیں کرتی رہیں۔

پھر ——

صائمہ نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔ "نکاح ثانی میں کوئی ہرج تو نہیں۔ پھر خدا اور رسول ؐ کا حکم ہے۔"

ساس کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ صائمہ کی بات اسے مطلقاً اچھی

لگی —— ایسی نظروں سے صائمہ کو دیکھا کہ وہ خفت سے سر جھکا کر رہ گئی۔

کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا۔

لوگوں کی نگاہیں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ کچھ بے پر کی بھی اڑانے لگتے ہیں۔ لیکن آگ کے حوالے سے دھواں اٹھتا ہے۔ لوگ فائزہ کے متعلق باتیں بنانے لگے۔

امجد کے بارے میں تذکرے زبانوں پر آنے لگے۔ امجد اس دن فائزہ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ فواد کو بخار تھا اور جگی کا پیٹ خراب تھا۔ لوگوں نے دونوں کو گاڑی میں جاتے آتے دیکھا آنکھیں پنچا پنچا کر ایک دوسرے کو اشارے کئے۔

کسی نے کہا۔ "جوان جہان لڑکی ہے ابھی۔ خوبصورت بھی ہے سمارٹ بھی۔ امجد یہ سمجھ گیا ہے اس پر۔"

کوئی کہتا۔ "بات ہے کچھ ورنہ میکے نہ جا بیٹھتی۔ اتنی نو عمر ہے باپ کے گھر میں جو تحفظ ہے۔ یہاں کہاں؟"

"لگتا ہے دال میں کچھ کالا ہے۔"

باتیں اڑتی ہیں — ہوائیں انہیں دوش پر لئے پھرتی ہیں۔ یہ باتیں فائزہ، امجد، ساس اور صائمہ تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

لیکن ——

سب چپ رہے ——

ان باتوں پر تبصرے کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ ہاں صائمہ کے خدشے اور وسوسے تنومند ہوتے جا رہے تھے۔ امجد کا رویہ بھی تو پہلے جیسے نہ رہا تھا۔

الجھا الجھا رہتا۔ خفت سی محسوس کرتا۔

صائمہ نے بڑی سوچ بچار کے بعد امجد سے اس دن اس موضوع پر بات کر ہی ڈالی۔

دونوں پلنگ پر لیٹے تھے۔

امجد کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ صائمہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی نیند دونوں کو نہیں آ رہی تھی۔

"سو جاؤ" امجد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"آپ بھی سو جائیں"

امجد نے رسالے پر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ صائمہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔

چند لمحے چپ رہی۔

پھر آہستگی سے بولی۔ "فائزہ یہاں رہی تو میرا سکون بالکل ہی غارت ہو جائے گا"

"وہ جائے کہاں؟" امجد نے درشت لہجے میں کہا۔

صائمہ اس کے لہجے میں خطرے کا الارم سن کر کانپ اٹھی۔ لیکن حوصلہ کر کے بولی۔ "وہ جوان ہے خوبصورت ہے۔ اس کے لئے

تلاش کیا جائے تو رشتہ مل سکتا ہے"

امجد نے رسالے پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ "لیکن اس سے مسائل بڑھ سکتے ہیں"

"کیسے ——؟"

"بچوں کا کیا ہوگا ——؟"

"بچے میں پال سکتی ہوں"

"ماں سے چھین لے گی"

"ماں ساتھ بھی رکھ سکتی ہے"

صائمہ یہ بات اتنی سہل نہیں۔ تم جانتی ہو۔ ساجد کا اور میرا کاروبار سانجھا تھا۔ یہ گھر بھی ہم دونوں کے نام ہے"

"پھر ——"

"فائزہ اور بچے اس گھر کے اس کاروبار کے آدھے حصے کے قانوناً حقدار ہیں۔ اور تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ یہ گھر تقسیم ہو سکتا ہے نہ ہی کاروبار"

صائمہ چپ ہو گئی ——

پریشان نظروں سے امجد کو دیکھا۔

پھر بولی —— "لوگوں کی باتیں سنتے چلے جاؤ گے؟ بدنامی نہیں ہو رہی"

وہ چپ ہو گیا ——

صائمہ بھی سوچوں میں ڈوب گئی۔

کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد امجد آہستگی سے بولا۔ "اس کا حل تلاش کرنا ہی پڑے گا۔"

صائمہ گم صم سی بیٹھی تھی۔

اس کا حل کیا ہو سکتا تھا ——— ؟ کیا ہوگا ——— ؟ وہ سوچ سوچ کر پاگل سی ہونے لگی۔

صائمہ کو یوں لگا جیسے آسمان اس کے سر پر آن گرا ہے۔ زمین تیزی سے گھومنے لگی ہے اور اس کا اپنا آپ تنکے کی طرح ڈولتا ہوا نیچے کی طرف جا رہا تھا۔

چند لمحے تو اسے گرد و پیش کی خبر ہی نہ رہی۔ اور اس نے دروازے کے پٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کا بدن پسینے میں نہا گیا اور وجود تھر تھر کانپنے لگا۔

کمرے میں اس کی ساس دونوں نندیں اور امجد بیٹھے صلاح مشورہ کر رہے تھے کھچڑی سی کئی دنوں سے پک رہی تھی۔ اس سے چھپ چھپ کر پلان بنائے جا رہے تھے۔ ان دنوں فائزہ بھی اس سے آنکھیں نہ ملا رہی تھی۔

اس کھچڑی کا یقیناً اسے بھی پتہ تھا۔

صائمہ ساس کے کمرے میں کسی کام سے آئی تھی۔ لیکن باتوں کی آواز سن کر باہر ہی رک گئی۔

جانے کب سے پلان بن رہا تھا۔ اب بڑی نند کہہ رہی تھی "اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ لوگوں کی زبانیں کون بند کر سکتا ہے اور پھر یہ عیب والی بات تو ہے نہیں۔"

"گھر کی گھر میں رہے گی۔" دوسری نند بولی۔

"کاروبار سانجھا ہے۔ گھر ہم دونوں کے نام ہے۔ ایسی صورت میں فائزہ کا نکاح کہیں اور کر دیا جائے تو کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔" امجد بولا۔

"میں تو بچوں کا بال بھی کسی کو نہ دوں۔" ساس نے کہا۔

"بچے تو اب امجد ہی کو ابو سمجھتے ہیں۔" بڑی نند بولی۔

"بالکل اپنے بچوں ہی کی طرح ہیں۔ پھر غیر تو ہیں نہیں۔ اپنے بھائی کی اولاد ہے جان کے ساتھ رکھوں گا۔"

"صرف صائمہ کا خیال آیا ہے۔" چھوٹی نند بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے" امجد بولی۔ "لیکن مجبوری ہے۔ فائزہ کو اس گھر سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ صائمہ کا اپنا مقام ہوگا۔"

"تو کل نکاح کر دیا جائے ———" بڑی نند بولی۔

"ہاں۔" امجد بولا۔

صائمہ اس سے آگے کچھ نہ سن سکی ——— کانپتے وجود کو جانے

کیسے گھسٹتے ہوئے اپنے کمرے تک جا پہنچی ـــ بستر میں پڑ کر وہ بے سُدھ ہو گئی۔

لیکن ـــــ

ہونی کو کون ٹال سکتا ہے ـــ امجد نے فائزہ سے نکاح کر لیا گھر کی بہو گھر ہی میں رہ گئی۔

لوگوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔ فائزہ ایک بار پھر آباد ہو گئی ـ اس کے بچوں کو باپ مل گیا۔

ساس خوش ہو گئی۔ کہ بیٹے کی نشانیاں نظروں سے اوجھل نہ ہوئیں اور فائزہ جو بہو تھی بہو ہی رہی۔

امجد بھی نئی بیوی کے چاؤ چونچلے اور ناز نخرے اٹھانے میں لگ گیا۔

حالات بدلے ـــــ

رشتے بدلے ـــــ

اور ـــــ رشتوں کا چلن بدل گیا۔

فائزہ اب صائمہ کی سوکن تھی۔ صائمہ اس کی بھابی نہیں تھی اب اور ـــــ سوکن کا رشتہ آگ کے جس الاؤ پر بندھتا ہے وہ یہاں بھی تندی سے چل رہا تھا۔

لیکن ـــــ

یہ تقدیر کی بات تھی۔ الاؤ کا رُخ صائمہ کی طرف تھا۔ دامنِ دل اس کا جل رہا تھا۔

فائزہ کے لئے تپش ضرور تھی لیکن دل اس طرح آگ کی لپیٹ میں نہیں تھا کہ ساس اور شوہر کی ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں ـــــ

ہوتی آئی ہے کہ نئے بندھن بندھیں تو پرانے ٹوٹ جاتے ہیں ـــــ یہی حال صائمہ کا ہوا تھا ـــــ گھر میں اب اس کی حیثیت ثانوی تھی۔

وہ بالکل بدل گئی تھی ـــــ

رنگ روپ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ خوش خلقی اور خوش مزاجی دم توڑ گئی تھی۔

اپنے لئے نہیں اپنے بچوں کے لئے جی رہی تھی۔ جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گئے تھے اور خود سہاگن بیوہ تھی۔

وہ گم صُم رہتی ـــــ

ہر وقت سوچوں میں ڈوبی رہتی۔ وہ اپنے آپ میں اس جرم کو اس بدنیتی کو، اس گناہ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ جس کے بدلے میں اسے یہ سزا ملی تھی۔

اس کی تلاش کبھی بہرہ ور نہ ہوئی۔

اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔

وہ بدنیت بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔
اس سے گناہ بھی سرزد نہ ہوا تھا۔

پھر

پھر

اسے اتنی کڑی سزا کیوں ملی تھی ؟

کیوں ملی تھی ؟

برس ہا برس گزر گئے ہیں۔ لیکن صائمہ کو اس بات کا جواب نہیں مل سکا۔

اک دیوانہ

صبح کا نورانی اُجالا بیڈ روم میں اتر رہا تھا۔ بند کھڑکیوں کے سامنے
ے تنے تھے۔ پھر بھی یہ اُجالا بڑے پُراسرار طریق سے بند کواڑوں
سے بھی اندر در آیا تھا۔ کمرے میں جلتا ہلکی روشنی کا لیمپ اس اُجالے
ں اور بھی ماند پڑ گیا تھا۔

زبیر کی آنکھ آج معمول سے پہلے ہی کھل گئی تھی۔ سائیڈ ٹیبل
ر رکھی سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس اس نے اٹھائی۔ سگریٹ لیٹے لیٹے
ی سلگایا۔ ایک دو کش لئے اور پھر اپنے پہلو میں لیٹی ثومی کی طرف
رٹ بدل کر اس پر جھک گیا۔ جھالروں والے ہلکے پیازی رنگ
کے خوبصورت شب خوابی کے لباس میں وہ بے خبر سو رہی تھی۔
اس کے سیاہ ریشمی تراشیدہ بال نرم و گداز فوم کے تکیئے پر بکھرے تھے۔
اس کی پلکوں کی لمبی لمبی جھالریں اس کے سیب کی طرح چمکتے گلابی گالوں

پر پڑی تھیں۔

اس کے گلابی ہونٹوں کی قاشیں جُدا جُدا تھیں۔ اور نیند میں گہری گہری سانس لینے کی وجہ سے ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔ زبیر نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے ننگے شانے پر رکھا اور پھر بازو کی پھسلتی ڈھلان پر لے آیا۔

"ثومی ——" اس نے سرگوشی سی کی۔

وہ نیند سے بیدار نہ ہوئی ——

پھر آواز دی ——

ثومی ہڑبڑا گئی ——

دونوں ہاتھوں میں زبیر کا چہرہ تھام لیا۔ اسے پرے ہٹایا لیکن جب بیداری کی کیفیت پورے سر و پا پر چھا گئی۔ تو اس نے اس کی طرف سے کروٹ بدل کر منہ تکیئے میں چھپا کر بڑے ناز و ادا سے کہا۔

"ہائے اللہ —— آپ کو ——" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

زبیر نے اپنا بازو اس کے گرد لیجاتے ہوئے جادو بھری مخمور آواز میں کہا۔

"جان —— آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے —— میں نے اپنا تحفہ دیدیا ہے"

وہ کسمسائی —— اور پھر ایکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

زبیر نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں اس پر چھوڑ کر ہنستے

ے کہا۔ "میں نے کہا تھا نا —— پہلے وش میں کروں گا۔ سالگرہ ہو ——"

اوہ ——" اس کے لبوں سے بے صدا سی صدا نکلی۔ اس ہے کی ساری بشاشت گم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں حزن و ملال یت لہرائی۔

زبیر سرشار سا تساہل سے لیٹا سگریٹ کا دھواں اس پر چھوڑ رہا پلمحے وہ بت بنی بیٹھی رہی۔

اے ——" زبیر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچا ں کے سینے پر آ رہی۔

ابھی تک نیند سے بیدار نہیں ہوئی ہو کیا ——؟"

اس نے اپنا سر اس کی چھاتی سے لگائے رکھا۔

کیا بات ہے بھئی —— آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے ے ——"

زبیر —— آج اس کی برسی بھی تو ہے" اس نے کمبھیر سی آواز میں ے دکھ سے کہا۔

اوہ ——" زبیر قدرے جھنجھلایا۔

اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر قدرے اونچا کیا۔ ثومی کی ں کے کنارے گلابی ہو رہے تھے۔ وہ رو دینے کو تھی۔

زبیر نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔

"اس کمبخت نے بھی اسی دن مرنا تھا ——"

"ایسے نہ کہو زبیر وہ بیچارہ ——"

"پاگل کا بچہ —— دیوانہ ——"

"زبیر ——"

"ثومی میں آج کے دن اس کا تذکرہ پسند نہیں کروں گا۔ دنیا میں روز سینکڑوں حادثات ہوتے ہیں اس کا یہ مطلب تو ——"

"زبیر —— وہ —— بالکل ہی اجنبی تو نہ تھا۔ بھائی کا بھائی تھا —— اور ——"

"اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہماری سالگرہ اس کی برسی بن جائے!"

"غصے کیوں ہوتے ہو۔ ہماری سالگرہ اور اس کی برسی تو اب ہر سال اکٹھی ہی آیا کرے گی ——"

"اور تم سالگرہ کو برسی بنا دیا کرو گی ——"

"نہیں زبیر —— غلط نہ سمجھو —— غلط نہ کہو —— مجھے بیحد صدمہ پہنچا تھا۔"

"یہ صدمہ شادی کے بعد بھی کئی ماہ تک تمہارے حواس پر مسلط رہا تھا ——"

"ہاں ——"

"خدا کے لئے ثومی —— اب تو بخشو ——" زبیر نے قدرے ترشی سے کہا ——

ر ثومی کو پرے ہٹا کر کروٹ بدل لی۔

دی چند ثانیئے جیسے تذبذب میں رہی۔ آج اس کی شادی کی تھی، اور زبیر نے جس طرح جوشِ جذبات میں اسے پیار کر کے ی مبارک باد دی تھی۔ وہ اس کی محبت کی آئینہ دار تھی ایسے وقع پر اسے مانی کو یوں یاد نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس کا خیال تھا تو زبیر پر جذبوں کی شدت کو عیاں نہیں کرنا چاہیئے ——

یکن ——

ہ ——

یا کرتی ——

سالگرہ کے ساتھ برسی تھی۔ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا تھا ہر سال آئے گی تو اس کے ساتھ برسی بھی آئے گی۔

اس نے دونوں ہاتھوں پر اپنا سر گرا دیا۔

یا خدایا یہ کیسی سزا تھی۔ اس نے خوشی و ناخوشی کو کیوں ایک دوسرے ں طرح نتھی کر دیا تھا۔ مانی ایک دن پہلے کیوں نہ مرا۔ اس کی موت ی کے ایک دن بعد کیوں نہ واقع ہوئی۔

یکن ——

یا تو جب ممکن تھا۔ جب وہ طبعی موت مرتا ——

ہ طبعی موت تو نہیں مرا تھا۔

ادھر والی بالکنی سے عین اس وقت گرا تھا ـــــ جب وہ دلہن بنی زبیر کے پہلو میں بیٹھی پھولوں سے لدی گاڑی میں اپنے گیٹ سے باہر جا رہی تھی۔

ثومی کا دل بھر بھر آ رہا تھا ـــــ وہ جواں مرگ اس کی آنکھوں میں زندہ ہو رہا تھا ـــــ

وہ ـــــ

وہ کیسے آج سالگرہ کی خوشیاں منا لیتی ـــــ

زبیر اسی طرح اس کی طرف سے رُخ بدلے پڑا تھا۔ ثومی کے رویے سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔

آج کا دن خوشیوں کا پیغامبر تھا۔ اسے اک پاگل کی بری کے لئے واقف کر دینا حماقت تھی۔ اسے غصہ بھی تو اسی لئے آ رہا تھا۔

ثومی نے ہاتھوں سے سر اٹھایا۔ گردن گھما کر زبیر کو دیکھا وہ ناراض ہو گیا تھا۔ اسے ناراض ہونا ہی چاہیئے تھا ـــــ اس کا غصہ حق بجانب تھا۔

ثومی کو اس کے پیار کے اظہار کے بدلے اسی گرمجوشی سے پیار کا اظہار کرنا چاہیئے تھا۔

آخر مانی تھا ہی کون ـــــ ؟

مانی تھا ہی کون ـــــ ؟

اس سوال کا جواب اس کے اندر ہی اندر سوبل کھا رہا تھا جسے

وہ خود بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی، جس سے فرار چاہتی تھی جس کی نفی کرنے پر ہمیشہ تلی رہتی تھی۔

اب بھی ـــــ

اب بھی اس نے نفی کی ـــــ

وہ بے اختیارانہ زبیر کے اوپر جھک گئی۔

"جان ـــــ" اس نے بڑے پیار سے کہا۔

وہ ویسے ہی پڑا رہا۔

ثومی نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی "زیبی ـــــ"

زبیر نے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔

ثومی زبردستی مسکرا دی۔

زبیر روٹھے روٹھے انداز میں اسے گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔ "سارا مزا کرکرا کر دیا ـــــ"

"معاف کر دو ـــــ" ثومی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زبیر کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے کروٹ بدل کر ثومی کو بازوؤں میں بھر لیا۔

"سوری ثومی ـــــ"

ثومی کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

"ثومی پلیز رونا نہیں ـــــ مجھے اسی لئے تو برا لگا کہ آج ہماری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ خوشی و مسرت سے بھرپور دن ـــ اور تم اس

پاگل آدمی کا آج بھی ذکر لے بیٹھیں۔"

"یہ قدرتی امر ہے زبیر ——" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی —

"ہماری سالگرہ پر اس کی برسی ہوگی۔"

"ہاں وہ بھوت کی طرح ہماری اس خوشی سے لپٹا رہے گا۔ پاگل نے اس دن مرنا تھا۔"

اس نے ثومی کو بازوؤں میں دبوچ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ ثومی اس سانحے سے بُری طرح متاثر ہوئی تھی۔

شادی کے بعد کئی ماہ تک اس کی موت کا اثر اس کے ذہن پر رہا تھا۔

اور ——

آج ——

اس کی برسی بھی تھی۔ سالگرہ کے ساتھ ساتھ لپٹی اس برسی کو یقیناً درگزر نہ کیا جا سکتا تھا۔

"آج رات کھانا باہر کھائیں گے ——" اس نے پیار کرتے ہوئے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "تم وہی ساڑھی پہننا جو میں لایا ہوں۔ میں تمہارے گلے میں ہیرل کا ہار ڈالوں گا۔ یہ میری طرف سے شادی کی سالگرہ کا تحفہ ہوگا۔ لیکن جانم اصلی تحفہ وہی تھا جو میں نے بیدار ہوتے ہی دیا تھا سمجھیں۔"

اس نے ثومی کو تھپتھپایا۔ گدگدایا۔

ثومی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

پھر ——

اس کے سینے میں منہ چھپا کر بولی۔ "تم کتنے اچھے ہو زبیر۔ کتنے ہو ——"

وہ اپنے جذبات کی شدت وحدت اس پر واضح کرنا چاہتی تھی۔ اسے خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو رہی۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔

اور ——

کتاب ماضی کے اوراق وقت ہوا اڑائے جا رہی تھی۔

ثومی بی اے فائنل میں تھی —— شوخ و شنگ سی لڑکی جسے نہ کوئی غم تھا نہ مستقبل کی فکر —— ماں باپ بہن بھائیوں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔

اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ چچا اور ابو کی مشترکہ کوٹھی تھی جو نئی نئی تعمیر ہوئی تھی ڈوپلکس تھی۔

چچا خود تو سعودی عرب میں مقیم تھے۔ اس لئے کوٹھی کا دوسرا حصہ بھی انہی لوگوں کے تصرف میں تھا۔

بھائی اور بھیا اس حصے کے بیڈ روم استعمال کر رہے تھے کچھ کمروں میں چچا کا سامان بند تھا۔

اس دن ثومی کالج سے واپس آئی۔ کندھے سے بیگ برآمدے ہی میں اتار لیا تھا۔ کوریڈور سے ہو کر لاؤنج میں آئی۔ بیگ صوفے پر پھینکا اور دھم سے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ہانک لگائی۔

"چھمو ——"

نوکرانی کچن میں تھی۔ آواز سن کر وہیں سے بولی۔

"جی —— آئی جی ——"

چھمو کے آنے سے پہلے ہی دائیں ہاتھ کا دروازہ کھول کر اس کی چھوٹی بہن نومی نکل آئی۔

وہ بھی تھوڑی دیر پہلے اسکول سے آئی تھی۔ اسکول کا یونیفارم تک پہنے ہوئے تھی۔

"لو آگئی نومی ——" جوتے اتارتے ہوئے ثومی بولی۔

"ہوں ——"

"یہ منہ کیوں لٹکائے ہوئے ہے ——" اس نے موزے اتار جوتوں میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

نومی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیوں ——"

نومی اس کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ثومی باجی ——"

"ہوں ——"

"بھابی اندر رو رہی ہیں ——"

"کیوں ——؟"

"ان کا فون آیا تھا جی ——" چھمو نے نومی کی جگہ جواب دیا وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کچن سے نکل آئی۔

وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

ثومی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھول کر چھمو کو دیکھا اور جلدی سے بولی۔

"کس کا فون تھا ——؟"

"شاید ان کی بھابی کا ——"

"ایسی کیا بات ہوئی تھی ——"

"پتہ نہیں جی ——"

"بھابی ہیں کہاں ——"

ثومی نے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اندر ہیں ——"

"ہاں ——" نومی بولی

"تم نے پوچھا نہیں ان سے ——"

"نہیں ——"

"بڑی بیوقوف ہو —— امی کہاں ہیں ——"؟

"وہ بڑی خالہ کی طرف گئی ہیں ——"

ثومی نے دوپٹہ بھی اتار دیا۔

اور قالین پر دبے دبے پاؤں رکھتی سامنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔

دروازہ کھولا۔ بھابی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اور رونے سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"بھابی ——" ثومی نے پکارا۔

اپنی پیاری سی بھابی کی بھیگی آنکھیں اور سرخ چہرہ دیکھ کر وہ بے چین ہو گئی۔

جیہ نے آواز پر اس کی طرف دیکھا پھر آنچل کے کونے سے جلدی جلدی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

"تم آگئیں ——" اس نے کہا

"بھابی کیا بات ہے —— آپ رو رہی تھیں ——" ثومی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

بھابی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن آنکھیں پھر چھلک آئیں ——

ثومی کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔ بازو جیہ کی گردن کے گرد لے جاتے ہوئے بڑے پیار سے بولی ——

"بتائیں نا —— کیا ہوا —— بھیا نے کچھ کہہ دیا؟"

"نہیں ——"

"پھر ——"

وہ چپ رہی ——

ثومی نے بار بار پوچھا تو بھابی نے گلوگیر آواز میں کہا "ثومی تم جانتی ہو نا —— میرا بھائی پاگل ہے ——"

"ہوں ——"

"امی اُبو حج پہ گئے ہیں —— اسے بڑے بھیا اور بھابی کے پاس چھوڑ گئے ہیں۔"

"ہاں ——"

"وہ شاید وہاں سے بڑی آپا کے پاس کویت بھی جائیں گے۔ تین چار ماہ تو انہیں لگ ہی جائیں گے۔"

"ہوں ——"

"بھابی مانی کو نہیں رکھ سکتیں ——"

"تو ——"

"اس نے فون کیا ہے کہ میں اسے جا کر لے آؤں۔"

ثومی چند لمحے چپ رہی ——

جیہ پھر بولی ——

"بھابی اسے چند دن بھی نہیں رکھ سکیں۔ وہ بیچارہ۔ خدا نے اسے پتہ نہیں کیوں زندہ رکھا ہے۔"

"بھابی ——"

"جیہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

ثومی کو سمجھ نہ آرہا تھا بھابی سے کیا کہے۔ مانی پاگل تھا کسی کسی وقت تو وہ بیحد خوفناک حرکتیں کرنے لگتا تھا۔ زیادہ تر خاموش ہی رہتا تھا۔

سوجھ بوجھ تو تھی ہی نہیں۔ ہاں کبھی غصّہ بہت آتا تھا۔ یا کوئی بات ناگوار گزرتی تو اپنے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کر زخمی کر لیتا۔ ایک نوکر اس کی دیکھ بھال کے لئے مقرّر تھا۔ پھر بھی گھر والوں کو اس کی نگہداشت کرنا پڑتی تھی۔

یہ بہت بڑی ذمّہ داری تھی۔ بھابی کو کیا پڑی تھی کہ اتنی مصیبت اٹھاتیں۔ اس نے صاف صاف جیہ سے کہہ دیا کہ جب تک امّی ابّو نہیں آجاتے وہ اسے اگر لے جائے۔

جیہ شش و پنج میں تھی۔ ساس سسر اور نندوں والا گھر تھا۔ ایک پاگل کو وہ کیسے یہاں اٹھا لاتی۔ دکھ تو تھا —— اتنا جوان بھائی اور پاگل ——

ثومی نے چند لمحے سوچا۔

پھر بولی۔ "بھابی آپ اسے لے ہی آئیں۔"

"ثومی ——"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ اس بیچارے کا کیا قصور ——

بھابی کو تو ظاہر ہے اس سے اتنی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ آپ نہیں۔ آپ اس کی دیکھ بھال جس طرح دیکھ بھال کر سکتی ہیں وہ تو ہیں کر سکتی۔"

"لیکن ——"

"لیکن کیا بھابی ——"

"وہ پاگل ہے ثومی۔ اور کسی کسی وقت تو وہ بہت خوفناک ہو جاتا ہے۔ یہاں سب ——"

"انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے ——"

"وہ تو ——"

"آپ ہماری طرف سے کوئی بات دل میں نہ لائیں۔ بھیّا سے کہیں گے اور امی بھی یقیناً برا نہیں مانیں گے۔"

جیہ نے نفی میں ہولے ہولے سر ہلایا۔

پھر آہستگی سے بولی۔

"وہ یہاں آیا تو سب کو ڈسٹرب کرے گا۔ وہ ہوش میں تو نہیں ہوتا نا۔ آپ سب لوگوں کو بیزار کرے گا۔"

"اوہ بھابی ——" ثومی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کچھ تو کرنا ہی ہے نا —— آپ کی بھابی نے تو صاف صاف آپ سے کہہ دیا ہے۔"

"ہاں ——"

"پھر سوچتی کیا ہیں ——— رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

پھر ———

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے چٹکی بجائی اور جلدی سے جیہ پر جھک کر بولی۔

"بھائی کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ اسے یہاں لے آئیں ———"

"کوئی مسئلہ نہیں ———؟؟"

"ہاں ———"

جیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ثومی بولی۔ "ساتھ والا حصہ خالی پڑا ہے نا۔ اس طرف مانی کا کمرہ بنا دیں۔ پھر اس کا ملازم بھی تو اس کے ساتھ رہتا ہے۔ آپ کا خدشہ بھی دور کہ اس گھر والے اس کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں گے۔ کوٹھی خالی ہی تو پڑی ہے۔ آپ اپنا بیڈ روم ادھر لے آئیں ٹھیک ——— وہ حصہ اس کے لئے رہنے دیں۔"

ثومی کی بات معقول تھی۔

پھر ———

وہ ———

اصرار بھی تو کر رہی تھی۔ ابو امی اس کی بات مانتے تھے یقیناً اس کے کہنے پر وہ بھی رضامند ہو جائیں گے۔

جیہ نے دل ہی دل میں ثومی کو دعائیں دیں۔ اس نے اک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔

مانی کے لئے ساتھ والے پورشن میں کمرہ ٹھیک کر دیا گیا اس کے ملازم کے لئے بھی ادھر ہی بندوبست کر دیا گیا۔

اس نے ہلکے پستئی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے جو اس کی خوبصورت لیکن وحشت زدہ آنکھوں کی رنگت سے بڑی مناسبت رکھتے تھے۔

اس کا قد تقریباً چھ فٹ تھا جسم صحت مند تھا۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ بال سنہری نہیں تھے لیکن جب ان پر روشنی پڑتی تو ہلکا ہلکا سنہرا پن بکھر جاتا۔ یہ بال اس کی رنگت اور سبزی آل آنکھوں کے ساتھ مناسبت رکھتے تھے۔

ثومی مانی کو دیکھنے آئی ———

جیہ مانی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ بالکل خاموش تھا ذرہ بھر گمان نہ ہوتا تھا کہ اتنا کڑیل جوان حواس کی دنیا سے دور ہے ثومی نے ڈرتے ڈرتے اس پر نگاہ ڈالی۔

"آجاؤ ———" جیہ نے کہا۔

وہ جھجکتے جھجکتے آگے بڑھی ———

مانی نے اس کی طرف دیکھا۔ ثومی گھبراہٹ میں ہاتھ ماتھے تک لے گئی۔ سلام مقصود تھا۔

لیکن ———

مانی کو سلام کا کیا پتہ تھا۔ وہ اس کی جانب تکے گیا اور اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

مانی یہ ثومی ہے ——— " جیہ نے اس کا کندھا ہلا کر کہا " صبور کی بہن ہے ——— "

لیکن وہ ایک ٹک اسے تکے گیا۔ آنکھوں کے ساتھ اس کا منہ بھی کھل گیا۔

اور چند لمحوں بعد اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگا۔

جیہ نے جلدی سے اس کا منہ صاف کر دیا۔

ثومی اس کی نگاہوں سے ڈر گئی۔ اس نے واپس جانے کے لئے قدم اٹھایا۔

" آجاؤ ثومی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ جسے دیکھ کر چپ رہے تو سمجھ لو کہ اس سے خوش ہے۔ ورنہ مارنے کو اٹھ دوڑتا ہے۔ اور مارے نہ بھی لگے تو اپنے آپ کو گزند پہنچانے لگتا ہے شکر کی بات یہ ہے کہ دوسروں کو مارتا پیٹتا نہیں " ۔

جیہ نے بڑے دکھ سے کہا۔

ثومی پرے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ اب بھی اسے تکے جا رہا تھا۔

" یہ دیکھو اس کے ہاتھ بازو — کاٹ کر زخمی کر لیتا ہے " جیہ نے اس کے زخموں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

" یہ آپ کو پہچانتا ہے بھابی ——— " ثومی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" کسی وقت ——— " جیہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ " وہ بھی صرف پیار کو پہچانتا ہے۔ اسے یہ علم نہیں کہ کس سے کیا رشتہ ہے۔ امی ابو سے بہت مانوس تھا نا۔ مجھ سے بھی ہے۔ چند دن بھابی کے ساتھ رہا تو دیکھ لو کس طرح اپنے آپ کو زخمی کر لیا " ۔

ثومی کو بڑا دکھ ہوا ———

وہ اب بھی اسے تکے جا رہا تھا اور اس کے کھلے منہ سے رال ٹپک رہا تھا جسے جیہ بار بار صاف کر رہی تھی۔ اس کا جسم بھی ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔

" کیا دیکھ رہے ہو مانی ——— " ثومی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

اس کے جواب میں اس نے منہ اور کھول دیا۔ پھر وہ ہنس پڑا —

ثومی کا دل تھم جانے کو تھا — ایسی خوفناک ہنسی اس نے بھلا کہاں دیکھی تھی ———

جیہ مانی کو پکڑے ہوئے تھی ——— وہ عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا ——— جب وہ بہت خوش ہوتا تو ایسی ہی آوازیں نکالا کرتا تھا۔

جیہ نے ثومی سے کہا۔

" ڈرو نہیں ——— تمہیں دیکھ کر خوش ہو رہا ہے " ۔

ثومی ڈر رہی تھی ——— جیہ کا دل رکھنے کو گھبرائے گھبرائے

لہجے میں بولی۔

"میں ڈر تو نہیں رہی ہوں بھابی ویسے ترس آرہا ہے مجھے۔ اُف آپ کی امی اور ابو ان کی نگہداشت کیسے کرتے ہوں گے۔"

جیہ بڑے دکھ سے بولی۔ "بس تقدیر میں یہی تھا برسوں سے اس کا دکھ جھیلتے آرہے ہیں۔"

جیہ اس کے متعلق ثومی کو بتانے لگی۔ ثومی دل ہی دل میں اس کے اور اس کے والدین کے دکھ کا اندازہ کرنے لگی۔

دروازہ بند تھا۔ کھڑکی کے پٹ کھلے تھے باہر کی طرف جالی اور گرل تھی۔ ثومی نے اس کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ مانی فرش پر پڑا تھا داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے بے حد میلے تھے۔ بیڈ پر بستر لگا تھا لیکن ——

وہ ٹھنڈے فرش پر گہری نیند سو رہا تھا۔ کچھ ٹوٹے برتن فرش پر پڑے تھے۔ ایک طرف دودھ گرا ہوا تھا اور ٹوسٹ کے ٹکڑے جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔

ثومی کو ننگے ٹھنڈے فرش پر پڑے مانی کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ وہ الٹے پاؤں گئی اور کچن میں دوپہر کا کھانا بناتے بھابی کو جالیا۔

"بھابی ——" اس نے کہا۔

"ہوں ——" جیہ کی آنکھیں رونے سے سوجی ہوئی تھیں۔ ثومی نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا بھابی ——"

"بھابی ۔ مانی ٹھنڈے فرش پر سکڑا سمٹا پڑا ہے۔ اسے کہیں ٹھنڈ لگ جائے ——"

"میں کیا کروں ——" جیہ نے بیزاری سے کہا۔

لیکن ——

اس کے آنسو بھی امنڈ پڑے۔ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بڑے کرب سے بولی۔

"میں اسی لئے تو اسے یہاں لاتی نہیں تھی اسے سنبھالنا آسان کام تو نہیں نا —— سب کو بیزار ——"

"بھابی —— آپ یونہی پریشان ہو رہی ہیں۔ کسی نے آپ سے کچھ کہا ——"

"نہیں —— لیکن ثومی مجھے خود تو احساس ہوتا ہے نا کل ساری رات نہیں سویا۔ کمرہ سر پہ اٹھائے رکھا۔"

"ہائے —— اس بیچارے کا کیا قصور ——"

"وہ تو ٹھیک ہے ثومی —— لیکن —— اب —— صبح ناشتے کے برتن توڑ دیئے —— کچھ نہیں کھایا۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتا کیا کروں۔"

"خیرو چاچا کے کہنے سے تو ——"

"کل سے اس سے بھی بگڑا ہوا ہے ـــــ اسے قریب نہیں آنے دیتا ـــــ"

"ہائے اللہ ـــــ"

"اب زمین پر پڑا ہے ـــــ ٹھنڈ ـــــ"

"بھابی آپ نے میٹنگ کیوں اٹھوا دی۔ جب پتہ ہے کہ وہ زمین پر بھی پڑ سکتا ہے تو ـــــ"

"ثومی اس نے تین چار دن ہی میں میٹنگ کا ستیاناس کر دیا کبھی پانی گرا دیتا ہے۔ کبھی دودھ اس دن سارے چاول اور سالن میٹنگ پر بکھیر کر کھا رہا تھا۔"

"جو کچھ بھی ہے آپ میٹنگ بچھوا دیں ـــــ بیچارہ ٹھنڈے فرش پر پڑا ہے۔"

ثومی نے بار بار بھابی سے میٹنگ بچھوانے کو کہا۔

"خراب ہو جائے گی تو کیا ہوا ـــــ اپنی کونسی بے انتہا قیمتی چیز ہے ـــــ آپ وہاں بچھوا دیں اور برتن بھی اس کے لئے ان بریک ایبل رکھیں۔"

وہ جیہ کو تسلی و تشفی دینے کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیتی رہی جیہ نے اسی دن کمرے میں میٹنگ بچھوا دی۔

اس دن اس کا موڈ خوشگوار تھا اس نے شیو بھی خیرو چاچا سے بنوائی تھی اور کپڑے بھی بدلے تھے اب ثومی کا خوف اس سے دور ہو گیا تھا۔

اور ـــــ

وہ جیہ کے ساتھ اکثر اس کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ اس پاگل جوان کے لئے اس کے دل میں بڑی ہمدردی تھی

"دیکھو مانی روز شیو کرا لیا کرو۔ بہت اچھے لگتے ہو اس طرح۔" ان نے مانی سے ہنس کر کہا۔

مانی اس کی بات سمجھا یا نہیں ـــ اسے دیکھ کر ہنسنے ضرور لگا۔ ہنسی کسی طور ہنسی نہ لگتی تھی بے تکے پن سے آواز نکال نکال کر دانت دکھا دینے کو ہنسی تو نہیں کہا جا سکتا۔

"آج یہ بہت خوش ہے ـــــ" جیہ نے ثومی سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے بھابی ـــــ اس طرح رہے تو پاگل پاگل نہیں لگتا ـــــ"

"اس طرح رہے تو جب نا ـــــ"

"باتیں نہیں کر سکتا بیچارہ ـــــ"

"اس کی باتیں یہ مختلف آوازیں ہی ہیں۔"

وہ اب ثومی کو دیکھ دیکھ کر سر ادھر ادھر مارتے ہوئے غاں واں جیسی آوازیں نکال رہا تھا۔

ثومی نے ہنس کر کہا ــــ "بہت خوش ہو مانی ــــ کیا بات ہے ــــ"

وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

ثومی کو دیکھ کر حیرانگی سے آنکھیں پھیلانے لگا۔ پھر اس نے بڑی تیز سی غراہٹ حلق سے نکلی اس کا جسم حسبِ معمول ہولے ہولے کانپنے لگا۔

ثومی ڈری تو نہیں ــ البتہ جیہ کے ساتھ لگ کر ضرور بیٹھ گئی یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی پر وار کرنے کو ہے۔

جیہ نے ڈانٹ کر کہا۔

"مانی ــــ آرام سے بیٹھو ــــ"

وہ کئی لمحے اسی طرح غراتا رہا ــ

خرخر کی آوازیں حلق سے نکالتا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔

ثومی کو اس کی بے بسی پر بڑا ترس آیا۔ اس کا جی چاہا۔ اٹھ کر اس کے کندھے پر تھپکی دے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے پُرسکون ہونے کے لئے کہے۔

وہ الٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہا۔

خیرو چاچا بھی کمرے میں ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ کل رات مانی نے اس کے بازو پر کاٹ لیا تھا۔

وہ بازو پر پٹی باندھے ہوئے تھا۔ مانی کو شروع ہی سے اس نے پالا تھا۔ اس لئے اس پاگل لڑکے سے اسے اُنس ہو گیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اب بھی اس سے چپکا ہوا تھا ــ ملازمت کو ملازمت نہیں بلکہ فرض سمجھ کر نبھا رہا تھا۔

دو دن سے اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ بھوکا پیاسا پڑا تھا۔ چاچا خیرو تھک ہارا تھا۔ جیہ نے بھی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کھاتا تھا۔

خیرو اور جیہ جانتے تھے کہ وہ ناخوش ہے۔

لیکن ــــ

کیوں ناخوش ہے۔ انہیں پتہ کیسے چلتا۔

ثومی دو دن سے ماموں کے ہاں گئی تھی۔ ماموں اسلم کی بیٹی اس کی کلاس فیلو تھی۔ ہوم اکنامکس دونوں کا سبجیکٹ تھا کچھ سلائی کی چیزیں تیار کرنا تھیں۔

تیسرے دن واپس آئی ــ تو جیہ کا چہرہ بے طرح اداس تھا اور اترا ہوا تھا۔

"خیریت بھابی ــــ" وہ بولی۔

جیہ نے یونہی سر ہلا دیا۔

"کیا بات ہے بھابی ــــ؟ اتنی پریشان کیوں ہیں ــــ مانی کی

وجہ سے۔"

"اس نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا ـــــ لاکھ جتن کر چکی ہوں۔"

"کیوں ـــــ"؟

"اس کا کون جواب دے ثومی ـــ وہ کچھ بتا تھوڑی سکتا دونوں ہاتھ کاٹ کاٹ کر لہولہان کر لئے ہیں ـــ آج تو دیوار سے ٹکریں مار رہا تھا ـــــ"

کہتے کہتے جیہ کا دل بھر آیا۔ وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

ثومی کا دل جیسے کسی نے برچھی سے زخمی کر دیا۔ وہ بیحد حساس لڑکی تھی۔ بھابی کا دکھ اس سے دیکھا نہ گیا۔

"کچھ بھی نہیں کھایا اس نے۔" ثومی نے پوچھا۔

جیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آئیں میرے ساتھ ـــ میں کوشش کروں۔ میری بات کچھ کچھ مان لیتا ہے۔"

جیہ پہلے تو چپ رہی۔

لیکن جب ثومی نے اصرار کیا تو ٹرے میں کھانا لگانے کچن میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے اٹھائے آ گئی۔ ثومی نے کپڑے تبدیل کر لئے۔ اب اس نے بڑا پیارا سا سوٹ پہنا تھا نیکش مور اس کا پسندیدہ

ب تھا۔

بالوں میں اس نے برش کر کے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جیہ کے ساتھ مانی کے کمرے کی طرف آئی۔ مانی کونے میں دیوار کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔

"مانی ـــ" جیہ نے آواز دی۔

"صبح سے اسی طرح کھڑا ہے ـــــ" چاچا خیرو نے کہا

"مانی ـــ" اب خیرو نے پکارا۔

وہ اسی طرح کھڑا رہا۔

"مانی ـــ" ثومی نے آواز دی۔

وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

جیہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دی۔ آگے بڑھی اور اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"اُف سارا ہاتھ لہولہان ہے ـــــ" ثومی کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرا رہے تھے۔

کتنا ترس آ رہا تھا۔ بیچارے پر ـــ وہ بے اختیارانہ آگے بڑھی اور ہمدردی سے بولی۔

"اُف مانی تم کیا کر لیتے ہو ـــــ"

مانی کا چہرہ جیہ نے زبردستی اپنی طرف گھما لیا تھا آج پھر اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ چہرہ

پسینہ پڑا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں ـــ ثومی نے دکھ سے اسے دیکھا۔

جیہ اور وہ اس سے باتیں کرنے لگیں۔ لیکن وہ سن سمجھ کچھ نہیں رہا تھا۔ جیہ نے زبردستی اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ وہ کبھی جیہ اور کبھی ثومی کو دیکھنے لگا۔

کافی دیر وہ اسے سمجھاتی رہیں۔

لیکن ـــــ

وہ ـــــ

بالکل خاموش خالی نظروں سے انہیں تکتا رہا۔

"کھانا کھا لو ـــــ" جیہ ٹرے اٹھا لائی۔

"سنبھال کے رکھنا بی بی۔ کہیں ٹرے الٹ نہ دے" چاچا خیرو نے کہا۔

"نہیں الٹے گا ـــــ" ثومی بولی۔ پھر جیہ سے کہا۔ "لاؤ بھابی میں کھانا دوں اسے"

اس نے ٹرے جیہ سے لے لی اور میز پر رکھ کر میز مانی کے سامنے رکھ دی۔ مانی ٹرے کی بجائے اسے تکنے لگا۔

"کھانا کھاؤ مانی ـــــ" ثومی نے اس کی نظروں سے بچنے کے لئے کہا۔

لیکن وہ اسی طرح اسے تکے گیا۔

اس کی آنکھیں کھلتی گئیں، منہ بھی کھل گیا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا ـــــ

"کھا لو مانی۔ دیکھو تم دو دن سے بھوکے ہو" ثومی نے پھر اس کی نظروں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

لیکن وہ بالکل متوجہ نہ ہوا ـــــ

اس کی حالت ویسی ہی رہی ـــــ

ثومی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور ـــــ پھر ـــــ

پھر ـــــ

مانی کو جانے کیا ہوا اس نے ایک کلانچ بھری صوفے سے زمین پر آ رہا ـــــ اور پھر بندروں کی طرح قلابازیاں مارنے لگا۔ وہ مختلف قسم کی آوازیں بھی نکالے جا رہا تھا۔

بڑی مشکل سے خیرو جیہ اور ثومی نے اسے سنبھالا۔ وہ آلتی پالتی مار کر میٹنگ پر بیٹھ گیا۔

جیہ اور ثومی بھی وہیں بیٹھ گئیں۔ پھر ثومی نے کھانے کی ٹرے میز سے اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔

"کھاؤ ـــــ" ثومی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لیکن اس نے ایک نوالہ بھی نہ توڑا ـــــ

کافی دیر تک وہ اسے کھانے کے لئے اکساتی رہی۔ لیکن جب وہ کسی طور آمادہ نہ ہوا ثومی نے نوالہ توڑ کر سالن میں دبویا اور پھر مانی

کے منہ کی طرف بڑھایا۔

مانی نے اس کا ہاتھ کلائی سے پکڑ لیا وہ ڈری ——

لیکن ——

دوسرے ہی لمحے مانی نے اس کے ہاتھ کا نوالہ منہ میں پکڑ لیا۔

جیہ نے اطمینان کا سانس لیا ——

دوسرا نوالہ اس نے بنایا ——

لیکن اس نے اس کے ہاتھ سے نوالہ نہیں کھایا۔

ثومی نے پھر کوشش کی ——

اب مانی نے اس کے ہاتھ سے بھی نوالہ نہیں لیا۔

چاچا خیرو آگے بڑھا۔ اس نے اس کے منہ میں نوالہ ڈالا۔ وہ بغیر چبائے نگل گیا۔

لیکن دوبارہ اس نے خیرو سے بھی کھانا نہیں لیا۔

ثومی نے پھر نوالہ بنایا —— "لو مانی ——" اس نے پیار سے کہا۔

مانی نے نوالہ پکڑ کر منہ میں ڈال لیا۔

پھر ——

مانی کسی پالتو جانور کی طرح اس سے کھانا کھانے لگا۔

ثومی ہمدردی کے جذبے سے مانی کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اسے مانی سے زیادہ جیہ پر ترس آ رہا تھا۔ وہ جیہ کا کام بھی اپنے ذمہ لے رہی تھی۔

اکثر وہ خود ہی مانی کے کمرے میں چلی جاتی۔ کبھی کبھی تو وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اس کے آنے کا نوٹس ہی نہ لیتا۔

لیکن ——

کبھی ——

کبھی وہ بڑی والہانہ خوشی کا اظہار کرتا۔ چھلانگیں لگانے لگتا۔ سر کے بل کھڑا ہو جاتا۔ قلابازیاں لگاتا۔ اور دانت نکال نکال کر کھی کھی کرتے ہوئے بڑی عجیب و غریب آوازیں منہ سے نکالنے لگتا۔ ایسے میں وہ ثومی کی باتیں بھی مانتا۔

وہ دودھ کا گلاس پکڑاتی تو غٹا غٹ پی جاتا۔ شیو کروانے کا کہتی تو خیرو چاچا کے سامنے چپ چاپ بیٹھ جاتا۔ کپڑے بدلوا لیتا۔ بعض اوقات ثومی کو یوں لگتا — کہ وہ ذہنی لحاظ سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہے ——

"لگتا نہیں کہ مانی پاگل ——" وہ کہتی۔

جیہ اس کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھتی اور گہری ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی ——

"ثومی خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم جتنی دیکھ بھال مانی کی کر رہی ہو۔

میں بھی نہیں کرتی۔ وہ تم سے بہت مانوس ہوگیا۔"

"خدا کرے وہ اسی طرح پرسکون رہے۔"

"آمین ——"

ثومی بیحد خوش تھی ——

اس کی خدمت سے ایک ایسے آدمی کے دن نسبتاً اچھے گزر رہے تھے جو صرف اپنے لئے ہی نہیں دوسروں کے لئے بھی پریشانی اور کوفت کا نشان تھا۔

وہ اس خدمت میں بڑی لگن سے مگن تھی۔

لیکن ——

اس کے گھر کے دوسرے افراد کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی اس دن ثومی نے اس سے کہا۔ "ثومی اس پاگل کے ساتھ تم بھی تو پاگل نہیں ہوگئیں۔"

اس کی امی بولیں "ہر وقت اس کے پاس گھسی رہتی ہو۔ وہ پاگل ہے ٹھیک ہے۔ لیکن جوان آدمی ہے۔"

امی اور ثومی کی باتوں پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس نے امی کی بات سنی نہ ثومی کی مانی کی دیکھ بھال میں اسی طرح لگی رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی دیکھ بھال مانی کے پاگل پن کا علاج ہے۔

وہ آہستہ آہستہ سوجھ بوجھ کی طرف آرہا تھا۔ وہ اس کی باتوں کو

بڑے غور سے سنتا تھا اور اس کی نصیحتوں پر کچھ کچھ عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

مانی کے منہ سے اکثر رال ٹپکتا رہتا جسے خیر و پاس ہوتا تو صاف کر دیتا یا جیہ ہوتی تو وہ اس کا منہ پونچھ ڈالتی۔

اس نے ثومی اس کے پاس تھی وہ اسے ناشتہ کرا چکی تھی۔ مانی خوش نظر آرہا تھا۔ منہ کھلا تھا اور رال ٹپکے جا رہا تھا۔

"مانی ——" ثومی نے کہا۔

مانی نے سنا نہیں۔ وہ دیوار کو گھورے جا رہا تھا اور رال ٹپکے جا رہا تھا ——

"مانی ——" اس نے تیزی سے کہا۔

جب بھی وہ متوجہ نہ ہوا تو اس نے اس کو کندھے سے پکڑ کر جھٹکا دیا اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔

مانی اس کی طرف پوری آنکھیں کھولے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا منہ اور کھل گیا اور جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

ثومی نے اس کی جیب سے رومال نکالا اس کے ہاتھ میں پکڑ کر اس کے منہ تک لے گئی —— رومال سے اس نے رال خود اسی سے صاف کرایا۔

مانی نے حیرت سے ہاتھ میں پکڑے رومال کو دیکھا۔

"منہ صاف کرو ——" ثومی نے کہا۔

مانی نے پہلے جیسی حرکت کی۔

"شاباش ——"

ثومی کو اپنی کامیابی پر خوشی ہوئی ——

شاید اسے خوش دیکھ کر مانی خوش ہوا۔ وہ بار بار رومال والے ہاتھ کو منہ پر رگڑنے لگا۔

ثومی ہنس پڑی ——

وہ بار بار منہ پونچھنے لگا ——

ثومی اسے سمجھانے لگی ——

"مانی یہ منہ سے جو رال ٹپکتا ہے نا اسے پونچھ لیا کرو۔ بُرا لگتا ہے تم اتنے بڑے ہو۔ رال تو بچوں کے منہ سے ٹپکتے ہیں۔"

وہ سر کھپاتی رہی ۔۔ مانی کو سمجھ بھی آ رہی تھی یا نہیں ۔۔ وہ تو بس مشینی انداز میں رومال والا ہاتھ اٹھا رہا تھا اور منہ صاف کر رہا تھا کئی دن وہ اسے رال پونچھنے کی تربیت دیتی رہی۔ کبھی تو یوں لگتا کہ وہ سیکھ گیا ہے۔

لیکن ——

کبھی ——

یوں لگتا کہ اسے اس تربیت سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

لیکن اس تربیت کا خوشگوار اثر کچھ ہوا ہی تھا۔ اس دن ثومی مانی کے کمرے میں گئی تو وہ منہ میں رومال ٹھونسے اضطرابی انداز میں ٹہل رہا تھا۔

اس سے رومال نکالنے کو کہتے کہتے تھک گئی تھی۔ لیکن وہ منہ میں اسی طرح رومال ٹھونسے ہوئے تھا۔

"یہ کیا ——؟" ثومی نے پوچھا۔

"دیکھ لو ——" جیہ بولی۔

"کب سے ایسے پھر رہا ہے ——"

"کافی دیر سے ——"

"اچھا —— لیکن یہ رومال ——؟"

"بار بار رومال سے رال پونچھتا تھا۔ پھر جانے کیا سوجھی پورا رومال ہی منہ میں ٹھونس لیا۔"

ثومی دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "بیچارہ —— شاید بار بار رال پونچھنے سے یہی بہتر سمجھا ہوگا کہ رومال منہ میں ٹھونس لے۔"

"مانی ——" ثومی اس کے سامنے گئی۔

مانی نے رک کر اس کو دیکھا ——

پھر اس کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اسے چکر دے ڈالا۔ جیہ جلدی سے لپکی اور ثومی کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی اس کی گرفت بے حد سخت تھی۔

بمشکل اس نے اپنا آپ اس سے چھڑایا۔

اب ——

وہ خود ہی گھومے جا رہا تھا۔ منہ میں اسی طرح رومال ٹھونسا تھا۔

اور اپنی خوشی کے اظہار میں وہ ثومی کو بھی تکے جا رہا تھا جو صوفے پر بیٹھی اپنے دونوں بازو سہلا رہی تھی۔

ثومی کی نسبت بچپن ہی میں زبیر سے ٹھہرائی جا چکی تھی۔ زبیر اس کی خالہ کا لڑکا تھا۔ بے شمار دولت تھی۔ زمینیں اور باغات ـــ وہ ان دونوں لائی تعلیم حاصل کرنے یو کے گیا ہوا تھا۔ واپس آتے ہی شادی ہو جانا تھی۔

دونوں طرف سے کافی دیر سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ زبیر واپس آنے والا تھا ـــــ

اور ـــــ

جن دنوں ـــــ

ثومی اک پاگل کو سدھارنے کے پاگل شغل میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ واپس آ گیا۔

اس دن ثومی مانی کے سو جانے کے بعد کوئی دس بجے کے قریب اپنے کمرے میں آئی تو نومی اس کے کمرے میں تھی۔ ثومی خوش خوش اندر آئی۔

اس نے مانی کو سکون کی دوائیاں دے کر سونے کی عادت ڈال دی تھی۔ اب وہ رات بھر سویا رہتا تھا ورنہ تو رات کے بیشتر حصے وہ شور مچاتے اونچی اونچی آوازیں نکالتے اور بین کی سی پُرسوز غراہٹیں

حلق سے نکالتے گزار دیا کرتا تھا۔

"ثومی باجی ـــــ" نومی نے کہا۔

"ہوں ـــــ"

"آپ کو کچھ ہوش بھی ہے ـــــ"

"کیوں ـــــ؟"

"آپ کی شادی ہونے والی ہے ـــــ"

"تو کیا ہوا ـــــ؟"

"اب آپ پاگل کا پیچھا چھوڑ دیں ـــــ کچھ اپنی طرف توجہ دیں۔ اپنے کام کریں ـــــ"

وہ ـــــ

اطمینان سے بیڈ پر بیٹھ کر بولی۔ "نومی ـــــ شادی تو ہونا ہی ہے ہو جائے گی۔ مجھے تو اس بات سے تسکین مل رہی ہے کہ میں اک پاگل کو اس کی دنیا میں لانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"توبہ ثومی ـــــ پاگلوں کی سی کوشش ہے یہ ـــــ"

"اوں ہوں ـــــ"

"بس اب اس کا پیچھا چھوڑ دیں ـــــ"

"وہ مجھ سے بے حد مانوس ہو گیا ہے۔ صرف اور صرف میری بات مانتا ہے۔ کھاتا پیتا بھی میرے کہنے پر ہے۔ میری نگہداشت سے وہ اس قابل تو ہو گیا ہے نا ـــــ"

"ثومی باجی ——"

"ہوں ——"

"آپ نے اس کو اپنے ساتھ اتنا ہلا لیا ہے کل کو شادی ہو گئی آپ چلی گئیں تو وہ ——"

"میری ذمہ داری تم سنبھال لینا ——"؟

ثومی نے کانوں کو چھو کر کہا۔ "توبہ۔ مجھے تو اسے دور ہی سے دیکھوں تو خوف آتا ہے۔"

"بالکل بے ضرر سا ہے۔ بچوں سے بھی زیادہ بے ضرر —— خواہ مخواہ خوفزدہ ہوتی ہو —— تم بھی اس کے پاس بیٹھا کرو ——" ثومی نے کہا۔

"توبہ —— توبہ ——" ثومی نے سر ادھر اُدھر مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو اس کی آنکھوں سے خوف آتا ہے۔ جب گھور گھور کر دیکھتا ہے تو ——"

ثومی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا نا بالکل بے ضرر ہے۔ شکر کی یہی بات ہے کہ خطرناک حرکتیں نہیں کرتا —— مارتا وارتا نہیں بس زیادہ غصے میں ہو تو اپنے آپ ہی کو کاٹنے لگتا ہے۔ ہاتھ بازو کاٹ کاٹ کر زخمی کر لیتا ہے۔"

"آپ تو اس کی ایک ایک حرکت سے واقف ہو گئی ہیں نا ——" ثومی بولی ——

"مجھے تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ سکون ملتا ہے۔ اک باؤلے انسان کی خدمت ہی سہی۔"

"یہ خدمت چھوڑیئے محترمہ —— شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔" ثومی نے کہا۔

"ہائے ثومی —— میں سوچتی ہوں —— میرے جانے کے بعد اس کی دیکھ بھال ——"

"جیہ بھابی کریں گی اور کون کرے گا۔ پھر دو ماہ بعد اس کے امی ابو بھی تو واپس آ رہے ہیں ——"

"ہاں ——"

دونوں بہنیں دیر تک باتیں کرتیں رہیں۔

مانی بالکل سدھائے ہوئے جانور کی طرح ہو گیا تھا۔ انسان جانور کو مغلوب کر لیتا ہے۔ انہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ انہیں بنیادی جذبوں کے اظہار کی تربیت دے سکتا ہے۔ تو اک باؤلے پگلے انسان کو بھی تو مسلسل محنت سے محبت سے پیار سے سدھایا جا سکتا ہے ——

ثومی کے ذہن میں یہی سچائی گھر کر گئی تھی۔ خدمت کے جذبے سے دل سرشار تھا —— وہ انہی خطوط پر مانی کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ وہ اس سے مانوس ہو گیا تھا —— اور اکثر اس کی بات مان لیا

کرتا تھا۔

ثومی کے من میں روشنی کی اک کرن لو دینے لگی تھی۔

وہ سوچتی ——— ؟

"کیا خبر میرے رو لے۔ میری دیکھ بھال اور میری لگن سے یہ پاگل اتنا سنبھل جائے کہ زندگی اس کے لئے اتنی تلخ۔ اتنی بار اور ایسی تکلیف دہ نہ رہے۔"

اس کی حرکات اتنی نارمل نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی شور و غل مچاتا تھا۔ چیخ چیخ کر حلق پھاڑ لیتا۔ الماری میں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ کھانے پینے سے انکار کر دیا۔

شیو کروانے سے بھاگتا ———

کپڑے بدلنے سے بدکتا ———

لیکن ———

جب ثومی مسلسل کہے جاتی۔ اصرار کرتی۔ اشاروں سے سمجھاتی۔ تو وہ پالتو جانور بن جاتا۔

جیہ سے وہ اب بھی بدکتا تھا۔ جیہ بیچاری ثومی کی احسانمند تھی جب وہ کسی بات پر بری طرح اڑ جاتا یا چیخنے چلانے سے باز نہ آتا تو وہ بھاگی آتی۔

ثومی سے کہتی۔

"پلیز چل کر اسے دیکھو ——— !"

ثومی فوراً جاتی ——— اور کوشش کر کے اسے خاموش کرا دیتی ———

شادی کا ہنگامہ شروع ہوا تو ثومی کو مانی کی دیکھ بھال کا موقع ملنا مشکل ہو گیا۔ گو وہ کچھ وقت نکال ہی لیتی تھی۔ دن میں دو چار مرتبہ اسے دیکھ ہی آتی تھی۔

لیکن ———

جو ذمہ داری اس نے اب تک اٹھا رکھی تھی۔ اس میں کوتاہی ہونے لگی ———

اس دن وہ بازار گئی تھی۔ ثومی اور امی ساتھ تھیں۔ ڈھیر ساری شاپنگ کر کے رات گئے گھر آئی تو بے حد تھکی ہوئی تھی۔ کھانا کھاتے ہی وہ بستر میں جا گھسی ——— تھکی ہوئی تھی۔ جلدی نیند نے آ لیا۔ وہ مانی کو دیکھنے نہ جا سکی۔

وہ رات کا جانے کونسا پہر تھا ———

کہ ———

دروازے پر دستک ہوئی ———

وہ نیند سے بیدار ہو گئی ———

"کون ———" وہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔

"ثومی ———" جیہ بھابی کی روہانسی آواز تھی۔

"جیہ بھابی ——"

"ہاں ——"

"کیا بات ہے ——؟"

"ثومی —— وہ ——"

ثومی اٹھ کھڑی ہوئی —— دروازہ کھولا —— جیہ بھابی پریشان حال کھڑی تھی۔

"ثومی —— مانی آج بالکل نہیں سویا۔ چلاتے چلاتے گلا بیٹھ گیا ہے۔ ہاتھ کاٹ کاٹ کر لہولہان....."

بھابی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ثومی پریشان ہوگئی ——

مڑ کر اس نے میز پر پڑی گھڑی دیکھی۔ تین بجنے میں پانچ منٹ تھے۔

اس نے جیہ کی طرف دیکھا ——

"خیرو چاچا بھی ہار گیا ہے۔ اور میری ——"

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا —— دوائی دی تھی اسے ——؟؟"

جیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "آج اس نے کھانا بھی نہیں کھایا دوائی بھی نہیں پی —— کھانا سارا ہی بکھیر دیا —— وہ ——"

ثومی نے پاؤں میں چپل ڈالے۔ شال اوڑھی۔ اور جیہ کے ساتھ

باہر آگئی۔

مانی کو بڑے جتنوں سے اس نے قابو کیا۔

گھنٹہ بھر کی مغز کھپائی کے بعد اسے کھانا کھلایا اسے دوائی دی۔

اور ——

جب تک وہ دوائی کے غلبے سے مغلوب نہ ہوگیا۔ اس نے ثومی کو سامنے بٹھائے رکھا۔

خوشی کی غراہٹیں منہ سے نکالتا رہا —— آنکھیں پھیلائے گیا اور کانپتے وجود سے اسے سامنے بٹھائے رکھا۔ رال اس کے منہ سے ٹپک رہا تھا —— ثومی کے بار بار سمجھانے اصرار کرنے —— اور اشاروں سے بتانے پر بھی اس نے رومال سے رال صاف نہ کیا جیہ نے ہی یہ فریضہ ادا کیا۔

اور جب خواب آور دوائی اپنا اثر کر گئی۔ وہ بستر پر اوندھا پڑ گیا تو جیہ کی آنکھوں میں بے خوابی اور تشویش کے سائے گڈمڈ ہونے لگے ——

وہ پریشانی سے بولی ——

"یہ تم سے بہت مانوس ہوگیا ہے ——"

"ہاں ——" ثومی بھی کچھ کچھ پریشان ہوگئی۔

"تم چند دنوں کے بعد اپنے گھر چلی جاؤ گی —— پھر —— پھر اس کا کیا ہوگا ——"

ثومی کوئی جواب نہ دے سکی ـــــ اس کے دل میں جذبۂ ترحم موجزن تھا ـــــ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ مانی جو کچھ فیصلہ اس کی کاوشوں سے سنبھلا ہے۔ اس کے جانے کے بعد پھر ویسا ہی ہو جائے گا۔

اور ـــــ

کیا خبر ـــــ ؟

پہلے سے بھی بدتر ہو جائے۔

گھبرا کر اس نے مانی کو دیکھا ـــــ

پھر اٹھی ـــــ

کمبل کھولا اور اس پر ڈال دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

جیہ پریشان حال بیٹھی تھی۔ وہ آہستگی سے بڑبڑائی۔

"یہ امی سے بھی اسی طرح مانوس تھا ـــــ ان کے جانے کے بعد اس نے بہت اثر لیا ـــــ اسی لئے تو بھابی اسے رکھ نہ سکی بہت خطرناک اور خوفناک حرکتیں کرنے لگا۔

ثومی چپ ہو گئی ـــــ

جیہ ٹھیک کہہ رہی تھی ـــــ

لیکن ـــــ

آئندہ کیا ہوگا ـــــ ؟

وہ سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگی۔

اس سوچ میں ہمدردی پیار اور رحم کے چند لمحے ایسے بھی آئے کہ اس کا جی چاہا کہ شادی نہ کرے اور اک درد آشنا زندگی کے لئے اپنی ساری کاوشیں وقف کر دے۔

لیکن ـــــ

ایسا ممکن نہیں تھا ـــــ

دو تین دن تو اتنی مصروفیت کے تھے کہ ثومی کیا جیہ بھی مانی کی دیکھ بھال پوری طرح نہ کر سکی۔ وہ چاچا خیرو پر پوری ذمہ داری ڈال کر شادی کے سلسلوں میں مصروف ہو گئی۔

کرتی بھی کیا ـــــ نند کی شادی تھی ـــــ سسرال کا معاملہ تھا ـــــ مانا کہ پاگل بھائی کی دیکھ بھال اس کے ذمہ تھی پھر بھی اس کے اپنے فرائض بھی تھے۔ کھڑے کھڑے بھائی کو دیکھ آتی ـــــ

خیرو کہتا "اس نے کھانا پلٹ دیا ہے بی بی ـــــ"

"دودھ کا گلاس سر پہ انڈیل لیا ہے"

"ہاتھ کاٹ رہا ہے"

"کپڑے نہیں بدلواتا"

"منہ ہاتھ نہیں دھلواتا"

"باتھ روم نہیں جاتا"

"شیو نہیں بنواتا ——"

جیہ کا دل دکھ جاتا۔ وہ یہ منت خیرو سے کہتی۔

"چاچا چند دن ہیں جیسے تیسے گزار لو اب تو ثومی بھی اس کے پاس نہیں آسکتی۔ مالیوں بیٹھی ہے۔ اس کی امی نے منع کر دیا ہے بات بھی ٹھیک ہے خیرو چاچا ——"

خیرو چپ ہو جاتا ——

لیکن ——

جب تین دن ثومی ادھر نہ آئی اور تین دن ہی اس نے کھانے کو ہاتھ نہ لگا۔ پانی بھی نہ پیا تو خیرو کو بیحد تشویش ہوئی۔ اس دن اس نے جیہ سے کہا۔

"خدا کے لئے بی بی اس کا کچھ کرو۔ بھوکا پیاسا ہے۔ خدانہ کرے کچھ ہو گیا تو ——"

اور ——

دکھے دل سے جیہ نے آنسوؤں سے رندھی آواز میں کہا "اسے کچھ ہو ہی جائے تو اچھا ہے خیرو چاچا —— ثومی اب ادھر نہیں آئے گی۔ اس کی شادی ہو رہی ہے اس نے اپنے گھر چلے جانا ہے۔ یہ —— یہ اس کے ہاتھوں کھانے پینے کا عادی ہو گیا ہے۔ اچھا ہے بھوکا رہے —— جب بھوک بہت بے چین کرے گی تو خود ہی کھائے پیئے گا۔"

خیرو پریشان تھا —— جیہ کی پریشانی بھی سمجھتا تھا ——

ین کرتا کیا ——؟

رات اس نے زبردستی کھانا مانی کو کھلانا چاہا۔ نوالہ اس کے منہ ں ڈالنے کی کوشش کی۔

مانی نے اس کی دونوں انگلیوں کی پوریں دانتوں تلے پیس ڈالیں ہ تو فیملی کے دو تین جوان لڑکے آ گئے تو خیرو کی انگلیاں اس کے انتوں سے بہزار وقت نکالیں۔

یہ جوان لڑکے مانی ہی کو دیکھنے آئے تھے۔ مانی ان پر جھپٹ پڑا۔ یک کا گریبان ہاتھ میں آیا تو پھاڑ ڈالا۔

دوسرے جان بچا کر کمرے سے نکل بھاگے۔

مانی کی حالت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ بال بکھرے۔ شیو بڑھی ہوئی آنکھیں سرخ انگارہ اور پوری کی پوری کھلی رہتیں۔ اپنے ہاتھ اور بازو اس نے بری طرح کاٹ ڈالے تھے۔ کپڑے میلے کچیلے تھے۔ شلوار کے پائنچے اُدھڑ گئے تھے۔ قمیض کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ جیہ بیچاری کچھ سمجھ نہ پائی تھی کہ کیا کرے۔

گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ اور لوگ ہمدردی کا اظہار کر کے مانی کو دیکھنے آئے تھے۔ کپڑے بدلوانے کی اس نے بہتری کوشش کی تھی ——

لیکن —— کامیاب نہ ہوئی تھی۔

وہ کمرے میں کبھی لوٹنے لگتا ——

کبھی کونے میں منہ دیکر کھڑا ہو جاتا ——

کبھی ——

دیوار سے سر ٹکرانے لگتا ——

بھوک پیاس نے نڈھال بھی کر دیا تھا۔ ہونٹوں پر نیلاہٹ آگئی تھی۔ رال ٹپک ٹپک کر گردن کا زیریں حصّہ بھی گیلا ہو گیا تھا۔ وہ کمرے کی کھڑکیوں سے جھانکنے والوں کو گھور گھور کر دیکھتا۔ پھر واویلے کے انداز میں چیخنے لگتا ——

گھر بھر میں اس کی باتیں ہو رہی تھیں ——

"بھابی ——"

"ہوں ——"

"مانی دو تین دن سے بھوکا ہے ——"

جیہ نے ثومی کی بات کا جواب نہ دیا۔ مایوں کے پیلے جوڑے میں ملبوس ثومی بیحد مضطرب تھی۔ وہ تین دن سے مانی کو دیکھنے نہ گئی تھی ——

امی نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ ثومی نے بڑی منّت سماجت کی تھی ——

"امی وہ بھوکا پیاسا ہے۔ اسے کچھ ہو نہ جائے۔"

ہوتا ہے تو ہو جائے —— ہماری بلا سے جنجال پال لیا ہے —— خبردار جو اس کے پاس گئیں تم —— پگا بکار خویش ہوشیار لا ہے ——"

اس کی امی نے ناک منہ چڑھا کر کہا۔

ثومی کا دل دکھ گیا —— "امی —— آپ اتنی بے حس کیوں ہیں —— بچارہ ——"

جہنم میں گیا بیچارہ —— جان ہلکان کئے جا رہی ہے۔ اس کمبخت لئے ——"

امی —— مجھے اس سے ہمدردی ہے —— اس پر ترس ہے وہ مر جائے گا ——"

مرے ——"

وہ میری وجہ سے بھوکا پیاسا مر گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف رسکوں گی امی —— میں جانتی ہوں —— وہ میری وجہ سے کھانا کھا رہا —— میں اسے کھلاؤں گی تو کھا لے گا —— وہ مجھ سے ہے۔ میری باتوں کو بہت حد تک سمجھنے لگا ہے ——"

نے کہا۔

امی کو اس کی باتوں پر غصّہ آ رہا تھا۔

لیکن ——

ثومی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود مانی کے پاس جانے کا اصرار کرنے

گی تو امی نے بڑی ملائمت سے اسے سمجھایا۔

"ثومی بیٹی ——— وہ پاگل ہے تم تو پاگل نہ بنو ——— آج تو تم جا کر کھلا پلا دو گی ——— کل وہ پھر ایسے ہی کرے گا۔ تم اس کی ذمہ داری کب تک اٹھا سکتی ہو ———"

جیہ نے بھی مصلحتاً ساس کی باتوں کی تائید کی۔ حالانکہ وہ دل سے چاہ رہی تھی کہ ثومی تھوڑی دیر کے لئے مانی کے پاس جائے۔ اسے کچھ کھلا پلا دے ——— دودھ کے چند گھونٹ ہی اس کے حلق سے اتر جائیں۔

لیکن ———

مجبور تھی ———

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ ثومی دلہن بنی بھاری کامدار عروسی جوڑا پہنا ——— زیور سے لد گئی۔ بیوٹی پارلر سے آئی ہوئی مسز درانی نے اس کا ہار سنگھار اس طرح کیا ——— کہ ——— وہ مجسم حسن بن گئی ———

شادی کا ہنگامہ جوبن پہ تھا۔ گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ لان میں رنگدار شامیانوں تلے کرسیاں بچھی تھیں۔ دوسری طرف کھانے کا بندوبست تھا۔ شور شرابہ ہو رہا تھا۔

رنگین لباس زرتار کپڑے کھنکتے زیور۔ بہتی خوشبوئیں ہنسی کی چہکار

دل کی کھنک میں مدغم ہو رہی تھیں۔

یہ پہر ڈھل رہی تھی۔

رخصتی کا وقت قریب تھا۔ براتی واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔

اب پناہ سامان ٹرکوں میں لادا جا رہا تھا۔ اس کی شاندار شادی

رہے ہر زبان پر تھے۔

ثومی سہیلیوں اور ہم عمر کزنوں میں گھری بیٹھی تھی کہ جیہ بھابی اندر

رخصتی کے لئے اسے باہر لے جانا تھا۔

بھابی ———" ثومی نے اسے پکارا۔

جی ———"

ایک بات مان لو بھابی ———"

کیا ———؟"

جانے سے پہلے مجھے مانی کے پاس لے چلو ———؟"

نہیں ثومی ———"

نہیں میری قسم بھابی ———"

لیکن ———"

لیکن ویکن کچھ نہیں ——— میں آخری بار اسے دیکھنا چاہتی ہوں

سمجھا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے اس کے پاس لے چلو"

جیہ نے ڈرتے ڈرتے حامی بھری۔

پھر ———

لڑکیوں سے پیچھا چھڑا کر اسے پچھلے دروازے سے باہر لے گئی۔ وہیں سے غسلخانے کے راستے دوسرے پورشن میں گئی تو ثومی کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

وہ جیہ کے سہارے مانی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"مانی ——" اس نے بے اختیارانہ پکارا۔

مانی کی حالت دیکھ کر ثومی کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔

"مانی ——" وہ اس پر جھک گئی۔

اس کے اکھڑے بکھرے بالوں پر ہاتھ پھیرا —— اس کا چہرہ اونچا کیا ——

"مانی اٹھو —— دیکھو میں جا رہی ہوں ——" ثومی رو پڑی۔

جیہ کی آنکھیں بھی بے اختیارانہ چھلک پڑیں۔

اس دن جانے کیا بات تھی۔ مانی نے سر اٹھا کر ثومی کو دیکھا اور ——

ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا ——

ثومی بھی کھڑی ہو گئی ——

مانی نے اسے دیکھا۔ حسبِ معمول آنکھیں پھیل گئیں۔ منہ کھل گیا۔ رال ٹپکنے لگا۔ اور جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

پھر ——

وہ ——

ثومی پر جھپٹ پڑا —— اس کو دونوں کندھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا اور بے اختیارانہ اونچی اونچی آوازیں نکالتے ہوئے اسے چکر دے ڈالا —— پھر اسے چھوڑ کر قلابازیاں لگانے لگا —— وہ عجیب و غریب آوازوں سے شور مچا رہا تھا۔ ثومی اور جیہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھیں۔

ثومی جانتی تھی کہ وہ اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔ جیہ بھی جانتی تھی۔ اسی لئے تو وہ روئے جا رہی تھی۔

"مانی کچھ کھاؤ گے ——؟" جیہ نے پوچھا۔

لیکن ——

وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

اب وہ لٹو نیاں لے رہا تھا۔ کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوٹ پوٹ رہا تھا —— اور بے تکی آوازیں نکال رہا تھا۔

"چلو ثومی ——" جیہ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ "یہ نہ ہو امی کو پتہ چل جائے کہ تم ادھر آئی ہو۔"

جیہ نے ثومی کا بازو تھاما اور اسے اسی راستے سے باہر لے چلی جس راستے سے آئی تھی۔ مانی اب بھی لوٹ پوٹ رہا تھا۔ نیرو چاچا کمرے میں آ گیا۔

"خیرو چاچا ——— اس کا خیال رکھنا ———" ثومی نے دُکھے دل سے باہر جاتے جاتے کہا۔

ایکدم ہی مانی کی نظر اس پر پڑی۔

وہ اٹھا اور ثومی کی طرف لپکا۔

خیرو نے جلدی سے اس کو پکڑ لیا۔ اسے قابو میں کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنے لگا۔

ثومی چلی گئی ———

مانی کی غراہٹیں اور عجیب و غریب آوازیں اسے دور تک سنائی دیتی رہیں ——— وہ اتنی زور سے چیخ رہا تھا کہ لگتا تھا اپنے پھیپھڑے پھاڑ لے گا۔

پھر ———

بینڈ کی الوداعی دھن بجی ——— ثومی زرنگار گٹھری بنی پھولوں سے لدی گاڑی میں زبیر کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ رخصتی کا منظر بڑا ہی دلگداز تھا۔

آنسوؤں سے رندھی دعاؤں کے زیر سایہ وہ بابل کا گھر چھوڑ رہی تھی۔ دکھ اور خوشی کا یہ منظر بھی عجیب تھا۔ اپنوں سے بچھڑ کر کسی کو اپنا بنانے کا عمل بھی خوب تھا۔

لیکن ثومی کے دکھ کا اک دھارا اور بھی تھا نا — جو بڑے غیر محسوس

طریق سے وجود میں آیا تھا۔ اور اپنی جگہ بناتا بہہ نکلا تھا۔ پالتو جانوروں سے بھی تو محبت ہو ہی جاتی ہے نا۔

مانی تو پھر انسان تھا بے شک انسانی صفات سے بے بہرہ تھا۔ جذبوں کی شدت و حدت سے ناآشنا تھا۔

لیکن ———

ثومی جانتی تھی ———

کہ ———

بنیادی جذبوں سے ناآشنا نہیں تھا ———

ان سے ناآشنا ہوتا ———

تو ———

خیرو سے اپنا آپ چھڑا کر بے تحاشا باہر نہ دوڑتا۔ اور ثومی کو پھولوں سے لدی گاڑی میں زبیر کے پہلو میں بیٹھا دیکھ کر بے اختیار نہ ہو جاتا ———

اسی بے اختیاری ہی میں تو وہ جیسے رسّے تڑا کر بھاگا جدھر منہ اٹھایا اُدھر چلا گیا۔ لوگ پیچھے بھاگے پکڑنا چاہا ———

لیکن ———

وہ اوپر جا کر بالکنی سے نیچے کود گیا۔ پتھریلے گملے کا سرا اس کے سر میں لگا۔ خون کا فوارہ اُبلا ———

اور ———

اک دیوانہ پیار کے بنیادی جذبے کی دیوانگی میں جان سے
کھیل گیا ——
محبتیں ——
خود رو پودوں ہی کی طرح تو ہوتی ہیں ——
انہیں ——
اُگنے کے لئے صرف دل کی زمین کی ضرورت ہوتی ہے ——
دل ——
صرف دل کی ——
اور ——
یہ دل ——
خواہ کسی دیوانے ہی کا کیوں نہ ہو ——

واہمہ اور حقیقت

شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں، کیپٹن ڈاکٹر عباس ایک اکلوتا بیٹا تھا، تین بہنیں تھیں، ماں باپ اور بہنیں اس شادی پر دل کا ہر ارمان نکالنا چاہتے تھے۔

وقار چیک پر چیک کاٹ رہے تھے اور بیگم وقار دھڑا دھڑ انہیں کیش کرا کرا کر بڑی تیار کر رہی تھی۔ چیزیں خرید رہی تھی، گھر ٹھیک کر رہی تھی۔ رنگ روغن کروائے تھے، صوفوں کے کپڑے بدلوائے تھے، پردے نئے لگائے تھے۔ دلہن کے آنے سے پہلے گھر کو بھی دلہن کی طرح آراستہ کرنا تھا۔ وہ سب کام خوشی خوشی کر رہی تھی۔ فارہ اور عمارہ بھی ہاتھ بٹاتی تھیں۔

لیکن

بیٹیوں کے کسی کام سے تسلی نہ ہوتی تھی، اسی لئے بڑی بیٹی کو جوان

دنوں کویت میں اپنے میاں کے ساتھ مقیم تھی۔ مہینہ بھر پہلے ہی بلا بھیجا تھا۔ سارہ پر انہیں اعتماد تھا۔ اس کے ذوق کی بھی قائل تھیں۔ عباس امی کو چھیڑتا۔

"توبہ امی حد ہو گئی۔ شادی کیا کر رہی ہیں میری، پہاڑ ڈھا رہی ہیں جیسے۔ بھلا سارہ کو مہینہ بھر پہلے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ بھلا کام نہیں کر سکتے۔"

امی موڈ میں ہوتیں تو ہنس دیتیں۔ کام سے سٹپٹائی جھلائی ہوتیں، تو ڈانٹ دیتیں۔

"سارہ کے آنے کی تجھے کیا تکلیف ہے۔ وہ آئے گی تو میرے ذہن سے بار اترے گا۔"

"امی آپ کو اپنے اوپر اتنا بھی اعتماد نہیں۔"

"تجھے کیا۔"

"سارا کام مجھے سونپ دیں، منٹوں میں کر لوں گا۔"

"بڑا آیا کام کرنے والا۔ دو چار بار بازار لے کر جانا پڑا تو کانوں کو ہاتھ لگا لے۔"

"توبہ توبہ امی۔ آپ کی ہر بات مان سکتا ہوں، لیکن یہ بازاروں کے ساتھ نہیں لگا سکتا۔" وہ ہنس پڑا۔ "شاپنگ کا کریز عورتوں کو ہی ہوتا ہے، اور وہی اس جنون سے عہدہ برا ہو سکتی ہیں۔"

"پھر کیوں بک بک کرتا رہتا ہے۔" وہ جھاڑ دیتیں۔

"امی اب تو میری شادی ہونے والی ہے کہیں سولینہ کے سامنے بھی مجھے اس طرح جھاڑ نہ پلایا کیجیے گا۔"

"تو کیا سولینہ سے میں ڈر کر رہوں گی۔"

"نہیں نہیں ـــــ میرا یہ مطلب نہیں امی ـــــ" عباس ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ "مذاق کر رہا ہوں ـــــ آپ برا نہ منائیں ـــــ"

"میرے ذہن اور اعصاب پر بڑی ٹنشن ہے ـــــ مجھے یوں نہ چڑایا کر ـــــ"

"سارہ کے آنے سے ٹنشن دور ہو جائے گی؟"

"ہاں ـــــ"

"پھر چڑایا کروں ـــــ"

"ماروں گی تجھے ـــــ"

وہ ہنس کر ماں کو بازوؤں میں بھر لیتا اور ماں پیار سے اس کی پیشانی چوم لیتی ـــــ

شادی کی تیاریوں کے ساتھ ماں بیٹے کا یہ کھیل بھی جاری تھا۔ باپ اور بہنیں بھی ان کی لطف آمیز نوک جھونک سے مسرور ہوتے۔

"اے ـــــ"

"ہوں ـــــ"

"یہ کس کی دریافت ہے ——؟"

"کون ——؟"

"محترمہ مس سولینہ صاحبہ ——"

"امی کی، عمارہ کی، نازہ کی ——"

"جھوٹا کہیں کا ——"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

سارہ کل شام کی فلائیٹ سے آگئی تھی۔ وہ اس وقت عباس کے کمرے میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سولینہ کی کلرڈ تصویر تھی۔ جو عباس نے بڑے قیمتی فریم میں لگوائی ہوئی تھی۔

عباس آئینے کے سامنے کھڑا اپنی ٹائی کی گرہ درست کر رہا تھا۔ سارہ کی بات پر بے اختیارانہ ہنس پڑا۔

بے اختیارانہ ہنسی تو آج کل اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ شادی ہو رہی تھی شادی۔

اور ——

وہ بھی اپنی من پسند لڑکی سے۔ جو بڑی اسمارٹ بے حد چارمنگ اور بے انتہا خوبصورت آنکھوں اور بالوں والی لڑکی تھی۔

عباس دونوں ہاتھوں سے گرہ کو ٹھیک کرتے اس کی طرف آگیا۔

سارہ غور سے تصویر دیکھ رہی تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "کیسی ہے ——؟"

"سوسو ——" سارہ نے اسے چڑانے کو جان بوجھ کر کہا۔

"اے ہے ہے ہے ——" عباس نے منہ بنا کر کہا۔

سارہ ہنس پڑی۔

اور جلدی سے بولی۔ "بہت پیاری ہے ——"

"خالی پیاری ——"

"باقی آئندہ ——"

"مطلب ——؟"

"آج اسے دیکھنے جا رہی ہوں امی کے ساتھ۔ واپس آکر اپنی رائے سے مطلع کروں گی۔"

وہ ہنس پڑی۔

عباس بھی ہنس پڑا۔

سارہ عباس سے صرف ڈیڑھ سال بڑی تھی۔ شادی تین سال پہلے ہوئی تھی۔ منی سی پیاری سی بچی کی ماں تھی۔ بہن بھائی میں دوستوں کی سی بے تکلفی تھی۔

عباس نے تصویر بہن کے ہاتھوں سے لے لی۔ دونوں ہاتھوں میں تصویر پکڑے وہ سولینہ کی فوٹو دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں خوشی، پیار اور طمانیت کی چمک تھی۔ سارہ اسے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

لیکن ——

شوخی سے ایک دم تصویر اس کے ہاتھ سے کھینچ کر بولی۔

"تم تو اسے آنکھوں سے نگل رہے ہو — یہ تصویر میں اپنے کمرے میں رکھوں گی۔"

"کیوں ——؟"

"تم اتنے ندیدے پن سے اسے دیکھتے رہے تو شادی ہونے تک چارم ختم ہو جائے گا سمجھے ——"

"یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے میری بہنا۔" لہرا کر گاتے ہوئے عباس نے سارہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"اوہو —— یہ بات ہے ——؟"

"بالکل ——"

"لگتا ہے مدتوں سے معاملہ چل رہا تھا۔" سارہ نے اپنی خوبصورت آنکھیں مٹکائیں۔

"بالکل نہیں سارہ بیگم ——"

"کیسے مان لوں ——"

"ماننا پڑے گا۔ اپنے بھائی کی زبان پر یقین کرو ——" عباس نے کہا۔

"پھر کہاں سے مل گئی یہ نایاب سی شے۔"

"اوہ —— کر ہی دی نا تعریف —— شکریہ شکریہ ——" وہ لہکا۔

"لگتی تو تعریف کے قابل ہی ہے ——"

"تھینک یو — تھینک یو —"

سارہ بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئی۔

عباس دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ سارہ اس کی بے حد ری اور چہیتی بہن تھی۔ دونوں میں بچپن ہی سے بڑی بے تکلفی اور تی تھی۔

سارہ کو سولینہ کے متعلق کرید لگی تھی۔ وہ ہر پھر کر اسی کی باتیں نے لگی۔

"بابا —— مجھے دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔ واپس آکر بتاؤں گا کہ سولینہ سے کیسے ٹکراؤ ہوا۔"

سارہ ہنس کر بولی۔ "اور تم سمجھتے ہو کہ میں اطمینان سے تمہاری واپسی انتظار کروں گی۔"

"تو اور ——"

"نہیں بھئی —— ابھی بتاؤ ——"

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس میں نے اسے دیکھا۔ وہ میرے دل میں بس گئی۔"

"ہائے اللہ یہی تو پوچھ رہی ہوں۔ اسے کہاں دیکھا۔"

"سی ایم ایچ میں ——؟"

"ہاں ——"

"تم وہاں کیسے گئے۔ وہ وہاں کیسے آئی؟"

"وہ ریٹائرڈ میجر کی صاحبزادی ہے۔ اور آرمی کے ریٹائرڈ آدمیوں کو بھی میڈیکل کی سہولت مل رہی ہے۔"

"میں جانتی ہوں ——"

"پھر یہ پوچھنا حماقت نہیں کہ وہاں کیسے آئی جبکہ یہ بات تم جانتی ہو۔ کہ سولینہ میجر سرفراز کی بیٹی ہے۔"

"اللہ —— میں تمہیں دفتر جانے تو نہ دوں گی۔ باتوں کے چکر میں الجھا رہے ہو مجھے۔"

"ویسے سارہ ——"

"ہوں ——"

"تمہیں میرے رومانس کے متعلق جاننے کا اتنا اگریز کیوں ہے ——"

"اچھا رومانس ——"

"ہاں گو کہ یکطرفہ ——"

"سیدھی سیدھی طرح بات کرو۔ مجھے الجھن ہو رہی ہے۔"

"تمہاری کھوپڑی کا بھیجا لگتا ہے نسیم بھائی نے چاٹ لیا ہے۔ سیدھی سی بات بھی نہیں سمجھ رہیں۔"

"مجھے پوری پوری روداد سناؤ۔"

"اچھا سنو ——"

"ہوں ——"

"میں ڈاکٹر ہوں ——"

"ہاں ——"

"کیپٹن ڈاکٹر ——"

"ہاں ——"

"سی ایم ایچ میں ——"

"ہاں —— ہاں —— ہاں ——"

"ڈیوٹی دیتا ہوں —— مریض آتے ہیں —— ان کے ساتھ ان کے عقین آتے ہیں۔"

"دیکھو عباس —— تم آج لیٹ ہو جاؤ گے۔"

"نہ نہ —— نہ —— ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں —— آج میں نے دیجے جانا ہے۔"

"تم نے بتایا تھا کہ آج کسی میٹنگ میں جا رہے ہو۔"

"اچھا تو سنو —— سولینہ کی امی بیمار ہو کر ایڈمٹ ہوئی تھیں ہوسپٹل میں، اور ان دنوں میری ڈیوٹی اُدھر ہی تھی۔ بس پہلے دن جب وہ اپنی ہمارا امی کے ساتھ روتی دھوتی ہوسپٹل آئی۔ تو مجھے اچھی لگی۔"

"پھر تم نے رومانس شروع کر دیا۔"

"نہیں سارہ —— توبہ —— ایسی جرأت نہیں کی میں نے صرف ایک ہفتہ وہ ایڈمٹ رہیں۔ سولینہ ان کے ساتھ تھی۔ دن میں کئی بار اس

کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بس وہ ہر لحاظ سے اچھی لگی۔"

"میں نہیں مانتی ——"

"یقین کرو ——" سارہ چند لمحے چپ رہی۔ مسکرا مسکرا کر عباس کو دیکھتی رہی۔

پھر بولی "امی کیسے مان گئیں ——"

"بس یہی تو کمال ہے اپنا۔ میں نے سولینہ کے متعلق پتہ کروالیا۔ اس کی امی مجھ سے خاصی مانوس ہوگئی تھیں۔ خاندان اچھا تھا۔ لڑکی اچھی تھی۔ میں نے عمارہ اور فارہ کو بتایا۔ انہوں نے امی کو۔ امی نے ابو کو۔ بس چکر چل نکلا۔"

سارہ مسکرانے لگی۔ "لکی ہو ——"

"بالکل ——"

"امی کا ارادہ تو شروع سے اپنی بھانجی سے کرنے کا تھا۔"

"بس سارہ امی نے سولینہ کو دیکھا اور مجھ سے زیادہ لٹو ہوگئیں۔ اپنی سب بھانجیاں بھتیجیاں اس پر قربان کردیں۔"

عباس نے اتنی شوخی سے کہا کہ سارہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ گئی ——

مالو لاؤنج میں بیٹھی فیروزی دوپٹے پر سنہری کرن ٹانک رہی تھی اس کی امی قریب ہی بیٹھی ریشمی کپڑے تہہ کر رہی تھی۔ مالو سولینہ کی گہری دوست تھی۔ اس کی شادی میں پہننے کے لئے اس نے بڑے خوبصورت

تیار کروائے تھے۔

اپنی پیاری پیاری دوست کو تحفے میں دینے کے لئے اس کی امی نے دو تین قیمتی سوٹ نکال کر دکھائے تھے۔ فیروزی سوٹ مالو نے پسند کیا تھا۔ اب اس کے دوپٹے پر سنہری کرن ٹانک رہی تھی۔ وہ اپنی امی سے باتیں کر رہی تھی۔

اسے سولینہ سے بچھڑنے کا دکھ بھی تھا۔ یہ دکھ کچھ اس لئے بھی تھا کہ سولینہ کو بھابی بنانے کی خواہش اس کے دل میں تھی۔ لیکن کمال بھائی سے اس نے ذکر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی امی سے کبھی کہا تھا۔

لیکن ——

اب ——

جبکہ سولینہ کی شادی ہو رہی تھی۔ اپنی خواہش کے بن موت مرجانے پر اسے دکھ تھا۔ اس وقت وہ امی سے کچھ ایسی ہی باتیں کر رہی تھی۔

اس نے آہستگی سے کہا۔ "کتنا اچھا ہوتا امی —— جو سولینہ میری بھابی بنتی۔"

امی نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ "یہ اب کہہ رہی ہے جب اس کی شادی میں صرف چند دن باقی ہیں۔"

"کمال بھائی جو شادی کی حامی ہی نہیں بھرتے۔"

"تو نے سولینہ کے متعلق پوچھا تھا اس سے۔"

"نہیں ——"

"پھر ——"

"بس ہر وقت یہی کہتے رہتے ہیں وہ۔ اتنی تنخواہ ہو جائے گی تو شادی کروں گا۔ بنگلا مل جائے گا۔ تو شادی کروں گا۔ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا تو شادی کروں گا۔"

"تنخواہ تو اس کی بڑھ گئی ہے۔"

"ابھی بنگلا ملے گا نا جب۔"

"سولینہ مجھے بھی بڑی پیاری لگتی ہے۔ اس کی تو ایکا ایکی منگنی ہو گئی۔ خود میری بات میرے دل میں رہ گئی۔"

"واقعی امی ——"

"ہاں ——"

"بہت اچھے لوگ ہیں نا ——"

"اس میں کیا شک ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ خدا کرے جائے سکھ اور آرام سے رہے۔"

"آمین ——"

"عباس بیٹے ——"

"جی امی ——"

"ذرا چلو ہمارے ساتھ ——"

"کہاں ——؟"

"ذرا درزی کے پاس جانا ہے ——"

"کان پکڑتا ہوں امی —— مجھے تو معاف ہی رکھیں۔"

"تو کون لے جائے گا ہمیں ——"

"ڈرائیور ——"

"وہ آج چھٹی پر ہے ——"

"ابو سے کہیں ——"

"وہ نہیں جاتے ——"

"مفت کا میں ہی نظر آیا ہوں ——"

عباس حیل حجت کر ہی رہا تھا کہ سارہ اپنا بیگ جھلاتی ننھی کو عارہ کے حوالے کرتی پورچ میں آ گئی۔

"اے مسٹر ——" وہ بولی۔

"جی حضور ——"

"یہ اتنی حیل حجت کیوں ہو رہی ہے۔ کوئی ہمارے کام جانا ہے —— تمہاری دلہن ہی کے کپڑے ہیں۔"

"وہ تو ہیں ——"

"پھر ——"

"تم لوگ بور کر دیتے ہو ——"

"اچھا یوں کرو ہمیں ڈراپ کر آؤ ——"

"واپسی ——"

"ٹیکسی پہ آجائیں گے۔"

"منظور ——"

امی عمارہ کو رات کے کھانے کے لئے ہدایت دینے اندر چلی گئیں
سارہ گاڑی میں آ بیٹھی۔

امی کے لئے عباس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ امی بیٹھتے
ہوئے بولی۔ "رات کے کھانے کے لئے کہہ آئی ہوں۔ عمارہ دیکھ
لے گی ——"

"تو گویا آپ کا رات تک باہر گھومنے کا پروگرام ہے۔" عباس
بیٹھتے ہوئے بولا۔

"شام تو اتر رہی ہے۔ دو تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے ——"
وہ بولیں۔

"میاں آج تو دلہن کا سب سے بھاری جوڑا سلنے کو دنیا ہے ——"
سارہ بولی۔

"عروسی جوڑا ——؟" عباس مسکرایا۔

"پہلے دن کا تو انہوں نے بنوایا ہے۔ ہم ولیمے کے لئے بھاری جوڑا
بنوا رہے ہیں۔" سارہ نے کہا۔

عباس کسی حسین تصور میں کھو گیا۔

سارہ اور امی آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ شہر کے مشہور و مقبول
ٹیلر سے بری کے جوڑے سلوائے جا رہے تھے۔ عباس نے فٹ

فٹ پاتھ سے پرے ہٹ کر مناسب جگہ دیکھی۔ اور گاڑی پارک
کر دی۔

"تم چلے جاؤ —— ہم ٹیکسی میں آجائیں گے ——" سارہ نے
عباس سے کہا۔

"نہیں نہیں —— آپ کو ساتھ ہی لے کر جاؤں گا اب ——"
عباس بولا۔

تینوں دکان کے اندر چلے گئے۔ خاصہ رش تھا۔ چند لمحے تینوں کو
انتظار کرنا پڑا۔ امی اور سارہ تیار شدہ کپڑوں کے ڈیزائن اور کام دیکھنے میں
مصروف ہو گئیں۔

شوکیس میں سرخ ٹیشو کا ایک خوبصورت جوڑا۔ جس پر کامدانی
کام تھا لٹکا ہوا تھا۔ دوپٹے پر بھی بہت دیدہ زیب کام تھا۔ یہ جوڑا
سارہ کو بہت پسند آیا۔

"امی اس طرح کا کام ہم سبز ٹیشو پر کروا لیتے ہیں ——" اس نے
امی سے کہا۔

عباس بھی یہ خوبصورت جوڑا دیکھنے لگا۔

"ماسٹر ——" سارہ نے دکاندار کو بلایا۔ وہ ان کا بہت اچھا واقف
اور پرانا ٹیلر تھا۔

"جی ——" ماسٹر نے سب کو سلام کیا۔

وہ اس کام کے متعلق اس سے پوچھنے لگی۔ پھر سبز پر ویسا ہی کام

کرنے کے متعلق اس سے رائے لی۔

"بیگم صاحبہ ـــــ یہ آپ ہی کی بہو کا عروسی جوڑا ہے۔ آپ کوئی اور کام دیکھ لیں۔ دونوں جوڑوں پر ایک سا کام نہ کروائیں۔"

"یہ سولینہ کا جوڑا ہے ـــــ؟" عباس بے تابی سے بولا۔

"جی میجر صاحب کی بیٹی کا۔ آپ کے ہاں ہی شادی ہو رہی ہے نا ان کی۔" وہ بولا۔

سارہ اور امی جوڑا دیکھ کر بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھیں اور سبز جوڑے کے لئے کوئی دوسرا کام دیکھنے لگیں۔ عباس کے قدم تو جیسے شوکیس کے سامنے زمین میں جڑ ہی گئے۔ وہ اس خوبصورت سرخ جوڑے میں لپٹی سولینہ کو چشم تصور سے دیکھ رہا تھا۔

چند دنوں بعد وہ اس کے پہلو میں ہوگی۔ یہ تصور بڑا جانفزا اور حسین تھا۔

"اوہ کمال بھائی ـــــ آپ آ گئے ـــــ کب آئے ـــــ کس وقت آئے ـــــ"

بٹوہ صوفے پر پھینک کر مانو بے اختیارانہ۔ ایک ہی سانس میں کئی سوال کرتے کمال کی طرف بڑھی۔

کمال صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا ـــ اور اسی والہانہ پن سے مانو کو گلے

سے لگا کر پیار کر لیا۔

دونوں چند لمحے کھڑے رہے۔

"اللہ ـــــ آپ آ ہی گئے بھائی جان ـــــ میں آپ کو کس قدر مس کر رہی تھی۔" مانو اپنے خوبصورت بالوں کو جھٹکے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کمال سے الگ ہو کر بولی۔

"مس کر رہی تھی ہماری مانو بلی ـــــ اسی لئے ہم پورے ایک ماہ کی چھٹی لے کر آ گئے ہیں۔"

"واقعی ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"یہ تو بہت اچھا ہوا ـــــ"

"بالکل اچھا ہوا۔ اور یہ اور بھی اچھا ہوا کہ ہماری شرطیں پوری ہو گئیں اور اب ہم ـــــ"

"کون سی شرطیں ـــــ؟"

"تنخواہ بڑھنے اور بنگلہ ملنے کی ـــــ"

"بنگلہ مل گیا ـــــ"

"ایک دم فرسٹ کلاس ـــــ"

"سچی ـــــ"

"اور ـــــ اور اب آپ شادی کر لیں گے ـــــ"

"ہاں بالکل اسی لئے چھٹی آیا ہوں ـــــ کہ کم از کم منگنی تو کروا

دو ہماری ——"

مانو ایک دم اُداس ہو گئی۔ دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے ——"

کمال اس کے بالمقابل بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ منہ کیوں لٹکا لیا ہے ——؟"

"کچھ نہیں —— امی کہاں ہے —— ان کو آپ کے آنے کا پتا چلا ——" مانو نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔

"جی ہاں —— بابدولت کو آئے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ تم کہاں غائب تھیں؟"

"سولینہ سے ملنے گئی تھی ——"

سولینہ کے نام پر کمال کی آنکھوں میں بڑی مسحور کن روشنی بھر گئی دل کچھ جھوم جھوم سا گیا۔ مسکراہٹ لبوں میں دباتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"اچھا —— اپنی بدشکل سی دوست سے ملنے؟"

مانو نے گھور کر کمال کو دیکھا۔ اور بولی۔

"بدشکل ہے وہ ——"

"اچھا خوش شکل سہی ——" وہ ہنس پڑا۔

مانو مسکرا بھی نہ سکی۔ منہ بنائے بنائے بولی۔

"مجھے تو وہ اتنی اچھی لگتی ہے۔ جی چاہتا تھا —— اسے بھابی

البتی ——"

کمال کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ چہرے کی رونق میں اضافہ ہوا خوش دلی سے بولا۔

"اب بنا لو ——؟"

"اب ——" قدرے رُک کر مانو نے بھائی کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں مانو ——" وہ انجان بنے ہی میں بولا۔ "ہماری طرف سے اجازت ہے۔ چاہو تو آج ہی پیغام لے جاؤ ——"

مانو گنگ سی تھی۔

گھبرا کر بھائی کو دیکھا —— اسے حقیقت کا علم کہاں تھا۔ شوخی سے بولا۔

"ایک راز کی بات بتاؤں مانو ——"

اور بغیر جواب کا انتظار کئے صوفے میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہاری یہ دوست مجھے —— مجھے —— بہت پسند ہے۔ بہت —— پسند ہے۔ میں چھٹی لے آیا ہی اسی لئے ہوں کہ....."

اس نے مانو کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر بے چارگی، سیب اور محرومی کے سائے پھیل رہے تھے۔

وہ حیران ہوا ——

اتنے بڑے انکشاف پر مانو کے کسی ردعمل کو نہ دیکھ کر وہ لپک کر اس کے پاس آیا۔ صوفے کے بازو پر جھکتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے

مانو۔ میری بات تمہیں اچھی نہیں لگی۔ سولینہ تمہیں بھی تو پسند ہے بہت اچھی لڑکی ہے نا وہ ——"

"ہاں ——" مانو نے ایک گہری سانس لی۔

وہ اس لمحے کی طرح منظر آ رہی تھی —— جو وقت سے بچھڑ جاتا ہے۔

"مانو ——" اب کمال سنجیدہ تھا۔

"جی ——"

"سولینہ کو بھابی بنانا نہیں چاہتیں ——؟"

اس نے اک آہ بھر کر بھائی سے کہا۔ "آپ لیٹ ہو گئے ——"

"کیوں ——؟"

"سولینہ کی شادی ہو رہی ہے ——"

کمال کی رنگت اڑ گئی۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں اسے بے طرح دھچکا لگا۔

جلدی سے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

مانو بھائی کی کیفیت سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ کر کے اداس دکھی ہو گئی۔

"کمال بھائی —— کاش آپ ——"

"مانو کیا یہ سچ ہے ——"

"ہاں بھائی جان —— ایک ہفتے بعد اس کی شادی ہو رہی ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

کمال کا دماغ جیسے سُن ہو گیا کتنے ارمان تھے اس کے دل میں۔ کیسی خواہشیں تھیں۔ سولینہ اسے صرف پسند ہی نہ تھی۔ چاہت کے جذبے بھی بیدار تھے۔

اسے من کی رانی بنانے کی تمنا بڑی تنومند تھی۔ اس رانی کے شان شایاں اپنے آپ کو بنانے کے لئے ہی تو وہ چپ تھا۔ ورنہ کبھی کا مانو سے حالِ دل کہہ دیا ہوتا۔

وہ چپ تھا۔

مانو گلوگیر آواز میں اسے سولینہ کی شادی اس کے سسرال اور اس کے منگیتر کے متعلق اسے بتانے لگی۔

اس کی باتیں سُن سُن کر کمال کا ذہن سن ہوا جا رہا تھا۔

بڑے کمرے میں روشنیوں کا سیلاب امنڈا ہوا تھا۔ ساری لائٹس آن تھیں۔ فالتو بلب بھی لگائے ہوئے تھے۔ جو دودھیا روشنی بکھیر رہے تھے۔

اس کمرے سے سارا فرنیچر نکال دیا گیا تھا۔ دیوار سے دیوار تک قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ ساتھ فوم کے موٹے موٹے گدے اور تکیے رکھ دیئے گئے تھے۔

کئی دنوں سے رات کے کھانے کے بعد لڑکیاں بالیاں اس کمرے میں جمع ہو کر ڈھولک پیٹتی تھیں گانے گاتی تھیں اور ڈیک پر پاپ میوزک بجا کر ناچتی اور ہلا گلا کرتی تھیں۔ شادی میں چار پانچ دن ہی تو رہ گئے تھے۔ عباس کی امی اور ابو کے قریبی عزیز آ گئے تھے۔ چچازاد ماموں زاد پھپھو اور خالہ زاد بہنیں رات گئے تک گاتی بجاتی رہتی تھیں، عباس کی اپنی بہنیں بھی پیش پیش تھیں۔ ان کے لئے اس سے زیادہ خوشی کا مقام اور کون سا تھا۔

گانے بجانے اور ہلا گلا کے ساتھ ساتھ بری کے کپڑے بھی ٹانکے جاتے تھے۔

سارہ ان کو بڑی خوبصورتی سے سجا سجا کر دوسری لڑکیوں کے حوالے کرتی، وہ پن لگا لگا کر جوڑے ٹانک دیتیں۔

ایسے میں عباس اور اس کے ساتھی کزن بھی آ دھمکتے۔ چھیڑ چھاڑ ہنسی مذاق خوب خوب ہوتا۔

اس رات کو خوب ہی لطف رہا۔ لڑکیوں نے الگ ٹولی بنائی۔ لڑکوں نے الگ۔ ڈھولک پر دونوں ٹولیوں نے ماہیا گایا۔ ایک ایک بول پر قہقہوں کا غلغلہ اٹھتا۔

سوال و جواب ہو رہے تھے۔ لڑکے لڑکیوں کو ہرانے کی کوشش میں پیش پیش تھے اور لڑکیاں لڑکوں کو۔

مقابلہ رات گئے تک جاری رہا۔

اور جتنا اس مقابلے کو سب نے انجوائے کیا، وہ یادگار تھا۔ سب ہی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ کچھ عزیز جنہیں عباس کے لینہ کے ساتھ بندھن پر دکھ بھی ہوا تھا، اور جو اپنی جوان بیٹیوں کے لئے اس پر آس لگائے بیٹھے تھے۔ بجھ ہی گئے تھے۔

پھر ——

بھی ——

اپنے ان جذبوں کو انہوں نے اظہار کی راہ نہیں دی تھی۔ خوشی اظہار کرنے میں وہ کچھ زیادہ ہی پیش پیش تھے۔

مقابلہ بغیر ہار جیت کے ختم ہوا۔ تو اک طوفان سا مچ گیا۔ لڑکیاں بول پر فوقیت پر اڑی تھیں۔

اور ——

لڑکے لڑکیوں پر ——

"چلو قرعے نکال لیتے ہیں ——" کسی نے کہا۔

"ٹھیک ٹھیک ——"

"جس کے پلے ہار پڑی۔ وہ جیتی ہوئی پارٹی کی فرمائش پوری کرے گا۔"

"بالکل بالکل ——"

"کاغذ پنسل لاؤ ——"

"یہ لیجیے آ گئی ——"

جلدی جلدی پرچیاں لکھی گئیں —— سادہ کاغذ کی پرچیاں

بنائی گئیں۔

پھر سارہ کی منی کو کہا گیا۔

"ایک پرچی اٹھاؤ ——"

اس نے اٹھا کر اپنے ابو کو دے دی۔ سارہ کا میاں کویت سے کل ہی آیا تھا۔ اور اس ہلا گلا میں وہ بھی شریک تھے۔

ہار کی پرچی لڑکوں کی نکلی۔

لڑکیوں نے اتنے زور زور سے تالیاں پیٹیں، اس طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر شور مچایا کہ لگتا تھا کمرے کی چھت اڑ جائے گی۔

لڑکیاں خوب شوخ ہوئی جا رہی تھیں۔ بھڑکیلے لباس جگمگاتے زیور اور شوخ میک اپ میں وہ راجہ اندر کے اکھاڑے کی پریاں ہی تو لگ رہی تھیں۔

لڑکوں کو انہوں نے خوب ستایا۔

کسی کو مرغا بننے کو کہا ——

کسی سے قلابازی لگوائی ——

کسی سے گانا سنا ——

کسی کو ناچ نچوایا ——

عباس پر تو جیسے ہر فرمائش پوری کرنے کی ذمہ داری تھی۔ اس نے گانا بھی گایا۔ ناچ بھی دکھایا۔

قلابازی بھی لگائی۔ مرغا بھی بنا —— ہنس ہنس کر سب کے

پیٹ میں بل پڑ گئے۔

شادی کی خوشی میں عباس لڑکیوں کی ہر بات مان رہا تھا۔

کتنے خوش تھے سب ——

سولینہ کا سرخ عروسی جوڑا درزی سے بن کر آ گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں تھی اور بیڈ پر پھیلائے اس جوڑے کو تک رہی تھی دل میں ارمان مچل رہے تھے۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی عباس کی تصویر کو مخمور نگاہوں سے بار بار دیکھ رہی تھی۔

اس کی عزیز ترین دوست مانو بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کا پرتو نہیں تھا۔

کمال بھائی کے حال دل کا جب سے اسے پتہ چلا تھا وہ مغموم مغموم سی تھی ——

کمال بھی تو گم صم ہی ہو گیا تھا۔ اس کی شوخی اور چہک جانے کہاں چلی گئی تھی۔

وہ گھر میں رہتے ہوئے بھی غیر حاضر تھا۔ مانو اسے دیکھ دیکھ کر دکھی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے بھائی سے کتنا پیار کرتی تھی۔ کس قدر چاہتی تھی اسے —— اس کا بس چلتا تو اب بھی سولینہ کو عباس سے چھین کر اپنے بھائی کے پہلو میں بٹھا دیتی۔

"کیسا ہے یہ جوڑا ——" سولینہ نے ارمانوں بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا ہے ——"

"مانو ——"

"ہوں ——"

"تمہیں کیا ہوا ہے ——؟"

"کچھ نہیں ——"

"گم صُم ہو کل سے ——"؟

"بس یونہی ——"

"مجھ سے بچھڑنے کا غم ہے ——؟"

"بہت ——"

"لیکن مانو — ہم ملتے رہیں گے۔ میں سسرال جا رہی ہوں دنیا سے تو نہیں جا رہی۔"

"ہوں ——"

"پھر منہ لٹکائے کیوں بیٹھی ہو۔ اٹھو یہ جوڑا ہینگر میں ڈال کر الماری میں لٹکا دو ——"

"کتنا خوبصورت ہے یہ جوڑا۔ جب تم پہنو گی تو....."

"تو کیا ہوگا ——؟"

"کئی دلوں کے ارمانوں کا خون ہو جائے گا ——"

"مانو —— کیا مطلب ——"

"کاش یہ جوڑا پہن کر تم ہمارے گھر آتیں — میری — خیر چھوڑو —

اب کیا ہو سکتا ہے۔"

سولینہ نے گوشۂ چشم سے مانو کو دیکھا۔ کپڑے ہینگر میں لٹکاتے ہوئے وہ بڑی اُداس اور مغموم لگ رہی تھی۔ وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی۔ کمال کو اس نے بھی دیکھا ہوا تھا۔ اور اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو ناپسند کی جا سکے۔

لیکن اب ——؟

اب تو اس کی شادی عباس سے ہو رہی تھی — عباس — جس نے اسے مانگا تھا اور جسے وہ مل گئی تھی۔

وہ سمجھ نہ پائی کہ مانو سے کیا کہے۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور ہنستے ہوئے اس کا کان مروڑ کر بولی۔

"اس بے وقت کی راگنی کا کیا مطلب مانو بلی ——"

مانو بولی۔ "ہاں واقعی بے وقت کی راگنی ہے۔"

"پہلے سوئی تھی کیا ——"

"بھائی سویا ہوا تھا۔ اب ایک دم جاگ اٹھا ہے لیکن میں اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔"

"کوئی اور اچھی سی لڑکی ڈھونڈ کر شادی کر دو سمجھیں ——" وہ ہنس پڑی ——

مانو بھی بے دلی سے مسکرا دی۔

رات کے شاید تین بج رہے تھے۔ ڈھولک اور ہلا گلا ختم کر کے سب سونے کے لئے جگہ ڈھونڈنے لگے۔ عباس کے کمرے میں بھی فوم کے گدے ڈال دیئے گئے تھے۔ کچھ لڑکے اس کے کمرے میں بھی رات کو سوتے تھے۔ اس کا کزن جمی بیڈ پر اس کے ساتھ گھس جاتا تھا۔

سب لیٹ گئے تھے۔

کچھ تو پڑتے ہی خراٹے لینے لگے تھے۔

لیکن

کچھ ابھی باتیں کر رہے تھے۔ عمران کوکب ساحر اور جاوید گدوں پر لیٹے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ رفیع چھوٹے صوفے پر براجمان تھا۔ اور خراٹے لے رہا تھا۔

جمی عباس کے ساتھ لیٹا تھا۔ اور کھسر پھسر پر دوسرے لڑکوں کو ڈانٹ کر سونے جاگنے کے بین بین تھا۔

عباس ابھی جاگ رہا تھا۔ بتی جل رہی تھی۔ اور وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ بتی بند کر کے سو جائے۔

اس نے اٹھنے کی نیت سے سر تکیئے سے اٹھایا ہی تھا

کہ

گھبرا کر پھر سر تکیئے پر رکھ دیا۔

اس کی نظریں سامنے کی دیوار پر تھیں۔

جو ——

کھل گئی تھی ——

اور ——

اسے سرمئی سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ اس سڑک پر حادثہ ہو چکا تھا۔ اک پھولوں سے لدی کار وزنی ٹرک سے ٹکرا کر چور چور ہو چکی تھی۔ لوگوں کا جمگھٹا تھا۔

کئی چہرے اس کے جانے پہچانے تھے۔

کار سے بمشکل لاش اور زخمیوں کو نکالا گیا۔

اور جب زخمی پر اس کی نگاہ پڑی۔

تو ——

اک بے اختیار سی چیخ اس کے لبوں سے نکل گئی ——

وہ بستر میں پسینے سے شرابور تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی آواز سن کر جمی اور گدوں پر لیٹے لڑکے سب اٹھ بیٹھے۔

"کیا ہوا ——؟"

"کیا ہوا ——؟"

سبھی یہی پوچھ رہے تھے۔

چند لمحے خود عباس کو بھی پتہ نہ چلا کیا ہوا ہے۔ اس نے دیوانوں کی طرح سامنے والی دیوار کو دیکھا۔ دیوار اپنی جگہ پر تھی۔

سڑک اور حادثہ ——؟

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔
لڑکوں نے اس کی آواز اور حالت کو زیادہ اہمیت نہ دی، تسلی دے کر لیٹ گئے۔
"تم کئی دنوں سے اپنی نیند پوری نہیں کر پائے۔ سو جاؤ اور کل سے دس بجے تک سو جایا کرنا۔ یوں بھی شادی کے بعد رت جگے کرنے ہیں۔" جمی نے مذاق کیا۔
اور کمبل تان لیا۔
عباس نے آنکھیں بند کر لیں۔
لیکن ——
نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ ساری رات بے چین رہا۔ کئی بار اٹھ کر دیوار کا جائزہ لیا۔
یہ دیوار تو ساتھ والی کوٹھی کی طرف کی تھی، ادھر تو کوئی سڑک وغیرہ تھی ہی نہیں۔
لیکن ——
لیکن ——
اس نے جو کچھ دیکھا تھا ——
وہ کیا تھا ——؟
کیوں تھا ——؟
وہ سارا دن بھی پریشان رہا ——

اس کا دل کانپ رہا تھا۔ بے یقینی کے باوجود بھی یقین تھا کہ وہ کچھ اس نے دیکھا ہے۔ وہ ہونے والا ہے۔
اور ——
اس رات ——
جب لڑکیاں حسبِ معمول فارغ ہو کر ڈھولک لے بیٹھیں —— تو تھاپ پڑتے ہی عباس دیوانہ وار کمرے کی طرف بھاگا۔
"بند کر دو —— بند کر دو ——" وہ چیخا۔
"کیوں کر دیں ——" کوئی لڑکی بولی۔ لیکن بیشتر لڑکیاں عباس کو دیکھ رہی تھیں۔
جس کا چہرہ پریشان تھا۔ آنکھیں سرخ ہو کر ڈراؤنی لگ رہی تھیں، اور جو سر تا پا کانپ رہا تھا۔
"عباس —— عباس ——" اس کی امی نے اسے ساتھ لگا لیا۔ نازہ، نازہ، عمارہ اس سے لپٹ گئیں۔ اور لوگ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔
"کیا ہوا تمہیں میرے لال ——" ماں کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے ابو بھی پریشان ہو گئے۔
عباس کو بستر پر لٹا دیا گیا۔
"تھکاوٹ ہے ——"
"رات رات بھر جاگنا اور سارا سارا دن بھاگ دوڑ کرنا۔ آخر

انسان ہی ہے نا ——"

"اسے کوئی ٹرینکولائزر دے کر سلا دیا جائے۔"

"ریسٹ چاہیئے ——"

"چلو آج گانا بجانا ختم۔ اسے مکمل آرام کرنے دو ——"

عباس کو بستر میں لٹا دیا گیا —— اس نے خواب آور گولیاں بھی کھالیں ——

سارا گھر پریشان ہو گیا ——

ماں باپ اور بہنیں تو بے طرح گھبرا گئے۔ سب کے لیے رات اتنی تیرہ و تاریک اور لمبی ہو گئی کہ صبح ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔

صبح اتنی دھماکہ خیز تھی ——

کہ سب ہی بوکھلا گئے ——

عباس نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔

خبر جنگل کی آگ تھی۔ جو پھیلتی چلی گئی۔

جس نے سنا دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔

شادی میں صرف دو دن باقی تھے۔ لڑکی والوں کے لیے تو یہ کسی سوٹن کا وزنی غم تھا جو ان کے ہوش و حواس پر گرا —— اور پرخچے اڑا دیئے۔

تیاریاں مکمل تھیں ——

کارڈ بانٹے جا چکے تھے ——

کھانے پینے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ ٹینٹ سروس اور لائٹنگ والوں کو آرڈرز دیئے جا چکے تھے۔

میجر سرفراز جیسے جیتے جی مر گئے۔ انکا دماغ ماؤف ہو گیا۔ کچھ سوچا جا رہا تھا سمجھ نہ رہے تھے۔

بلاوجہ ——

بغیر کسی بات کے ——

لڑکے نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔

رسوائی اور سب کی تو ایک طرف ان بیچاروں کو تو سمجھ نہ آ رہی تھی شادی ملتوی ہونے کی لوگوں کو اطلاع کیونکر دیں۔

سولینہ رو رو کر نڈھال ہو گئی تھی۔

اس کی امی کو غش پہ غش آ رہے تھے۔

بھائی بہنیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

ہونا کیا تھا ——

اور ——

ہو کیا گیا تھا ——

ہنستے مسکراتے اور خوشیاں چن چن کر جھولیاں بھرتے لوگ موت کے سناٹوں جیسی خاموشی میں ڈوب گئے۔

"آپ نے سنا کمال بھائی ——" مانو گرفتہ سی تھی۔

"ہاں ——"

"کہیں ——"؟

"کیا ——؟"

"آپ نے تو کوئی ——"

"مانو ——"

کمال مانو کی بات سمجھ کر غصے سے بولا۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ سولینہ کی شادی رکوانے کا ذلیل فعل مجھ سے سرزد ہوا ہے۔"

مانو ڈر گئی ——

"سولینہ مجھے پسند ہے۔ لیکن میں اتنا گرا ہوا نہیں۔ کہ اس کی اور اس کے خاندان کی عزت سے کھیل جاؤں۔"

"سوری بھائی جان —— مجھے تو کچھ سوجھ بوجھ ہی نہیں رہا۔ ظلم ہوا ہے ان لوگوں کے ساتھ۔ سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ کارڈ بٹ چکے تھے۔ اب تو لوگ آنا بھی شروع ہو گئے۔ جو سنتا ہے۔ پریشان ہو جاتا ہے۔"

"میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ——"

"سولینہ تو خیر —— اس صدمے سے اس کی امی مر جائیں گی۔"

"اُف ——"

"ان کی حالت بڑی خراب ہے۔ غش پہ غش کھا رہی ہیں۔ جب

ہوش میں آتی ہیں تو سینہ پیٹنے لگتی ہیں۔ ہائے بیچاری ——"

"بے انتہا ظلم ہے یہ —— میرا بس چلے تو اس ناہنجار کا گلا گھونٹ دوں۔ جس نے پر یہ ظلم کیا ہے۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔ انکار عین وقت پہ کیوں کیا۔؟"

"کچھ پتہ نہیں —— سنا ہے لڑکا کچھ بتاتا نہیں ہے —— لیکن سب کے سمجھانے اور منتیں کرنے پر بھی رضامند نہیں ہو رہا۔"

"اوہو —— کیا بنے گا ——"

"تباہ ہو جائیں گے لڑکی والے۔ ذلت بکی۔ رسوائی۔ آہ بیچاری سولینہ ——" کمال اِدھر اُدھر بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ مانو کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

ان کے والدین بھی یہ خبر سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ سولینہ اور اس کے والدین دیکھے بھالے تھے۔ انتہائی شریف لوگ تھے۔ لڑکی بھی معصوم اور نیک سیرت تھی۔ لڑکے نے کیوں انکار کر دیا تھا۔ ان کی سمجھ سے بالا تھا۔

قیاس آرائیاں کرتے ہوئے وہ سولینہ اور اس کے والدین کے لئے دل میں ہمدردی اور رحم کے جذبات موجزن پاتے تھے۔

مرگ کی سی خاموشی سارے گھر پر چھائی تھی۔ شادی میں شرکت کے لئے آئے لوگ عباس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔ لڑکی والوں

کی عزت کا واسطہ دیا تھا — ان کی رسوائی اور ذلت کے متعلق بتایا تھا
عباس کی امی اور ابو نے تو اسے دھمکی بھی دی تھی۔

امی نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا ——

ابو دم سادھے تھے ——

بہنیں حیران و پریشان تھیں ——

ان کے ہاں بھی تو ساری تیاری ہو چکی تھی۔ کارڈ تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ کھانے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ چاولوں کی بوریاں، گھی کے ٹین چینی کے تھیلے گرم مصالحے کی پوٹلیاں تو بیگم وقار نے کب سے چھان پھٹک کر بنوا دی تھیں۔ ساری کوٹھی پر کئی دنوں سے رنگ برنگے قمقمے دمک رہے تھے۔

عباس کے انکار اور اس انکار پر سختی سے کاربند رہنے کے بعد آج جب قمقمے اتارے جا رہے تھے تو عباس کی امی اس بدشگنی پر بین کر کر رو رہی تھی۔

ایک اکلوتے بیٹے کی یہ خوشی ان کے نصیب میں نہ تھی۔ کمند ٹوٹی بھی کہاں تھی۔

اور ——

پھر ——

یہ بھی تو پتہ نہ چل رہا تھا کہ ٹوٹی کیوں ——

"کچھ تو کہو عباس کسی نے کوئی دھمکی دی ہے۔"

"کسی نے لڑکی کے متعلق نہیں کچھ کہہ دیا ہے ——"

"اس کے گھر والوں کی کوئی بات سُن لی ہے ——"

"تم نے تو خود اصرار کر کے یہاں شادی کے لئے ہمیں تیار کیا تھا۔ اب کیا ہو گیا ہے۔"

عباس گم صُم بیٹھا سب باتیں سُنتا۔

پھر ——

گھبرا کر کہتا ——

"بس —— میں شادی نہیں کروں گا ——"

"کیوں ——"

"اس کیوں کا میرے پاس جواب نہیں ——"

"اپنی ذرا سی حماقت سے تم لڑکی اور اس کے گھر والوں پر ظلم کر رہے ہو ——"

وہ بے چین ہو جاتا ——

لیکن مستحکم آواز میں کہتا "مجبوری ہے ——"

اسی شام جب اس کے ابو نے تنہائی میں اس سے یہ سارے سوال کئے تو وہ بے چینی سے بولا۔

"ابو —— آپ ٹھیک کہتے ہیں —— میں جانتا ہوں۔ سولینہ اور اس کے گھر والوں کے لئے یہ بات بم کے دھماکے سے کم نہیں۔ لیکن میں شادی نہیں کروں گا —— میں —— میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"کیا مطلب ——"

وہ چپ چاپ خلاؤں میں گھورتا رہا۔

"لگتا ہے کسی نے تمہیں کوئی دھمکی دی ہے۔ اور اس دھمکی کے ساتھ زبان بند رکھنے کی بھی دھمکی دی ہے۔"

"نہیں ابو —— نہیں ——"

"پھر مرنے کی بات کیا سوجھی ——"

"کہہ دیا نا —— میں کچھ نہیں بتا سکتا —— بس آپ مجھے مجبور نہ کریں —— اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی چاہتے ہیں تو خدارا مجھے کچھ نہ کہیئے ——"

وہ ——

ایک دم اٹھ کر کمرے سے نکل گیا ——

وقار سوچتے رہ گئے ——

اب وقت نکل گیا تھا اسے مجبور کرنے سے فائدہ بھی تو نہ تھا۔

تقریباً سبھی مہمان واپس جا چکے تھے۔ گھر اب اک ویران سا سناٹا پھیلا ہوا تھا ——

عباس اپنے بستر پر لیٹا سامنے والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ دیوار جو اپنی جگہ قائم تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھا۔ لیکن اس نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر اسے رتی بھر پشیمانی نہ تھی۔ ملال ضرور تھا۔ لیکن دل مطمئن۔

سارہ نے دروازہ کھولا۔ "عباس ——"

"ہوں ——"

"سو گئے ——"

"نہیں —— آجاؤ ——"

وہ بستر میں اٹھ بیٹھا۔

سارہ اندر آکر اس کے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی اس کا چہرہ اداس اور اترا ہوا تھا۔

"تمہیں پتہ چلا ہے عباس ——" وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولی۔

"کس بات کا ——"

"سولینہ کی کل شادی ہے ——"

وہ گنگ سا ہو گیا۔

سارہ بولی "سولینہ کی کسی دوست کے بھائی نے ان کے بگڑے معاملے کو سنبھال لیا ہے۔ سنا ہے کل وہ اسی دن اور اسی وقت بارات لے کر آئیں گے۔ بڑا عظیم آدمی ہے کوئی۔ جس نے جرأت سے اپنے آپ کو پیش کر کے ان کی مدد کی ہے —— سولینہ کے بھی تو کارڈ بٹ چکے تھے۔"

وہ چپ رہا ——

"ہے تو مشکل کام —— لیکن سولینہ کے والدین خدا کا شکر ادا کر رہے

ہیں۔ بڑا قابل لڑکا مل گیا ہے۔ شادی اب اپنے مقررہ وقت پر ہوگی تم سے نہ سہی کسی اور سے سہی ۔۔ ماں باپ کا بوجھ تو اتر جائے گا۔"

وہ اب بھی چپ تھا۔ دونوں ہاتھوں پر سر گرائے وہ سوچوں میں گم تھا۔

"سارہ ——" کئی لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا۔

"ہوں ——"

"خدا کرے یہ شادی بخیر انجام پائے —— اور سولینہ سکھی رہے ——"

سارہ نے غور سے بھائی کو دیکھا۔ وہ مضمحل ضرور تھا۔ لیکن ——

پشیمان یہ خبر سن کر بھی نہ تھا۔

سارہ چند لمحے چپ رہی۔

پھر بڑے دوستانہ انداز میں عباس کو دیکھتے ہوئے قدرے مسکرائی۔ "ایک بات بتاؤ گے عباس ——؟"

"کیا ——؟"

"اب تو وقت گزر گیا۔ میں تمہیں یہ نہیں کہوں گی۔ کہ سولینہ سے شادی کرو۔ لیکن یہ ضرور پوچھنا چاہتی ہوں۔ کہ تم نے اس طرح عین وقت پر انکار کیوں کیا —— جبکہ شادی تمہاری مرضی اور پسند سے ہو رہی تھی۔" وہ چپ رہا۔

"نہیں بتاؤ گے ——؟" وہ ہولے سے مسکرائی۔ "ویسے بتا دو ہرج بھی نہیں ——"

"ہاں ہرج بھی نہیں ——"

"پھر ——"

"بتاتا ہوں ——"

وہ اس رات کا واقعہ بتانے لگا۔ سارہ حیرت سے اسے تک رہی تھی ——

"حادثے میں دولہا مر گیا —— دلہن زخمی ہوئی۔ دلہن سولینہ تھی۔ سارہ اس نے وہی عروسی جوڑا پہن رکھا تھا۔ جو ہم نے درزی کی دکان پر دیکھا تھا ——"

وہ جیسے اب بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

"عباس ——" فرط حیرت سے سارہ کی آنکھیں پھیلی تھیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہوش میں تو ہو نا ——"

"ہاں ہوش میں ہوں ——"

"پھر جو بات کر رہے ہو ——"

"وہ بھی ہوش کی ہے۔ سارہ میں نے اپنی آنکھوں سے سارا واقعہ دیکھا ہے۔ سولینہ نے وہی جوڑا پہن رکھا تھا وہ زخمی ہوئی تھی۔ لیکن دولہا

مر گیا تھا ـــــ میں نے اسی لئے انکار کر دیا ـــــ میں ـــــ میں مرنا نہیں چاہتا ـــــ"

"پاگل کہیں کے ـــــ" سارہ نے اسے غصے سے جھنجوڑ ڈالا۔

"اک واہمے پر تم نے سولینہ کے جذبات کو دیکھا نہ اس کے والدین کی عزت کا خیال کیا؟"

"سارہ میں نے سب کچھ جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا ـــــ کوئی ذی ہوش آدمی اک واہمے پر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔" وہ بے حد غصے میں تھی۔ اس کی نقل اتارتے ہوئے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

"دیوار ہٹ گئی اور تجھے سڑک نظر آنے لگی۔ ہونہہ۔"

وہ غصے سے جانے کیا کچھ کہتی رہی۔

شور مچاتی رہی ـــــ

کوستی رہی ـــــ

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

لیکن اپنے فیصلے پر وہ پشیمان اب بھی نہیں تھا۔

ہاں ـــــ

اسے اک نئی فکر نے آن گھیرا تھا۔

کاش وہ اس انجان آدمی کو اس شادی سے باز رکھ سکتا۔

دوسرے دن سولینہ کی شادی کمال سے ہو گئی۔ سولینہ کے والدین ممنون احسان تھے۔ ذہنی اذیت اور کرب کے دور سے تو گزر رہے تھے کمال کی پیش کش پر پھولے نہ سما رہے تھے۔ سولینہ کو عباس کے ساتھ بھی کمال کے ساتھ رخصت تو کر دیا تھا۔ کام بطریق احسن وقت مقررہ پر نپٹ گیا۔

لیکن ـــــ

پھولوں لدی گاڑی میں سرخ جھلملاتے عروسی جوڑے میں ملبوس سولینہ کمال کے گھر تک بھی نہ پہنچ پائی تھی۔

کہ ہائی وے پر خوفناک حادثہ ہو گیا۔

سامنے سے آنے والے بے قابو ٹرک سے پھولوں اور ارمانوں بھری کار ٹکرا گئی۔

حادثے کی جانکاہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ جائے وقوعہ کی طرف بے اختیارانہ دوڑ پڑے۔ گاڑیاں اسکوٹر، سائیکلیں اس طرف بھاگ رہی تھیں۔

اور ـــــ

ان بھاگنے والوں میں عباس بھی تھا۔

گاڑی سرپٹ دوڑائے وہ جائے حادثہ کی طرف جا رہا تھا ـــــ اور ـــــ جب ـــــ وہ ہاں پہنچا ـــــ

تو ـــــ

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔
بالکل وہی منظر تھا جو اس نے چند دن پہلے اپنے کمرے میں
لیٹے لیٹے دیکھا تھا ——
دولہا مر چکا تھا ——
اور ——
دلہن زخمی ہو کر بے ہوش تھی۔ لوگ گاڑی میں سے لاش اور
زخمیوں کو نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔
سولینہ کا چہرہ اس نے دیکھا۔ اس کا سرخ ٹیشو کا بھاری کام والا
عروسی جوڑا دیکھا ——
اور ——
بے اختیارانہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔
سارہ نے سارا واقعہ سب گھر والوں کو سنا دیا تھا اور اسے
عباس کا خلل دماغ قرار دے رہی تھی
لیکن ——
دوسرے ہی دن جو کچھ ہوا۔ عباس کی بات جس طرح صحیح نکلی
سب ششدر رہ گئے۔

اس واقعے کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ سولینہ اب مسز عباس ہے
اور دو منے منے بچوں کی ماں ہے۔ حادثے کے سال بھر بعد عباس

نے سولینہ سے نکاح کر لیا تھا۔ بڑی خاموشی اور سادگی سے۔ نہ تو
پھولوں سے گاڑی سجائی تھی۔ اور نہ ہی اسے سرخ جوڑا پہننے دیا تھا۔
وہ ان دونوں چیزوں سے اب تک خوفزدہ تھا۔
اس نے سارا واقعہ سولینہ کو بھی سنایا تھا ——
اس کے والدین کو بھی ——
ہر ملنے جلنے والے کو بھی ——
لیکن ——
وہ اب تک نہ سمجھ پایا ——
کوئی بھی تو نہ سمجھ پایا ——
کہ ——
وہ کیا تھا ——؟
اور ——
کیوں تھا ——؟

فیصلہ

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا سفینہ ——" بانو نے حیرت اور غصے سے اسے دیکھتے ہوئے تند لہجے میں کہا۔

"نہیں ——" سفینہ نے پورے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔

"سفینہ ——" بانو کھسک کر اس کے قریب ہو گئی اور ہمدردانہ انداز میں اسے تکتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

سفینہ صوفے کی پشت پر گردن ٹکائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھایا۔ سپاٹ نظروں سے بانو کو دیکھا اور پھر لبوں پر تبسم کی مجروح سی لہریں لہراتے ہوئے کہا —— "میں نے سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

"کوئی ذی عقل انسان اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہیں مارتا سفینہ! مجھے تو تیری عقل پر شک ہو رہا ہے۔"

"بانو —— میں نے کہا نا —— جو کچھ میں نے کیا ٹھیک کیا۔ سوچ سمجھ کر کیا ——"

"شوہر کو دوسری شادی کی اجازت لکھ کر دے دی۔ اور کہہ رہی ہو ٹھیک کیا سوچ سمجھ کر کیا۔"

سفینہ نے بانو کی طرف دیکھا —— اب اس کی آنکھیں سپاٹ نہیں تھیں۔ ان میں دھند سی بھر گئی تھی —— اس نے جلدی سے آنکھیں جھکا لیں۔

"میں کہتی ہوں اب بھی واپس لے لو کاغذ۔" بانو اپنے ہاتھوں کو اضطراب سے ملتے ہوئے بولی۔

سفینہ ہنسی، کتنی ناتواں اور خوشی سے عاری ہنسی تھی یہ۔ بانو کا دل سلگا گیا۔ اپنی دوست کے دکھ سے وہ دکھی ہو رہی تھی۔

"سفینہ —— وہاب نے تم سے زبردستی تو اجازت نامہ نہیں لکھوایا نا —— پھر —— پھر تم اسے واپس کیوں نہیں لے لیتیں۔ جذباتی فیصلے احمقانہ ہوتے ہیں۔ بعد میں پچھتاؤ گی۔"

"بانو ——" سفینہ نے اپنے بیالیس سالہ وجود کو سمیٹ کر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا —— "بانو میں نے جو بھی فیصلہ کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ وہاب زبردستی واقعی اجازت نامہ نہیں لے سکتا تھا لیکن —— لیکن بانو —— بعض اوقات زبردستی نہ کرنا بھی سب سے بڑی زبردستی ہوتی ہے۔"

بانو کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے اپنی عزیز ترین دوست سفینہ کا منہ تکنے لگی۔

سفینہ کو صرف بانو ہی نہیں، ہر بہی خواہ اس فیصلے سے روکنے کی کوشش کر چکا تھا۔ پرنسپل بیگم سلیم واجدی نے بطور خاص اسے آفس میں بلا کر سمجھایا تھا۔

اسٹاف ممبرز نے بہت کچھ کہا تھا جو زیادہ قریب تھے اس کا دکھ محسوس کر کے دکھی بھی ہوئے تھے۔

ان کے علاوہ عزیزوں رشتے داروں نے بھی یہ انتہائی قدم اٹھانے سے منع کیا تھا۔

رشتے کی سفینہ کی بھابی نے تو جل کر کہا تھا۔ "اپنے اوپر سوت لا بیٹھنے سے تو اچھا ہے طلاق لے لو۔ ایک ہی دکھ ہو گا نا۔ سوت تو لمحے لمحے کی موت بن کر آئے گی۔ میں حیران ہوں اتنی سمجھ دار ہو کر بھی تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟"

پھر انہوں نے وہاب کو بھی خوب کوسا تھا۔ برا بھلا کہا تھا انتہائی خود غرض لالچی اور حریص کہا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی تھی بھابی کی لعنت ملامت کا اس پر جیسے اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے جو فیصلہ کر لیا تھا اس پر قائم تھی کسی سے گلہ کر رہی تھی نہ شکوہ ــــ گلہ اور شکوہ تو اس نے وہاب سے بھی نہیں کیا تھا۔

وہاب ــــ جو اس کا شوہر تھا۔

اس کے بے پناہ احسانوں تلے اس طرح دبا تھا کہ سانس بھی نہ لے پا سکتا تھا۔

چھ سال پہلے کی بات تھی۔

امی کے فوت ہونے کے بعد سفینہ اس کوٹھی میں تنہا رہ گئی تھی دونوں ماں بیٹی کئی برسوں سے اس کوٹھی میں لگے بندھے اصولوں کے تحت زندگی بسر کر رہی تھیں۔

سفینہ نے ایم۔ اے اکنامکس کیا تھا۔ اور پڑھائی سے فارغ ہوتے ہی اسلامیہ کالج میں لیکچرر کی جاب مل گئی تھی۔ تب سے اب تک وہ وہیں پڑھا رہی تھی۔ امی کی کوشش اور خواہش کے باوجود سفینہ کے ہاتھ پیلے نہ ہو پائے تھے۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ نہ ہی سفینہ کوئی بدصورت اور درخورِ اعتنا سمجھی جانے والی شخصیت تھی وہ تو بڑی خوش خلق، ملنسار ہمدرد اور مخلص تھی۔

لیکن شادی میں رکاوٹ کی اور بھی وجوہ تھیں۔

اس کے ابا بیمار ہو گئے تھے فالج زدہ باپ کی خدمت کرنے کے لئے اسے اپنی فطری امنگوں کی قربانی دینا پڑی تھی۔ ابا سات آٹھ سال تک صاحب فراش رہ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوئے تو ماں کی تنہائی سدِ راہ بنی۔ اکلوتی بیٹی تھی کوئی ماموں چچا بھی نہ تھا۔

غمزدہ ماں کو کس کے حوالے کرتی۔ یوں بھی عمر کا جذباتی دور گزر چکا تھا۔ اب عمر اور تعلیم کے حساب سے رشتہ ملنا ناممکن نہیں تو ممکن

بھی نہ لگتا تھا۔

امی بے چاری تو ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔ سفینہ کو دیکھتیں تو دل لہولہو ہو جاتا اک بوجھ کی طرح وہ ان کے سینے پر دھری تھی۔

"سفینہ، اب بھی شادی کر لو۔" وہ سفینہ سے کہتیں۔

سفینہ کبھی ہنس پڑتی۔ اور کبھی رکھائی سے ماں کا منہ تکتی۔

گھر بسانے کی اُمنگ اس کے دل میں تھی۔ یہ اُمنگ کبھی مری نہیں تھی۔ ہاں حالات کی سِل تلے دب کر سسکتی رہی تھی۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں سات سات آٹھ آٹھ سال کے بچوں کی مائیں بن چکی تھیں اس کی کلاس فیلوز میں سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

اس کا بھی جی چاہتا تھا۔ بہت جی چاہتا تھا کہ اس کی شادی ہو۔ شوہر ہو بچے ہوں۔ بھرا بھرا سا پُر رونق سا گھر ہو۔ لیکن امی کے بڑھاپے کا خیال آتے ہی یہ خواہش دَب جاتی۔

امی کو اس عمر میں کس کے سہارے چھوڑوں۔ ابا کے بعد کتنی غمزدہ رہتی ہیں۔ آئے دن بیمار ہو جاتی ہیں۔ کیا انہیں نوکروں کے سہارے چھوڑ دوں۔

وہ خود ہی سوچتی اور خود ہی نفی میں سر ہلاتی۔

اس نے امی کو بے سہارا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ویسے بھی تیس تینتیس سال کی ہو چکی تھی۔ اس عمر میں رشتے اور وہ بھی اپنی پسند اور معیار کے ملنے مشکل ہی تھے۔

اس نے امی کی خدمت کو شعار بنا لیا اس ماں نے اسے کتنی محبت سے

پالا پوسا تھا، دکھ جھیلے تھے، مصیبتیں برداشت کیں تھیں۔ امی کی خوشیوں کا خاطر اپنا من مارا تھا تو کیا وہ ماں کے لئے یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یا اسے نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

اس نے امی کی خدمت عبادت سمجھ کر کی۔

ابا کی طرح امی بھی صاحبِ فراش ہو گئیں۔ تین سال چارپائی سے اٹھ نہ سکیں۔ خاندانی نوکر فتح اور اس کی بیوی شانو کو سفینہ نے ہاتھوں میں رکھا۔ ان کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ اور بھی بہت سی سہولتیں دیں۔ وہ کالج جاتی تو یہ دونوں امی کا خیال رکھتے۔

کالج سے واپس آ کر وہ خود امی کی خدمت میں جُٹ جاتی۔ ان کی دوائی خوراک اور لباس کا خیال رکھتی۔

امی کی روئیں روئیں سے اس کے لئے دعائیں نکلتیں۔ اس کی آبادی کے خواب اب بھی ان کی دُھندلائی چندھیاں آنکھوں میں روشن تھے۔

کبھی کبھی اس کا ہاتھ اپنے نحیف ہاتھوں میں پکڑ کر ہونٹوں سے لگا کر آبدیدہ ہوتے ہوئے کہتیں۔

"سفینہ، میں بھی نہ رہی تو تُو اکیلی کیسے رہے گی میری بچی۔ کاش میں تجھے تیرے گھر آباد دیکھ سکتی۔"

وہ بڑے دلار سے جواب دیتی ــــ "اماں آباد ہی تو ہوں اپنے گھر میں ــــ اتنی مصروف ہوں کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔ شادی ایک شرط پر کر سکتی ہوں۔"

"امی جلدی سے کہتیں۔ "کس شرط پر؟"

"کہ آپ جلدی سے اچھی ہو جائیں ـــ بستر چھوڑ دیں، اٹھیں چلیں پھریں شادی شادی کی رٹ لگائے رکھتی ہو ـــ یہ تو بتائیں۔ میں شادی پر رضامند ہو بھی ہو جاؤں تو تیاریاں کون کرے گا ـــ میں خود ـــ؟ اوہو ہو..... بری بات..... آپ نے میری شادی کرنا ہی ہے تو اچھا ہو کر دکھائیں۔"

وہ ماں کے سینے سے لپٹ کر انہیں خوش کرنے اور ہنسانے کو کہتی۔

لیکن امی کا سینہ گھٹی گھٹی آہوں سے پھٹنے لگتا ـــ ان کی آنکھیں بھر آتیں ـــ اور وہ سفینہ کو سینے میں چھپا لینے کی اپنی سی کوشش کرنے لگتیں۔

ان کی حالت دن بدن بگڑتی چلی گئی۔

اور آخر وہ دن آن پہنچا۔ جب سفینہ کی ساری کوششیں، ساری تگ و دو ساری دعائیں بیکار ہو گئیں۔

کشتیٔ حیات رات بھر ہچکولے کھاتی رہی ـــ اور پو پھٹتے ہی بیکراں سمندر میں کبھی نہ ابھرنے کے لئے ڈوب گئی۔

سفینہ بے بس ہو گئی۔

تنہائی کا احساس اچانک ہی جاگ اٹھا۔

ماں سے لپٹ لپٹ کر روئی۔ عزیز رشتے دار، دوست احباب جمع

ہو گئے۔

سفینہ سچی نہیں تھی چھتیس سالہ پختہ مزاج عورت تھی۔ لیکن ماں سے بچھڑنا آسان نہیں تھا۔ وہ تو بالکل معصوم بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ آج پہلی بار یہ کاٹ دار احساس ہو رہا تھا کہ اس بھری دنیا میں وہ بالکل اکیلی اور بے سہارا ہو گئی ہے۔

چند دن ماتمی گھر میں ہنگامہ رہا ـــ پھر زندگی جو کچھ ڈگمگائی تھی اپنے ڈگر پر آ گئی۔

سفینہ کالج جانے لگی اور گھر کی ذمے داری پوری کی پوری شانو اور فتح نے سنبھال لی۔

اس دن وہ کالج سے ذرا دیر سے لوٹی۔ مسز بشیر اور فاخرہ رحیم گپ شپ لگا رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ رہی۔ گھر جاتے وقت اسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔

بور سے معمولات تھے۔ وہی جاتے ہی کپڑے بدلنا، ہاتھ منہ دھونا منہ پر لگا کھانا زہر مار کرنا۔ پھر سو جانا۔ اٹھ کر کاپیوں کتابوں کے ڈھیر میں گم ہو جانا۔ پھر رات کا کھانا کھانا اور اپنے کمرے میں جا کر کبھی مطالعے میں مصروف ہو جانا، کبھی پرانی یادوں کی ترشی تلخی اور مٹھاس میں گم ہو کر پہروں جاگتے رہنا۔

آج مسز بشیر اور فاخرہ کے ساتھ اس نے خوب باتیں کی تھیں۔

"گھر جا کر تو منہ کو چپ لگ جاتی ہے۔ کوئی ہوتا ہی نہیں جس سے باتیں

کر کے دل کی بھڑاس نکالا کروں۔" اس نے کہا۔

"تو مسز بشیر ہنس کر بولیں ـــــ" سفینہ ـــــ اب تمہیں گھر بسا لینا چاہیئے ـــــ"

"ہائے ہائے ـــ اب اس عمر میں؟"

"کیا ہوا۔"

"کون چٹ سر امیری راہ دیکھ رہا ہوگا۔"

"کہو تو ڈھونڈ نکالیں۔"

"سوچوں گی۔"

فاخرہ رحیم نے سنجیدگی سے کہا ـــ "تم واقعی تیار ہو جاؤ تو رشتہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

سفینہ مسکرا کر بولی۔ "اس عمر میں یا تو کوئی چھ سات بچوں کا رنڈوا باپ مل جائے گا یا....."

فاخرہ اور مسز بشیر ہنس پڑیں۔

پھر مسز بشیر بولیں۔ "کہنی تو ٹھیک ہو۔ لیکن ضروری تو نہیں کہ کسی بچوں والے سے ہی شادی کی جائے۔"

فاخرہ نے کہا۔ "ہاں کئی لوگ دوسری شادی اولاد کے لئے کرتے ہیں۔ پہلی بیوی سے بچے نہیں ہوتے۔ دوسری کر لیتے ہیں۔ ایسا آدمی تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔"

"نہ بھئی ـــ" سفینہ بولی۔ "اتنی عمر میں ترس ترس کر شادی ہو۔ اور سوت

کی میخ سینے میں گڑی رہے۔ نہ نہ ـــ نہ ـــ"

"پھر کون سر پھرا کنوارا بیٹھا ہوگا ـــ اب تک ـــ کتنی عمر ہے تمہاری؟"

"چھتیس کی ہو جاؤں گی اگلے ماہ ـــ چالیس پچاس کا دولہا ملے گا۔" وہ ہنس کر بولی۔

فاخرہ اور مسز بشیر بھی ہنس پڑیں۔

"ویسے کوشش کی جائے تو بر مل سکتا ہے سفینہ۔ تمہاری مالی حیثیت خاصی مستحکم ہے۔ اتنی بڑی کوٹھی کی اکیلی وارث ہو۔"

"ایک شوروم بھی تو ہے نا اس کا۔" مسز بشیر بولی۔

"تو کیا روپے پیسے کے لالچ میں کوئی مجھ پر رحم کھانے کو تیار ہو جائے گا ـــ" سفینہ سنجیدگی سے بولی ـــ "میں تو بھول کر بھی یہ غلطی نہیں کروں گی۔"

"اچھا بھئی یہ تو طے ہو گیا کہ تم شادی کرنے کو تیار ہو۔"

"بشرطیکہ کوئی مخلص انسان انتہائی شرافت سے میرا ہاتھ تھامنے کو تیار ہو۔"

اسی طرح کی باتیں کافی دیر ہوتی رہیں۔ جب سفینہ گھر جانے کو اٹھی تو کاشاش بشاش تھی۔

گھر آتے ہی شانو نے کہا۔ "آج اتنی دیر لگا دی بی بی۔ دو دفعہ کھانا لگا چکی ہوں۔"

"دو دفعہ کیوں؟" وہ ہنس کر بولی۔

"ٹھیک وقت پر لگایا تھا۔ پڑا پڑا ٹھنڈا ہو گیا ـــــ پھر گاڑی کی آواز آئی تو لگایا ـــــ لیکن ـــــ آپ آئی نہیں ـــــ سامنے والوں کی گاڑی تھی۔"

"چلو اب لگاؤ۔ کیا بنایا ہے۔"

شانو مڑتے ہوئے بولی۔ "آپ کی پسندیدہ چیزیں۔"

"لگاؤ کھانا۔ میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔ پھلکا تازہ بنانا ـــ کہیں وہی گرم کر لاؤ۔"

"پہلے کب بنایا تھا پھلکا جو گرم کر لاؤں گی ـــــ" شانو کچن کی طرف چلی گئی۔

سفینہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ بیگ میز پر رکھا اور دھم سے بستر پر آڑی پر گئی۔ چند لمحے یونہی سستانے کے بعد اٹھی۔ الماری سے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں چلی گئی۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دیر تک اپنا آپ تکتی رہی اس کے ذہن میں خیالات کی یلغار ہو رہی تھی۔

"ابھی اتنی بوڑھی تو نہیں لگتی میں"

"خاصی اسمارٹ ہوں"

"بال بھی کالے اور چمکیلے ہیں"

"چہرے پر ـــ ہاں ـــ ٹین ایجرز جیسی شگفتگی تو بے شک نہیں۔

لیکن ـ ایسا مرجھایا ہوا بھی تو نہیں لگتا ـــ ہاں عمر تو جتنی ہے چہرے سے لگتی ہی ہے"

"جلد کچھ سخت پڑ گئی ہے ـــ رنگ بھی ویسا نہیں رہا جیسے کبھی تھا"

"پھر بھی، ملاحت تو ہے"

"میک اپ کروں تو اس کی تہہ میں عمر کے آٹھ دس سال ضرور غائب ہو سکتے ہیں"

اپنی سوچوں پر وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

پھر ـــ

ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

منہ ہاتھ دھویا، بالوں میں برش پھیرا۔ کپڑے بدلے اور کالج کے کپڑے لا کر الماری میں لٹکا دیئے۔

مسز بشیر اور فاخرہ سے اس وقت تو وہ ہنسی مذاق کرتی رہی تھی لیکن اس ہنسی مذاق نے ہی من کے بعض حساس گوشوں کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ خاصی اپ سیٹ ہو رہی تھی۔ شادی اک فطری تقاضا تھا اور ابھی وہ عمر کے اس حصے کو نہیں پہنچی تھی۔ جہاں یہ فطری تقاضے آپ ہی آپ مر جاتے ہیں۔

وہ کھانے کے کمرے میں آئی۔ واقعی اس کی پسندیدہ ڈش تھی ـــ شانو گرم گرم پھلکا لے آئی۔

وہ کھانا کھانے لگی۔

شانو دوسرا پھلکا لے آئی ـــ بس دو ہی تو پھلکے چاہیئے تھے اس کے لئے۔

شانو جگ اٹھایا اور سفینہ کے سامنے رکھے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے بولی۔ "بی بی! آج کچھ لوگ گھر دیکھنے آئے تھے۔"

سفینہ نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ دکان والا ہے نا۔ اس کے ساتھ آئے تھے۔"

"پراپرٹی ڈیلر خان کے ساتھ۔"

"جی جی"

"پھر؟"

"وہ حصّہ دکھا دیا تھا۔"

"کون لوگ تھے۔ میرا مطلب ہے کیسے لوگ تھے۔"

"پتہ نہیں بی بی ـــ ایک بی بی تھی ـــ ساتھ بیس بائیس برس کا لڑکا تھا۔"

"پسند آیا انہیں"

"شام کو پھر آنے کا کہہ گئے تھے۔ چھ ساڑھے چھ بجے پھر آئیں گے۔" شانو نے کہا۔

"اچھا۔" سفینہ پھر کھانے میں مصروف ہو گئی۔

امی کے مرنے بعد اس نے کوٹھی کا ایک پورشن الگ کروا دیا۔

تھا۔ کرائے سے زیادہ اُسے انسانوں کی ضرورت تھی۔ دو کمرے دو باتھ روم کچن کے ساتھ پچھلے لان کا تھوڑا سا حصّہ بھی اس پورشن میں تھا۔ چھوٹی سی فیملی بآسانی گزر بسر کر سکتی تھی۔

سات آٹھ ماہ ایک فیملی یہاں رہ کر گئی تھی۔ گو ان سے اس کے تعلقات زیادہ بڑھے نہیں تھے۔ پھر بھی ان کے ہونے کا احساس ہی کافی تھا ـــ سفینہ نے تنہا ہونے کا جان لیوا احساس اپنے میں کسی حد تک کم ہی پایا تھا۔

اب یہ حصّہ خالی تھا۔ اس نے پراپرٹی ڈیلر سے کہہ رکھا تھا کسی شریف فیملی کو یہ حصّہ دینے کے لئے وہ تیار تھی۔

شام کو وہ لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ فتح اور شانو کیاریوں میں پانی دے رہے تھے۔ فتح کو باغبانی کا شوق تھا۔ فرصت کے وقت وہ لان کو بنانے سنوارنے میں لگا رہتا۔ سفینہ کے ابا جب ٹھیک ٹھاک تھے تو باقاعدہ مالی رکھا ہوا تھا۔ لیکن جب وہ بیمار پڑے اور آمدنی کا بیشتر حصّہ بیماری پر صرف ہونے کے ساتھ کاروبار بھی نقصان میں جانے لگا تو فتح ہی نے دیگر کاموں کے ساتھ مالی کے فرائض بھی سنبھال لئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لان موسمی پھولوں سے لدا تھا ـــ گھاس کا مخملیں فرش ہموار تھا اور برآمدوں کے در پھولوں لدی بیلوں سے ڈھکے تھے۔

وہ فتح سے باتیں کر رہی تھی۔ پھولوں کو سلیقے سے لگانے کی

تعریفیں کر رہی تھی کہ شانو نے خان کے ساتھ دوپہر کو آنے والے کرائے داروں کو گیٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ پانی کا پائپ وہیں چھوڑ کر وہ سفینہ کی طرف لپکی۔

"بی بی! وہ لوگ آئے ہیں۔"

سفینہ نے گیٹ کی طرف دیکھا ـــــ خان کے ساتھ ایک جوان لڑکا اور اٹھائیس تیس سالہ عورت ایک تین سالہ بچے کی انگلی پکڑے آ رہی تھی۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔" سفینہ نے شانو سے کہا۔

وہ اپنے گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے آنے والوں کی طرف بڑھی۔

سفینہ بھی دوسرے برآمدے کی طرف چل دی۔

خان ان دونوں کو شانو کے ساتھ بھیج کر برآمدے میں آ گیا علیحدگی میں شاید سفینہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

سفینہ کے قریب جا کر اس نے سلام کیا۔

جواب دیتے ہوئے سفینہ رک گئی۔

"کیسے لوگ ہیں خان صاحب"

"نہایت شریف۔ اس بات کی میں ضمانت دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بات کر لیتے ہیں۔"

"کرایہ زیادہ نہیں دے سکتے اور پیشگی بھی دینے سے قاصر ہیں۔"

سفینہ نے خاموشی نظروں سے خان صاحب کو دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"یہ نہ ہو مکان میں گھس آئیں تو پھر کرایہ بھی نہ دے سکیں ـــــ کون ضامن ہوگا۔"

"نہیں یہ بات نہیں مس صاحبہ ـــــ! کرایہ ہر ماہ باقاعدگی سے ادا کریں گے۔"

"اور گھر کی توڑ پھوڑ۔"

"مختصر سا کنبہ ہے۔ اچھے لوگ لگتے ہیں۔ بہرحال مکان دینا تو آپ نے اپنی مرضی سے ہے۔ میں نے ان لوگوں کے بارے میں آپ کو بتایا تھا۔ آگے آپ جیسے چاہیں، ان سے مل لیں خود ہی فیصلہ کر لیں۔" خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ جائیں ـــــ میں خود ان لوگوں سے بات کر لوں گی۔" سفینہ بولی۔

سفینہ اندر چلی گئی۔

خان واپس چلا گیا۔

شانو دونوں کو کمرے میں بٹھا کر سفینہ کو بلانے آ گئی۔

"آئیں جی! وہ لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" شانو نے اس کے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

"اچھا"

"بندے تو اچھے ہی لگتے ہیں۔" شانو نے کہا۔

"تجھے ایک منٹ میں ہی پتہ چل گیا۔"

"چل جاتا ہے جی۔ شریف لوگ ہیں۔ دونوں بہن بھائی ہیں۔ ایک بوڑھا باپ ہے۔ بس یہ ہے فیملی۔"

"اور وہ بچہ؟"

"بہن شادی شدہ ہے ـــــ دو بچے ہیں ـــــ شوہر سعودی عرب میں ہوتا ہے۔"

سفینہ مسکرائی "اتنا کچھ پوچھ بھی آئی تو۔"

شالو تفاخر سے مسکرائی۔

پھر سفارشی انداز میں بولی۔ "میرا خیال ہے ان لوگوں کو دے ہی دیں گھر ـــــ"

سفینہ نے سر ہلایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

دونوں آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ سفینہ کو دیکھتے ہی لڑکا موہانہ اٹھ کھڑا ہوگیا۔

لڑکی نے بھی سلام میں پہل کی۔

"بیٹھئے۔" سفینہ نے لڑکے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس لڑکی کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ علیک سلیک کے بعد رسمی سی احوال پرسی ہوئی۔ پھر تعارف ہوا۔

"ہم دوپہر کو بھی آئے تھے۔" عائشہ نے اپنے تین سالہ بچے کے ماتھے پر سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

"گھر دیکھ لیا؟" سفینہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہاب بولا "ہمارے لئے کافی ہے۔ ہم گھر کے تین چار افراد ہیں۔ ابا ہیں یہ باجی ان کے دو بچے اور ہیں۔"

"کرائے کا خان نے بتا دیا ہوگا۔" سفینہ بولی۔

وہاب نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

عائشہ بھی چند لمحے چپ رہی۔

پھر آہستگی سے بولی۔ "محترمہ ـــ کرایہ کچھ کم نہیں ہو سکتا۔ اور... اور ایڈوانس بھی دینے کی پوزیشن میں ہم.... نہیں ہیں۔"

سفینہ خاموش ہوگئی۔

عائشہ نے اپنے متعلق جلدی جلدی اسے بہت کچھ بتایا۔

یہ لوگ قریبی قصبے کے رہنے والے تھے۔ گاؤں میں ایک گھر اور تھوڑی سی زمین تھی۔ باپ بیمار رہنے لگا تھا۔ اس لئے شہر شفٹ ہونا چاہتے تھے تاکہ باپ کا علاج کروا سکیں۔"

"کیا بیماری ہے انہیں؟" سفینہ نے پوچھا۔

وہاب جلدی سے قدرے گھبرائے ہوئے بولا۔ "کوئی ایسی بیماری نہیں محترمہ ـ پرانا استھما ہے کسی وقت حالت ایک دم ہی خراب ہو جاتی ہے تو طبی سہولتیں وہاں میسر نہیں آتیں۔ میں یہاں ہی جاب کرتا ہوں چھٹی کے بعد دو گھنٹے گھر پہنچنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس لئے.... اس لئے.... پلیز.... ہمیں یہ گھر دے دیں۔ یہاں رہ کر میں اپنے باپ

کا علاج اچھی طرح کروا سکوں گا۔ اور.... اور اپنی نوکری اور پڑھائی بھی جاری رکھ سکوں گا۔"

"نوکری اور پڑھائی" سفینہ نے یونہی اس کے الفاظ دہرائے۔ تو عائشہ، وہاب پر اک پیار بھری نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "اسے پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ میٹرک کر کے گھر سے نکلا تھا اب ماشاءاللہ بی۔ اے کا امتحان دیا ہے۔ ساتھ ساتھ نوکری کر کے گھر کا بار بھی اٹھائے ہوئے ہے۔ ایم اے کے بعد مقابلے کا امتحان دینا چاہتا ہے بڑے اونچے اونچے پلان ہیں اس کے۔"

"ماشاءاللہ" سفینہ نے تحسین بھری نظروں سے وہاب کو دیکھا۔ جو مودبانہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

وہاب کی عمر بائیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن قد کاٹھ کا اچھا تھا۔ چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ گاؤں کی سادگی کا اثر ابھی تک اس پر تھا۔

کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔

سفینہ وہاب سے اس کی تعلیم کے متعلق بھی پوچھتی رہی اس کی ہمت افزائی کے لئے چند کلمات کہے۔

عائشہ اس کی باتیں سن کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ دنوں میں بہت بڑا آدمی بن جانا چاہتا ہے محترمہ۔"

وہ رکی۔ اور پھر بولی۔ "آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"مس سفینہ رفیق۔"

عائشہ اور وہاب نے ایک دم ہی حیرانی سے اسے دیکھا۔ عائشہ تعجبانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ.... آپ مس ہیں.... یعنی آپ کی شادی...."

"نہیں ہوئی" سفینہ نے بظاہر مسکراتے لیکن کچھ سبکی محسوس کرتے ہوئے اس کی بات پوری کر دی۔

وہاب نے اس کی طرف دیکھا اور پھر تعظیم سے بولا۔ "آپ کالج میں پڑھاتی ہیں نا؟"

"ہاں"

وہاب نے عائشہ کی طرف دیکھا اور ہولے سے بولا ـــــ دیکھا نا تعلیم کی لگن اور پیار ـــــ تمہاری طرح لوگ میٹرک کرتے ہی شادی نہیں کر بیٹھتے۔"

"چپ رہو" عائشہ نے بھائی کو پیار سے ڈانٹا۔

سفینہ نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ "اچھا تو پھر آپ کتنا کرایہ دے سکتے۔ ایڈوانس نہ سہی کچھ ضمانت۔"

عائشہ جلدی سے بولی۔ "ہم گاؤں والا گھر اور زمین بیچ رہے ہیں۔ جس نے بک گئی۔ ہم ایڈوانس اور ضمانت حاضر کر دیں گے فی الحال ....تو....."

وہاب کچھ نہیں بولا۔ مجبوری تھی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اسے عائشہ

کی دی ہوئی تفصیلات کے بعد سفینہ کے جواب کا انتظار تھا۔

سفینہ نے کچھ سوچا اور پھر بولی۔ "خان صاحب نے بھی ضمانت دی ہے۔ اُمید ہے آپ اپنے الفاظ پر قائم رہیں گی اور مکان کے سلسلے میں مجھے شکایت کا موقع نہیں دیں گی۔"

"آپ نے..... آپ نے مکان دے دیا ہمیں ——" وہاب بے یقینی سے بولا۔

"ہاں۔" سفینہ نے کہا۔ "آپ چاہیں تو کل ہی شفٹ کر سکتے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ باجی۔" عائشہ بولی۔ "آپ ہمیں اچھے کرائے دار اور شریف ہمسائے پائیں گے۔"

"ہاں باجی" وہاب نے بھی یقین دہانی کرائی۔

دوسرے دن عائشہ نے صبح ہی صبح آکر گھر کی صفائی کر دائی اور شام تک ان کا مختصر سا سامان آگیا۔ رات کا کھانا سفینہ نے فتح اور شانو کے ہاتھ ان کے ہاں بھجوا دیا۔

اگلی صبح کالج جاتے ہوئے وہ اس طرف عائشہ کے بیمار باپ کی احوال پرسی کرنے بھی گئی۔

شہاب الدین بڑے شفیق بزرگ تھے۔ اپنا آبائی گھر چھوڑ کر یہاں آنے کے خلاف تھے۔

"اس لڑکے سے میں عاجز ہوں۔" انہوں نے وہاب کے متعلق کہا۔ "شہر کا دلدادہ ہے وہ ——اسے تو یہ بھی تکلیف ہے کہ وہ اس بڑے شہر

میں پیدا کیوں نہ ہوا۔ بچپن اور لڑکپن چھوڑنے سے قصبے میں کیوں گزرا۔"

وہ شکایتی انداز میں پہلی ہی ملاقات میں وہاب کے متعلق سفینہ کو بتانے لگے۔

عائشہ اور وہ ان کی باتوں پر مسکراتی رہیں۔

سفینہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "جس طرح کے وہاب کے ارادے۔ اور خیالات ہیں۔ شہر میں رہ کر وہ بہت ترقی کرے گا۔"

"اس کا بس چلے تو دلوں میں آسمان کے تارے توڑ لائے۔" شہاب الدین نے کہا۔

"اچھی بات ہے نا ابا جی۔" عائشہ نے کہا۔ "اس کے عزائم بلند ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کر کے دکھائے گا ہی ایک دن۔"

"خدا کرے۔" ابا بولے "لیکن عزائم بلند کرنے ہی سے سب کچھ نہیں ہو جاتا بیٹی —— کچھ پانے کے لئے محنت اور مسلسل محنت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔"

"وہ تو کر ہی رہا ہے۔"

"اتنی نہیں جتنی بلندی پر وہ اڑنا چاہتا ہے۔"

"بچہ ہے ابھی۔ اس کی یہ آس تو پوری ہو گئی۔ شہر میں رہنے کی اب یکسوئی سے سارے کام کر سکے گا۔"

سفینہ کے کالج کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"اچھا" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"چائے تو پی لیں باجی" عائشہ بولی۔

"میرے کالج کا وقت ہوگیا ہے ــــ ویسے بھی میں ناشتا کر کے ہی آئی ہوں"۔

"پھر بھی بیٹی ــــ! تھوڑی سی پی لو ــــ" بڑے پیار سے اباجی نے کہا۔

"اب آپ لوگ یہیں ہیں نا ــــ انشاءاللہ ملتے رہیں گے۔ پھر پی لوں گی"۔

وہ سلام کر کے باہر چلی گئی۔

اباجی اور عائشہ اس کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوئے۔

نئے کرائے دار اچھے تھے۔ اباجی بڑے مخلص اور شفیق تھے۔ سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ کوئی بات انہیں چھپانا نہیں آتا تھا۔ جو دل میں آتی کہہ دیتے۔

گھر کی مالی حالت بھی چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ عائشہ بھی خوش مزاج ہی تھی۔ پانچ سالہ بیٹی ریحانہ اور تین سالہ بیٹے ریحان کی ماں تھی۔ شوہر سعودی عرب میں تھا۔

تین ماہ کے ویزے پر دو دفعہ وہاں ہو آئی تھی اب اس کا شوہر اسے مستقلاً وہاں بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دونوں بچے سفینہ سے جلد ہی مانوس ہو گئے۔

وہاب اکثر باہر ہی رہتا۔ اس کے متعلق سفینہ وہی کچھ جان سکی جو عائشہ اور اباجی بتلاتے تھے۔ وہ کسی پرائیوٹ فرم میں کلرک تھا اور دو ٹائم بھی لگاتا تھا۔ اور ایم۔ اے کی تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ ترقی کے مدارج اڑ کر طے کرنا چاہتا تھا۔

پہلے اس مکان میں جو فیملی آئی تھی۔ ان کے ساتھ سفینہ کے تکلفانہ مراسم تھے۔ لیکن ان لوگوں سے وہ جلد ہی گھل مل گئی۔ اباجی کی خیریت معلوم کرنے تو وہ تقریباً روز ہی اُدھر جاتی۔

چھٹی کے دن عائشہ اور بچے اس کے ہاں ہوتے۔ کبھی کبھی وہاب بھی آ بیٹھتا۔ وہ اس سے اس کی تعلیمی سرگرمیوں کا حال دلچسپی سے سنتی۔ اسے مفید مشورے دیتی۔ بڑا آدمی بننے کے لئے جس محنت اور استقلال کی ضرورت تھی۔

وہ اسے سمجھاتی۔ صرف دولت ہی سے بڑائی نہیں آجاتی۔ اعلیٰ تعلیم اور اخلاقی اقدار کی عظمت انسان کو بڑا بناتی ہے۔ سفینہ بڑے دل نشین انداز میں وہاب کو سمجھاتی۔

اباجی کچھ عرصہ تو یہاں آکر ٹھیک رہے۔ معمولی سی تکلیف ہوتی۔ ڈاکٹری ایڈ مل جاتی۔ وہ سمجھ جاتے۔

لیکن اب ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی نڈھال رہنے لگی تھی۔ سردیوں میں یوں بھی استھما کے مریض بے حال ہو جاتے ہیں۔ وہاب اور عائشہ ان کی وجہ سے بہت پریشان رہنے رہنے لگے تھے۔

ایک دن سفینہ نے وہاب سے کہا۔ " اباجی کو بہت تکلیف ہے ـــــ انہیں کسی اچھے سے اسپتال میں داخل کروا کے علاج کراؤ نا۔"

وہاب چپ ہو گیا۔

سفینہ نے زیادہ زور دیا تو عائشہ بولی ـــــ " اسپتال کے اخراجات بہت ہیں باجی۔"

" پیسے کافی خرچ ہو گئے ہیں ـــــ " وہاب آہستگی سے بولا ـــــ "ہم تو آپ سے شرمندہ ہیں کہ آج سات تاریخ ہو گئی، آپ کو کرایہ بھی نہیں دے سکے۔"

" کرائے کی فکر نہیں کرو وہاب ـــــ " سفینہ ہمدردی سے بولی ـــــ " اباجی کو کسی اسپتال میں ایڈمٹ کروا دو۔ پیسوں کا مسئلہ ہے تو۔"

وہ چند لمحے چپ رہی۔

پھر ہولے سے بولی۔ " برا نہ مانو تو مجھ سے لے لو۔ جب زمین یا مکان بیچ لو گے تو واپس کر دینا۔"

بہن بھائی کا سارا احسان مندی سے جھک گیا۔ عائشہ متفکرانہ انداز میں بولی۔

" مکان تو شاید بک نہ سکے۔ بکا بھی تو مٹی کے مول بکے گا۔ گاؤں میں کہاں قیمت پڑتی ہے۔ البتہ زمین بک جانی چاہیئے تھی اب تک۔"

" وقت لگے گا۔" وہاب بولا۔

" وقت اباجی کی بیماری کا انتظار تو نہیں کرے گا عائشہ ـــــ "

ہنہ نے کہا ـــــ " آپ لوگ تکلف کیوں کرتے ہیں۔ جتنی ضرورت لے لیں۔"

" نہیں باجی۔" عائشہ بولی۔ " ضرورت کے لئے اثاثہ ہے۔ امی کے پڑے ہیں۔ رکھے تو انہوں نے وہاب کی دلہن کے لئے تھے۔ پر اب ے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

سفینہ چپ ہو گئی۔ وہاب نے دیکھا اس کا چہرہ اب خوش گواری کا ل نہیں تھا۔

وہ آہستگی سے بولی۔ " میں نے تو آپ لوگوں کو اپنا سمجھ کر کہا تھا جانے ات ہے؟ آپ سب مجھے اپنے عزیز رشتے دار لگتے ہیں اباجی تو اتنے ق ہیں کہ باپ کی جگہ محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے تو یوں لگنے لگا تھا کہ ے ابو اباجی کی صورت میں مجھے مل گئے ہیں۔ تنہائی کا احساس مٹنے لگا تھا ن..... خیر....."

اس کی آنکھوں میں جانے کیوں دھند اتر آئی اور وہ مزید کوئی بات کئے ا سے اپنے ہاں آ گئی۔

گھر آ کر اس نے اپنی بھیگی آنکھیں دوپٹے کے آنچل سے پونچھیں لیکن اور بھیگتی چلی گئیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ پرائے لوگوں کو اپنا سمجھ کر کیا وہ ں کر رہی ہے؟

لیکن اسی شام اباجی کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ وہاب گھر پہ ں تھا۔ عائشہ روہانسی سی بھاگی ہوئی سفینہ کے پاس آئی۔

"اباجی کو پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے؟ دم گھٹ رہا ہے۔ سانس ٹھیک سے نہیں لے پا رہے۔"

"وہاب کہاں ہے؟"

"پتا نہیں، گھر پر نہیں ہے۔ ابھی تک دفتر سے آیا ہی نہیں۔" عائشہ پریشان ہو کر بولی۔

"تو ——"

"پلیز باجی! آپ کے پاس گاڑی ہے۔ اباجی کو"

"اسپتال لے جانا ہے۔"

"ہاں ——"

"سفینہ چند لمحے چپ رہی۔

عائشہ نے اس کی منت سماجت کی "پلیز باجی! ہمیں اپنا کہا ہے اپنا سمجھا ہے تو اس وقت ....."

"میں تو اس وقت سے پہلے ہی تیار تھی —— آپ لوگوں نے ہی مجھے غیر جانا۔"

"نہیں باجی —— آپ کے پہلے بھی ہم پر بہت احسان ہیں..... اب....." عائشہ بولی۔

سفینہ، اباجی کو اسپتال لے گئی۔ اس کی کولیگ بانو کا شوہر احمد علی وہاں ڈاکٹر تھا۔ اس کی وجہ سے کافی سہولت ہو گئی۔ اباجی کو ایڈمٹ کر دیا گیا۔

سفینہ نے ہی سارے پیسے خرچ کیے۔

وہ کوئی دو ہفتے ایڈمٹ رہے۔ کافی پیسہ خرچ ہوا۔ سفینہ کو تو شاید بزرگوں کی خدمت کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ماں اور باپ کی خدمت اس نے عادت سمجھ کر کی تھی۔

اباجی بھی بزرگ تھے۔ بات کی طرح لگتے تھے۔ ان کے لیے بھی اس نے غیر ہوتے ہوئے بھی محض انسانیت کے ناتے بہت خدمت کی۔ اباجی تو سفینہ کے گرویدہ ہو گئے۔

اپنوں سے اتنی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ وہ تو غیر تھی چند ماہ سے جان پہچان ہوئی تھی۔ لیکن اس نے مالی اور جسمانی دونوں طرح سے اس بزرگ کی خدمت کی۔

عائشہ اور وہاب تو اس احسان تلے دب سے گئے۔ وہاب، سفینہ کا خاصا مقروض ہو گیا۔

وہ بہت پریشان تھا۔ زمین ابھی تک بک نہ پائی تھی۔ تین ماہ کا کرایہ بھی دینا تھا۔ وہ سفینہ سے آنکھیں نہ ملا سکتا تھا —— اس نے عائشہ سے بات کی۔

"باجی —— بہت بری بات ہے۔ ہمیں ان کا قرض کا کرایہ جلد لوٹا دینا چاہیے۔"

"زمین ..... بک....."

"جہنم میں گئی زمین، جب بکے گی۔ دیکھیں گے۔ فی الحال...."

"کیا کریں؟"

"زیور دے دیں۔"

"امی کی نشانی ہیں۔"

"ہیں تو ـــــ لیکن....."

"ایک بات ہے؟"

"کیا؟"

"زیور بیچنے کے بجائے سفینہ کو دے دیتے ہیں۔ جب زمین بکے واپس لے لیں گے۔"

"جیسے چاہیں کریں ـــــ لیکن اب قرض کا بار میری برداشت سے باہر ہے۔"

عائشہ اسی دن زیور لے کر سفینہ کے پاس گئی۔ وہاب بھی ساتھ تھا۔ دونوں بات کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔

سفینہ نے خود ہی پوچھا تو عائشہ نے زیور کے ڈبے اس کے سامنے رکھ دیئے۔

"یہ کیا ہے؟" سفینہ نے پوچھا۔

"باجی! ہم آپ کے قرض دار ہو گئے ہیں۔ آپ یہ زیور رکھ لیں ـــــ" وہاب رکتے رکتے بولا۔

"جب زمین بکے گی ہم پیسے دے کر واپس لے لیں گے ـــــ" عائشہ بولی۔

سفینہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔"

وہاب نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اتنی عظیم شخصیت اسے شاید پہلی بار دیکھنے کو ملی تھی۔

سفینہ نے زیور لوٹاتے ہوئے کہا۔ "عائشہ، تم نے کہا تھا کہ تمہاری امی نے یہ زیور وہاب کی دلہن کے لئے رکھے تھے۔ اب کیوں امانت میں خیانت کر رہی ہو۔ رہی پیسے کی بات تو اگر میرا پیسہ وقتی طور پر تم لوگوں کے کام آ گیا تو کیا ہوا ـــــ؟ لے ہی لوں گی۔ معاف تھوڑا ہی کروں گی۔"

عائشہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اور وہاب کی نگاہیں سفینہ کے قدموں میں لوٹنے لگیں۔

اس دن سے سفینہ کے ساتھ ان لوگوں کے مراسم تکلف کی ساری حدیں گرا گئے ـــــ اب وہ جیسے ان کے گھر کی فرد تھی۔ بہت قریب آ گئے تھے سب لوگ۔

انہی دنوں عائشہ کے میاں نے اسے بلا بھیجا۔ ویزا آ گیا۔ لیکن ویزے میں کچھ لفظی غلطیاں تھیں جس کی وجہ سے خاصی تشویش ہوئی۔ لیکن سفینہ نے اس موقع پر ان کی مدد کی، دوڑ دھوپ کی۔ دو دفعہ عائشہ کے ساتھ اسلام آباد گئی۔

ایمبیسیوں کے چکر کاٹے۔ واقفیت نکالی۔ اس کی ایک شاگرد کے ڈیڈی ایمبیسی میں تھے۔ ان کی وساطت سے اس نے عائشہ کا کام کروا دیا۔

آباجی تو پہلے ہی اس کے گرویدہ تھے ـــــ اب تو سفینہ انہیں اور بھی عزیز ہو گئی ـــــ وہاب اور عائشہ بھی احسان مندی کے بوجھ تلے اور دب گئے۔

جس دن عائشہ نے جانا تھا ـــــ وہ بہت دلگیر تھی ـــــ بیمار باپ کو چھوڑتے ہوئے دل میں کئی وسوسے آ رہے تھے ـــــ کتنی دفعہ رو چکی تھی۔

"وہاب" اس نے اباجی اور سفینہ کے سامنے ہی بھائی سے کہا۔ "تم خاصے بے پرواہ ہو ـــ اب میں جا رہی ہوں تو آباجی کی ذمے داری تم پر ہے۔ اب شام ڈھلے گھر آنا اور راتوں کو دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا ختم کر دینا۔ اباجی کی دیکھ بھال اچھی طرح کرنا۔"

"یہ کیا کرے گا" آباجی بولے "میری دیکھ بھال تو میری بیٹی کرے گی ـــــ" انہوں نے سفینہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "کیوں سفینہ بیٹی"

سفینہ کی آواز بھرا گئی۔ آباجی بڑے اعتماد سے بولی ـــ "کرو گی نا میری دیکھ بھال"

"جی ـــ کیوں نہیں ـــ" وہ بولی۔

"بڑا خود غرض ہوں میں" اباجی روہانسے ہو کر بولے ـــــ "لیکن کیا کروں بیٹی؟ تم نے میرے دل میں جو جگہ بنا لی ہے ـــــ اسی کی وجہ سے....."

"آباجی ـــ" سفینہ نے بوجھل آواز میں کہا "خود غرض میں بھی ہوں"

عائشہ اور وہاب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں" وہ گلوگیر آواز میں بولی "میں جو آپ لوگوں کا ساتھ دیتی ہوں ں میں میری خود غرضی بھی شامل ہے۔ ابو کے بعد امی کا ساتھ تھا۔ وہ ھوڑ کر چلی گئیں۔ تو میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ اباجی ـــ تنہائیوں کے کرب ناک ناٹے میرے اندر گونجتے تھے۔ آپ لوگوں کے آنے سے ـــ آپ لوگوں ں گھل مل کر مجھے تنہائیوں کے زہر ناک سناٹوں سے چھٹکارا ملتا ہے۔" ہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے مسکرا کر اباجی کو دیکھتے ہوئے بولی ـــــ "ہوں خود غرض"

اباجی نے کمال شفقت سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر کر ں کی پیشانی چوم لی۔ "خدا تمہیں سلامت رکھے میری بچی"

عائشہ مطمئن ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد اباجی کی خبر گیری کی ذمے داری سفینہ نے ں فرمانبردار بیٹی کی طرح اپنے اوپر لے لی ـــــ وہاب بھی اب زیادہ قت اباجی کی خاطر گھر پر گزارنے لگا ـــ دونوں مل کر اباجی کی خدمت نے لگے۔

فرصت کے اوقات میں وہاب اور سفینہ گپ شپ لگاتے تاش بازی جیتی۔ بیڈمنٹن کھیلتے۔ شاپنگ کے لئے بھی چلے جاتے دونوں ں خاصی دوستی ہو گئی۔

اس دوستی میں دونوں ڈوبتے چلے گئے۔

سفینہ چونکی تو اس دن ـــــ جس دن وہاب نے اسے باجی کی بجائے مس سفینہ کہا۔

وہ وہاب کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر پوچھا ـــــ "یہ انداز تخاطب کیوں بدل دیا؟"

"بس" وہاب بولا۔ "باجی کہنا اچھا نہیں لگتا۔ احساس ہونے لگتا ہے آپ مجھ سے بہت بڑی ہیں۔"

"بڑی تو ہوں، کم از کم تیرہ چودہ سال بڑی ہوں۔ باجی کے بجائے آنٹی بھی کہو تو حق بجانب۔"

وہاب نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ گھبرا سی گئی ـــ کیا ہو گیا تھا اُسے۔؟

وہ کئی دن سوچتی رہی۔ اسے ان نظروں کا مفہوم سمجھ آتے ہوئے بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔

وہاب ایم اے کا امتحان دے رہا تھا۔ سفینہ سے کافی مدد لیتا تھا پرچہ کر کے سیدھا اسی کے پاس آتا اس نے دو پیپر کافی اچھے کر لئے تھے۔

سفینہ نے اسے شاباش دی۔

"میڈم یہ سب آپ کی مہربانی ہے۔"

"باقی بھی کرو تو بات ہے نا۔ اسی طرح کے۔"

"فکر نہ کرو سفینہ ـــ اس سے بھی اچھے کروں گا۔ صرف آپ کے

اشیر باد کی ضرورت ہے۔"

سفینہ اندر ہی اندر ششدر سی ہو گئی۔ آج وہاب نے مس کا تکلف بھی چھوڑ دیا تھا۔ اسے صرف سفینہ کہہ کر پکارا تھا۔ کیوں؟

اس کیوں کا جواب مبہم نہیں تھا لیکن وہ اس سے مطمئن ہونا نہیں چاہتی تھی۔ حیرانگی اس کے ذہن کا احاطہ کئے تھی۔

امتحانوں کے بعد وہ فارغ تھا۔ اب وہ کوئی اچھی جاب تلاش کرنے کے چکروں میں تھا۔

سفینہ سے اسی سلسلے میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ سفینہ کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھا تھا۔

"جاب کی جگہ تم بزنس کیوں نہیں کرتے؟" سفینہ نے کہا۔

وہاب ہنس پڑا۔

"کیوں؟"

"پیسے کہاں سے لاؤں گا۔"

"زمین اور مکان بک رہا ہے۔"

"اس میں تو سفینہ، شاید تمہارا قرضہ بھی بے باک نہ کر سکوں۔" وہاب نے کہا۔

سفینہ چپ ہو گئی۔

وہاب کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ آج آپ کی جگہ تم کہہ رہا تھا اسے روک دینا ٹوک دینا ہی مناسب تھا۔ سفینہ نے سوچا۔

پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہاب"

"ہوں"

"ایک بات پوچھوں؟"

"سو بات پوچھیں جناب"

سفینہ نے چہرے پر قدرے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا "وہاب میں دیکھ رہی ہوں۔ تم ....."

"کیا؟"

"تمہارا انداز تخاطب بدلتا جا رہا ہے"

"تو کیا ہوا؟"

"کچھ آداب بھی ہوتے ہیں جنہیں ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے" سفینہ نے کہا۔

"یعنی"

"تم مجھے باجی کہتے تھے۔ پھر مس سفینہ کہنے لگے، اس کے بعد سفینہ پر اتر آئے۔ اور اب انتہا یہ کہ 'تم' کہہ کر پکارنے لگے ہو"

وہاب چند لمحے چپ رہا۔ اس کے لب تبسم اور آنکھیں شوخی لئے تھیں سفینہ گھبرا سی گئی۔

وہ خود ہی بولا "اس میں کوئی ہرج ہے کیا؟"

"ہرج نہ سہی۔ اچھا بھی نہیں لگتا"

"آپ، کہوں تو اچھا لگتا ہے"

"بہر حال بڑوں کو اسی طرح پکارا جاتا ہے"

"اگر میں آپ کو بڑا سمجھوں ہی نہیں تو؟"

"کیا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"اتنی سمجھ دار، مجھے وضاحت کرنے کی ضرورت پڑے گی کیا؟" وہاب نے کہا۔

"وہاب" سفینہ نے غصے سے ڈانٹا۔

"سفینہ" وہ ہنس پڑا۔

سفینہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اور سنجیدہ ہو گئی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر وہاب آہستگی سے بولا "جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے ذہنی طور پر قبول کرنے کی کوشش کرو سفینہ"

"تم۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو آخر"

وہاب ہنس پڑا۔

پھر بولا "اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ تم بزنس کی بات کر رہی تھیں۔ کیا پلان ہے؟ اور وہ جو اس دن اپنے شوروم کا بتایا تھا تمہارے کے وقت شوروم اور سروس اسٹیشن"

"میں اس وقت کوئی بات ڈسکس نہیں کر سکتی"

"کیوں؟ آپ سیٹ ہو گئی ہیں"

"ہاں ——"

"چلئے چھٹی کرتے ہیں۔ پھر کسی وقت بات کریں گے۔ خدا حافظ۔"

وہ اٹھا — اسے دیکھا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

سفینہ وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

وہاب کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی شوخی جو کچھ کہتی تھی۔ کیا وہ اسے قبول کرنے کی پوزیشن میں تھی؟

"ہاں" اس کا دل پکارا۔

"نہیں" اس کا دماغ چیخا۔

وہ خیالوں کی چیخ و پکار میں کھو گئی۔

وہ شام بڑی سہانی تھی — ہوائیں بوجھل بوجھل تھیں۔ مطلع ابر آلود تھا۔ دوپہر چھینٹے بھی پڑے تھے جن سے خنکی بڑھ گئی تھی۔ اباجی کی طبیعت نڈھال تھی۔

سفینہ ان کے قریب بیٹھی انہیں کسی میگزین سے کوئی آرٹیکل پڑھ کر سنا رہی تھی جسے شہاب بے توجہی سے سن رہے تھے ان کے چہرے پر متضاد خیالات کی لہریں لہرا رہی تھیں — جیسے کچھ کہنا چاہ رہے ہوں — نہ کہنے کا سوچ رہے ہوں — کہنے اور نہ کہنے میں توازن پیدا کر رہے ہوں۔"

"کیا بات ہے اباجی؟ طبیعت زیادہ خراب تو نہیں۔" سفینہ میگزین ہٹاتے ہوئے بولی۔

"ہے تو۔"

"ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"نہیں — وہ کیا کرے گا۔ دوائیاں تو کھا رہا ہوں۔ لگتا ہے۔ میعاد ختم ہو رہی ہے۔"

"کس کی؟"

"زندگی کی۔"

"بیٹی، ایک نہ ایک دن تو ختم ہونا ہی ہے۔ مہلت زندگانی ہے۔ مجھے اس کی فکر نہیں، ہر وقت تیار ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ سوچا کریں۔"

"بہت اچھا۔ لیکن کام کی باتیں تو کروں نا۔"

"ضرور کریں۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ سچ سچ۔"

"کیا اباجی"

"تم نے شادی کیوں نہیں کی۔"

سفینہ چپ ہو گئی۔

"ذاتی سا سوال ہے لیکن اپنی بچی سمجھ کر پوچھا ہے۔"

سفینہ کی آواز گھٹ گئی۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اباجی نے پھر اصرار کیا تو اس نے ہولے ہولے اپنے گھریلو حالات اباجی کو بتا دیئے۔ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ بیٹھی رہ گئی۔ کبھی باپ کی بیماری بہانہ بنی کبھی امی کی

کی تنہائی۔ ورنہ تو ابو کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی اور نہ ہی وہ اتنی بدصورت تھی کہ شادی نہ ہو سکتی۔

"اب تو یہ مسائل نہیں ہیں سفینہ ـــــ" اباجی نے ساری باتیں غور سے سن کر کہا۔

"اب" وہ ہنس پڑی۔

پھر بولی "اباجی اب عمر گزر گئی۔ کالج میں کچھ وقت گزر جاتا ہے کچھ آپ کی صحبت میں۔ زندگی مزے سے گزر رہی ہے۔"

"لیکن بے سہارا ہے بیٹی۔ عورت کے لئے مرد کا سہارا اور تحفظ ضروری ہوتا ہے۔"

"آپ کا ہے نا" وہ ہنسی۔

"سچ کہتی ہو"

"بالکل۔"

"میں چاہتا ہوں یہ سہارا ہمیشہ کے لئے تمہیں میسر ہو جائے" اباجی نے کہا۔

"جی ـــــ"

"اباجی اپنی دھن میں بولے ـــــ وہاب کیسا ہے تمہارے خیال میں۔"

سفینہ کی حیرت تو رفع ہو گئی ـــــ لیکن ـــــ اس سوال سے وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ "آپ... آپ جانتے ہیں۔ وہ کیسا ہے۔"

اباجی مسکرا کر فخر سے بولے۔ "مجھے تو بونگا سا ہی لگتا ہے۔ ویسے ایم اے کر لیا ہے اس نے۔"

"بہت ہوشیار ہے" وہ کہہ گئی۔ "شوروم اور سروس اسٹیشن میرا مطلب ہے بڑی محنت سے کام کرنا شروع کر دیا ہے اس نے۔"

اباجی چند لمحے انہیں تکتے رہے۔

پھر مسکرائے۔ سنجیدہ ہوئے۔ سر جھکایا ـــ پھر اٹھایا ـــ آخر کہہ ہی گئے "سفینہ اگر میں تمہیں بیٹی کے بجائے بہو بنانا چاہوں تو... تمہیں...."

"ابا.... جی.... آپ..... کیا کہہ رہے ہیں۔؟" وہ مارے حیرت کے ہکلا ہکلا گئی۔

"جو کہہ رہا ہوں خلوص اور صدق سے کہہ رہا ہوں۔ میری سب سے بڑی اور دلی خواہش بھی ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ بڑی سوچ بچار کے بعد میں یہ فیصلہ کیا ہے بیٹی۔ تم قبول کرو یا نہ کرو۔ یہ تمہاری مرضی ہے لیکن میں نے دل کی بات کہہ دی ہے۔ تم سوچ لو اچھی طرح۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

ابا بولے گئے ـــــ بہت کچھ کہا ـــــ سفینہ کی تعریفیں کیں۔ پھر بولے "میں نے ایک بار پہلے بھی کہا تھا کہ بیٹی شاید میں خود غرض ہوں۔ یہاں بھی میری خود غرضی ہے۔ تم نے جس طرح میری خدمت کی ہے۔ جس طرح میرے گھر بار کو سنبھالا دیا ہے۔ وہاب کو جہاں پہنچایا ہے ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے اس گھر کی ضرورت اب تم ہو۔ کوئی اور لڑکی اس مقام پر نہیں

آسکتی۔ میں نے یہی سوچ کر فیصلہ کیا ہے۔"

"لیکن اباجی ....." وہ گھگیائی۔

"تمہیں وہاب پسند نہیں کیا ——؟" اباجی بے تابی سے کروٹ بدل کر بولے۔

"وہ .... وہ مجھ سے بہت .... چھوٹا ہے .... میری اور اس کی عمروں میں ....!"

اباجی نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا —— بڑی عمر کے مرد کمسن لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے کیا ——؟ پھر بڑی عمر کی لڑکیاں چھوٹی عمر کے لڑکوں سے شادی کر لیں تو کیا ہرج ہے۔"

وہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

"سوچ لو بیٹی —— میں تو خود غرض آدمی ہوں، اپنی غرض کی نظر سے دیکھا ہے اس معاملے کو۔ تمہیں اعتراض ہو تو .... مجبور نہیں کروں گا —— ویسے وہاب کی بھی خواہش ہے تم اس کی ضرورت بن چکی ہو۔ تمہارے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔"

وہ بیٹھ نہ سکی چائے کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے دل و دماغ میں بے چینی اور ہلچل تو ایک عرصے سے مچی تھی۔ آج اباجی نے سارا معاملہ ہی کھول کے رکھ دیا۔

وہ کیا کرے؟

کوئی چھوٹا بڑا تھا نہیں جو سمجھاتا ——

پریشان سے پریشان تر ہوتی رہی۔

کئی دن اباجی نے اپنے سوال کا جواب نہیں پوچھا۔ وہ ان کے پاس باقاعدگی سے آتی رہی۔ بلکہ اب تو اس نے فتح کو اباجی کی ہی خبر گیری کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ وہ کالج جاتی، وہاب نوکری پر، فتح ہی اس دوران اباجی کی دیکھ بھال کرتا۔

کافی دن وہاب اس کے سامنے نہیں آیا تھا —— وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی رہی —— وہاب سے سامنا کرنا ہی نہیں چاہتی تھی وہ۔

کئی دن رات وہ سوچوں میں گم رہی —— اس نے اپنے آپ کو پوری سنجیدگی اور غیر جانب داری سے ٹٹولا —— دل کی دھڑکنوں کو جانچا، جذبوں کی پڑتال کی —— اپنی اُمنگوں —— خواہشوں —— اور ارمانوں کا تجزیہ کیا۔

بلاشبہ گھر بسانے کی زبردست خواہش تھی اُسے۔

وہاب بھی ناپسند نہیں تھا۔

لیکن ——

عمروں کا فرق! اس خلیج کو کیسے پاٹ لیتی۔

لوگوں کا سامنا کیسے کر پاتی —— کیا کیا باتیں نہ بنتیں —— کیا کچھ نہ کہا جاتا؟

وہ سوچوں کے بحرِ ذخار میں ہچکولے کھاتی رہی۔ کبھی جی چاہتا کہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا لے۔ کسی رنڈوے بال بچوں والے یا طلاقی آدمی سے بناہ کرنا کتنا مشکل تھا۔ اس عمر میں ایسے ہی رشتے ملتے ہیں۔ وہاب کتنی جاذب شخصیت کا مالک تھا ــــ جواں وجیہہ ــــ پُرعزم پُرہمت ــــ

لیکن ــــ

پھر ــــ

وہ ہچکچانے لگتی۔ ذہن اسے شوہر کے روپ میں قبول کرنے کو کسی طور تیار ہی نہ ہوتا۔ لوگوں کی بھانت بھانت کی بولیوں کا تصور کر کے وہ گھبرا جاتی

وہاب ان دنوں بزنس کے سلسلے میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ سفینہ نے شرکت منظور کر لی تھی۔ شوروم میں اب چہل پہل تھی۔ سروس اسٹیشن کام کر رہا تھا۔

ابو کے وقت میں ایک معروف گاڑی کی ایجنسی تھی ان کے پاس ــ اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے وہاب نے جدوجہد شروع کی تھی ــ وہ جس محنت اور لگن سے کام کر رہا تھا ــــ ترقی کی راہیں از خود کھلنے کی اُمید تھی۔

سفینہ اس سے کئی دن نہ مل سکی ــ اس کی مصروفیت ہی آڑے آ رہی تھی شاید۔

لیکن ــــ

رات وہ کافی دیر لاؤنج میں بیٹھی ہوئی ٹی وی دیکھتی رہی۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے کو تھی کہ وہاب آ گیا۔ اسے دیکھ کر سفینہ کے کانوں سے سیٹی نکلنے لگی۔ لیکن کسی قسم کی کمزوری یا شرم کا اظہار کئے بغیر وہ بولی "آؤ وہاب! کہاں تھے اتنے دنوں سے۔"

"یہ جنجال جو ڈال دیئے ہیں میرے گلے میں۔" وہ ہاتھ میں پکڑی فائل صوفے پر پھینکتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"شروع شروع میں مشکلات تو پیش آئیں گی۔"

وہ شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ تو ہر کام میں آتی ہیں۔"

"بہت شوخ ہوتے جا رہے ہو۔ بدتمیزی کی حد تک۔" وہ مسکرائی تو نہیں لیکن آواز میں مسکراہٹ گھلی تھی۔

"میں مصائب سے گھبرانے والے نہیں ہوں سفینہ۔ اگر ایک بات کا ارادہ کر لوں تو وہ کر کے رہتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ جلد ہی کاروبار چمکا لو گے۔"

"سب کچھ چمکا لوں گا۔"

"مطلب"

"تم سمجھتی ہو۔"

"پھر ــ تم ــ کہا۔"

"یہ تو ہمیشہ ہی کہوں گا۔"

"وہاب"

"ہوں"

"بات کرنے سے پہلے سنجیدگی سے سوچا کرو۔"

"مشورے کا شکریہ۔ سنجیدگی ہی سے سوچا ہے۔ ہاں تم کہو سنجیدگی سے تم نے بھی سوچا ہے یا نہیں۔"

وہاب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

وہ چپ رہی۔

وہاب کچھ سمجھ سا گیا۔

پھر ہولے سے بولا — "اباجی نے تم سے کچھ کہا تھا۔ شاید تمہیں ان کی بات اچھی نہیں لگی۔"

وہ جلدی سے بولی "اچھی بات اور ہے معقول اور — وہاب تم سمجھتے کیوں نہیں۔ ناممکن کو ممکن کیسے بنا لو گے۔"

"ناممکن کوئی بات نہیں۔" وہ دو ٹوک فیصلہ کرتے ہوئے مستحکم آواز میں بولا "تم عمروں کے فرق ہی کی بات کرو گی۔"

"کیا یہ کوئی بات نہیں"

"ہے — لیکن جب ہمیں اعتراض نہیں تو پھر — سفینہ میں بچہ نہیں ہوں جو بات کہہ رہا ہوں اس کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتا ہوں۔ یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔ لیکن اس میں ہم سب کی بہتری ہے۔ میں تمہارے

احسانوں کے بوجھ تلے اتنا دب چکا ہوں کہ سانس بھی نہیں لے سکتا اباجی تمہارے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتے ایسی صورت میں تمہارا انکار۔ جانتی ہو اس کا اثر کیا ہوگا۔"؟

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

وہاب باتیں کئے گیا۔ اس وقت وہ واقعی بہت سنجیدہ تھا بڑا مدبر دکھائی دے رہا تھا اور اپنی عمر سے کئی سال بڑا پختہ مزاج اور جہاندیدہ آدمی لگ رہا تھا۔

سنجیدہ سی گفتگو کرنے کے بعد وہ ایک دم خوش گوار موڈ میں آگیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم ایم اے ہو تو میں نے بھی ایم۔ اے کر لیا ہے تعلیم برابر — ٹھیک۔"

سفینہ نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا — وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا اسے تسلیم کرنا پڑا۔

وہاب پھر بولا۔ "قد کاٹھ میں میں تم سے کم از کم ایک بالشت اونچا اور چوڑا ہوں۔ تم چھوٹی لگتی ہو — میں بڑا کیوں؟ اور پھر بزنس۔ ہم دونوں شریک۔ حساب برابر — اب صرف عمر کے تفاوت کے لئے مجھ ایسا بر ٹھکرا رہی ہو۔"

"شریر کہیں کے" سفینہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

وہاب شوخی سے بولا — "پتھر کچھ تو موم ہوا — خدایا تیرا شکر ہے۔"

سفینہ ہنس پڑی۔

وہاب کافی دیر بیٹھا رہا۔

سفینہ نے اسے جانے کے لئے نہیں کہا۔

لیکن ——

دوسرے دن اس نے اپنی عزیز دوست بانو سے مشورہ کرنے کا سوچا کالج سے واپس پر وہ اس کے ہاں گئی۔ بانو سے وہ پہلے بھی بات کر چکی تھی۔ بانو بھی اس کی طرح تذبذب میں تھی۔ کبھی کہتی بہت اچھا ہے کر لو شادی کبھی کہتی موزوں نہیں لگتا۔

دونوں نے آج پھر اس معاملے پر پوری سنجیدگی سے غور کیا بلکہ آج احمد بھی ان کی محفل میں شریک ہوئے۔ پہلے تو مذاق کرتے رہے پھر یہی مشورہ دیا کہ صرف عمر کا مسئلہ بنا کر رشتہ ٹھکرانا عقل مندی نہیں۔

"تجربہ ہی ہے کر دیکھو" بانو بولی۔

"تجربہ ناکام بھی ہو سکتا ہے" سفینہ بولی۔

"ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار رکھنا بس۔ ویسے کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ تم ایسی گئی گزری بھی نہیں۔ عمر سے کم ہی لگتی ہو ——" بانو نے کہا۔

"چلو ہٹو —— سفینہ بولی" میں ایک میچیور عورت ہوں"

"میچیور ضرور ہو، لیکن عورت نہیں بڑی عمر کی لڑکی ہو ——" بانو نے کہا —— "شادی کر ہی ڈالو —— کیا عجب کتنی کامیاب زندگی گزرے"

"ڈر لگتا ہے"

"چھوٹی عمر کے شوہر کو قابو میں رکھنا آسان ہوگا۔ ڈر کر دبک کر رہے گا ویسے بھی تم اس پر ان گنت احسانوں کا بوجھ لاد چکی ہو۔ غلام بن کر رہے گا" بانو بولی۔

بانو نے سنجیدگی سے بھی یہی مشورہ دیا۔ سفینہ اس پر بہت اعتماد کرتی تھی۔ اس نے بھی فیصلہ کر لیا گھر آباد کرنے کا موقع مل رہا ہے اسے کھونا نہیں چاہیئے تھا۔

وہ رات بھر سوچتی رہی۔

صبح اباجی کو دیکھنے گئی تو انہوں نے اپنے سوال کا جواب مانگا۔ سفینہ نے سر جھکا لیا۔ اباجی بولے "کیا سمجھوں بیٹی کیا میری بات تم نے مان لی"

اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اباجی اتنے خوش ہوئے کہ سینے میں سانس ہی نہ سما سکی دم اکھڑ سا گیا۔ سفینہ نے انہیں پلنگ پر لٹا دیا انہیں پانی کا گھونٹ پلایا۔ سینے پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرتی رہی۔

اباجی نے اسے بازوؤں میں بھر کر پیار کر لیا —— "اب، میں اطمینان سے مروں گا بیٹی —— مجھے . . . وہاب کی —— بہت فکر رہتی تھی"

سفینہ کی آنکھیں خلوص اور محبت پا کر نم ہو گئیں۔

اگلے ہفتے خاموشی سے نکاح ہوگیا۔

وہاب نے میدان جیت لیا۔ سفینہ دلہن بن کر اس کے پہلو میں آگئی وہ بہت خوش تھا۔

سفینہ بھی خوش تھی۔

لیکن چند دن بہت مضطرب رہی۔

لوگوں کی باتیں سنتی تو پریشان ہوجاتی۔ ایسے میں وہاب اسے بازوؤں میں سمیٹ لیتا۔ اس کی ساری پریشانیاں ہنسی مذاق کر کے دور کر دیتا۔

"جب ہم ہیں تو کیا غم ہے میری سفینہ جانی" وہ اتنے دلار سے کہتا کہ سفینہ واقعی سرشار ہوجاتی۔

کوٹھی کا پورشن کرائے کے لئے الگ کیا گیا تھا۔ اب پھر سے کوٹھی میں شامل ہوگیا۔ درمیانی دروازے کھول دیئے گئے۔ گھر میں چہل پہل اور رونق ہوگئی۔

ابا جی بھی جیسے اپنی بیماری بھول گئے۔ دنوں میں ان کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ سفینہ اور تن دہی سے ان کی خدمت کرنے لگی۔ کالج سے اس نے لمبی چھٹی لے لی تھی۔

وہاب بھی شادی کی خوشیاں بھرپور انداز میں منانے کے بعد اب کام کاج میں مصروف ہوگیا۔

قسمت کا دھنی تھا۔ کام خوب چل نکلا۔ اس نے پرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت بھی شروع کر دی اور ایجنسی لینے کی کوشش بھی برابر کرتا

رہا۔ سروس اسٹیشن خوب چلنے لگا ـــــ پرانا اڈا تھا۔ کام کافی سے زیادہ ملنے لگا۔

اس کامیابی پر سفینہ ہمیشہ وہاب کی تعریف کی۔ "تم نے دن رات ایک کر کے کام کو چلایا ہے۔ اتنا کام تو ابو کے وقت پر بھی نہیں ہوتا تھا۔"

"سب تمہاری مہربانیاں ہیں سفینہ جانی" وہاب سرشار سے لہجے میں کہتا ـــ "میں جو کچھ ہوں تمہاری وجہ سے ہوں۔"

"اسی لئے میرے ہو" سفینہ ہنس کر بڑے مان سے کہتی۔

"رواں رواں تمہارا ہے جانم ـــــ" وہ اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں اسے کس لیتا۔

سفینہ خوشی سے غبارے کی طرح پھولنے لگتی۔

کبھی کبھی اسے یہ سب کچھ خواب لگتا۔ اس عمر میں شادی وہ بھی اپنے سے چھوٹی عمر کے بھرپور جوان آدمی سے۔ پھر اس کی بے پناہ محبت۔ زندگی اتنی حسین و رنگین ہوگی۔ اس نے تو شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

سفینہ اپنی بھرپور اور توانا خوشیوں کے چہرے دیکھ کر بعض اوقات ڈر بھی جاتی ـــــ کہیں یہ خواب ٹوٹ گئے اور خوشیوں کے چہرے دھندلا گئے تو وہ کیا کرے گی۔

کبھی کبھی ان وسوسوں کا اظہار وہ وہاب سے بھی کر دیتی۔ وہاب

میرے حسین خواب کبھی توڑنا نہیں، میں جی نہ پاؤں گی۔"

"سفینہ مجھ پر اعتماد نہیں ہے کیا۔؟"

"پتہ نہیں کیوں، کبھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے۔"

"عمروں کا فرق تمہارے ذہن سے نکلا نہیں۔"

"شاید یہی بات ہو۔"

"نکال دو ذہن سے غلط سلط باتیں۔ میں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں اور نباہ بھی رہا ہوں۔"

"ہمیشہ نباہتے رہو گے نا وہاب۔"

"ہمیشہ سفینہ جانی! ہمیشہ۔" وہ اسے بانہوں میں جکڑ کر پیار کر لیتا۔ وہ مطمئن ہو جاتی۔

اپنے ان وسوسوں کا اظہار اس نے کئی بار بانو سے بھی کیا تھا۔ بانو اسے ہمیشہ ڈانٹ دیتی۔

"تم سچائی کو پرکھ نہیں سکتیں۔ وہ تم سے کتنا پیار کرتا ہے۔ کتنا خیال رکھتا ہے تمہارا ــــ وہ احسانمندی کے بوجھ تلے سے نکل نہیں پایا اصل ہے۔ تم واہمے دل سے نکال دو۔"

شادی کے تیسرے ہی ماہ سفینہ کو اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا احساس ہوا تو وہ خوشی سے باؤلی ہو گئی۔ اس کے اندر تخلیق کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔

اس دن وہ اپنی بے تاب خوشیوں کو مخفی نہ رکھ سکی۔ وہاب کے

گلے میں بانہیں ڈال کر بڑے پیار سے بولی۔

"وہاب۔"

"ہاں۔"

"وہاب! میں۔"

"کیا بات ہے۔؟"

"تم... تم..."

"چھوٹی بچیوں کی طرح شرما رہی ہو۔ کچھ بتاؤ تو۔؟"

"سمجھ جاؤ نا۔"

"کیا۔؟" وہاب نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اشارتاً پوچھا۔

سفینہ نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس کی چوڑی چھاتی سے سر لگاتے ہوئے کہا "تم باپ بننے والے ہو وہاب۔"

"ہرا ــــ" اس نے سفینہ کو خوشی کے عالم میں دو چار چکر دے دیئے۔ سفینہ چیخنے لگی۔

تو جلدی سے شانو کچن سے باہر نکل آئی۔

"صاحب ــــ ایسے نہ کریں ــــ بی بی امید سے ہیں ــــ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

وہاب نے جلدی سے سفینہ کو سانتھ لگا کر سہارا دے لیا۔

پھر اسے سہارا دیتے ہوئے بیڈ روم میں لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا۔

اس پر جھکتے ہوئے ہنس کر بولا "مجھے کم از کم چھ بچے چاہئیں"

"ہٹو" سفینہ نے شرمیلی ادا سے مسکراتے ہوئے کہا "شکر کرو ایک بھی ہو جائے تو"

"اوں ہوں، چھ پورے کرنا ہوں گے"

"پرے ہٹو"

وہاب بڑی دیر سے اسے چھیڑتا رہا۔

سفینہ طبیعت خراب رہنے کے باوجود بہت خوش رہتی تھی۔ بچہ میاں بیوی کے درمیان رابطے کی مضبوط کڑی ہوتا ہے اب اس کے وسوسے بھی کم ہونے لگے تھے۔

وہاب بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ بھی ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا تھا ـــــ گول مٹول پیارے سے بچے کا تصور ہی بڑا جانفزا تھا۔

اباجی نے بھی جب یہ خبر سنی تو بہت خوش ہوئے۔ گو ان کی طبیعت اب بہت خراب رہتی تھی۔ پھر بھی سفینہ اور وہاب کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتے۔ ان کی یہی دعا ہوتی کہ میں ان دونوں کی ازدواجی زندگی کا ثمر دیکھنے تک ضرور زندہ رہوں۔

لیکن

ایسا نہیں ہو سکا۔ اباجی نے اچانک ہی رخت سفر باندھ لیا اسیتھما کے پرانے مریض تھے۔ کب تک اس موذی مرض کے سامنے ڈٹے رہتے

اس دفعہ حملہ شدید ہوا۔

وہاب اور سفینہ نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ سفینہ کو چھٹا مہینہ جا رہا تھا لیکن اس نے اباجی کی خدمت میں دن رات ایک کر دیئے۔ اسپتال میں بھی وہی ان کے ساتھ رہی۔

لیکن

وہ چل بسے۔ وہاب اور سفینہ کے بچے کو دیکھنے کا ارمان دل ہی میں لے کر چلے گئے۔

وہاب اور سفینہ کی بُری حالت تھی۔ عائشہ بھی آ گئی وہ تو پچھاڑیں کھاتی رہی۔ سفینہ اسے بھی سنبھال رہی تھی۔ بڑی دوڑ دھوپ کی اس نے آرام کئے بغیر کام کرتی رہی آئے گئے کو سنبھالا۔ ہمت سے بڑھ کر بوجھ اٹھایا۔ ان سب کا اثر سفینہ پر پڑا۔

اباجی کے قُل کے دن اسے تکلیف شروع ہو گئی۔ بھاگم بھاگ اسے اسپتال پہنچایا گیا جہاں طبی امداد سے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ تین دن اور تین راتیں سفینہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ مجبور ہو کر ڈاکٹروں کو آپریشن کر کے بچہ ضائع کرنا پڑا۔ ایسا نہ کرتے تو سفینہ کی موت یقینی تھی۔

سفینہ دو ہفتے اسپتال میں رہی۔ اس کا دکھ اتنا گمبھیر تھا کہ ان دو ہفتوں میں ڈھانچہ بن کر رہ گئی۔ لیکن سب سے بڑی دکھ کی بات یہ تھی۔ ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ یہ بات گو سفینہ سے چھپائی گئی۔ لیکن وہاب اس بات سے بہت مضطرب اور پریشان ہوا۔

اپنے ان چھوئے اور ان دیکھے بچے کا دکھ سفینہ کے دل کا گھاؤ بن گیا — وہ ہر وقت روتی رہتی۔ وہاب سے اس کی باتیں کرتی رہتی۔ عائشہ سے اس کا تذکرہ کرتی۔

وہاب اسے تسلیاں دیتا۔ بہلاوے اور دلاسے دیتا۔ اس نے سفینہ پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ وہ ماں بننے کے جوہر سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی ہے۔ اس نے تو عائشہ کو بھی منع کر دیا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

سفینہ سنبھل گئی۔

اب اس کی صحت ٹھیک ہو رہی تھی۔ اور اس کی ماں بننے کی فطری خواہش پھر عود کر رہی تھی۔

ہر ماہ اسے انتظار ہوتا۔

لیکن

ہر ماہ مایوسی اس کا مقدر بنتی۔

ایک دن اس نے وہاب سے کہہ ہی دیا "وہاب! مجھے کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس لے چلو۔"

"کس لئے؟"

وہ چند لمحے چپ رہی۔

پھر بولی۔ "اتنے مہینے ہو گئے۔ اب تو کچھ ..."

"سفینہ!" وہاب نے افسردگی سے اسے دیکھا۔ لیکن جو ٹریجڈی ہو چکی تھی

اسے بتانا نہ پایا۔

"میں بانو کے ساتھ چلی جاؤں مسز رحمانی کے پاس۔"

وہ چپ رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "چلی جاؤ۔"

اچھا تھا جو بات وہاب اسے نہیں بتا سکا وہ مسز رحمانی بتا دے گی۔ اس کے کیس میں مسز رحمانی بھی تو موجود تھی۔ اسی نے تو رپورٹ دی تھی۔ وہاب نے یہی سوچ کر اسے مسز رحمانی کے پاس جانے کا کہہ دیا۔

سفینہ، بانو کو ساتھ لے کر مسز رحمانی کے پاس گئی۔

مسز رحمانی نے اس کی تسلی کے لئے پھر چیک اپ کیا۔ پھر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اسے ساری حقیقت بتا دی۔ سفینہ ایک لمحے کو تو سمجھ ہی نہ پائی۔

بانو بھی چپ کی چپ رہ گئی۔

مسز رحمانی نے آہستگی سے کہا۔ "تمہیں تمہارے میاں نے بتایا نہیں تھا یہ بات تو تب ہی انہیں بتا دی گئی تھی۔"

سفینہ پر غم کا کوہ گراں ٹوٹ پڑا۔ بانو اسے سہارا دے کر باہر لے آئی۔ وہ خود بھی دکھی ہو رہی تھی۔

گھر آ کر سفینہ، وہاب سے لپٹ کر بے اختیار ہو ہو کر رو دی۔

"وہاب! اب کیا ہو گا وہاب! تمہیں تو چھ بچے چاہئیں نا۔ ہمارے درمیان جو رابطے کی کڑی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی ہے۔ وہاب میں بنجر اور ویران ہو گئی ہوں اب میں تمہیں ایک بچہ بھی نہیں دے سکتی۔"

سفینہ پھوٹ پھوٹ کر ٹوٹ ٹوٹ کر روتی رہی۔

وہاب خاموشی سے اسے تھامے رہا۔

اسے تسلیاں دینے کی کوشش کی " سفینہ خدا کو یہی منظور تھا کوئی بات نہیں، بچوں کے بغیر بھی ہم رہ لیں گے۔"

یہ کہنا آسان تھا۔

لیکن نباہنا مشکل۔

چند ماہ روکھے پھیکے گزرے۔ گھر میں سب کے ہوتے ہوئے بھی سناٹوں کی گونج سنائی دینے لگی۔ کسی بچے کی قلقاریاں، شوخیاں اور رونا دھونا ہی اس سناٹے کو توڑ سکتا تھا۔

سفینہ جانتی تھی اور یہ جاننا ہی باعث اذیت تھا۔ غم نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ زندگی نے کچھ عرصے پہلے اسے جو کچھ دیا تھا اسے واپس لے لیا تھا اس غم نے اسے بے حال کر کے کچھ زیادہ ہی عمر رسیدہ کر دیا تھا۔ وہاب جوانی کی امنگوں سے سرشار تھا۔

جوشیلے جذبات سے بھرپور تھا بچے کا غم اسے بھی تھا لیکن وقت نے غم مندمل کر دیا تھا۔ اب وہ بھرپور انداز میں جینا چاہتا تھا۔ سفینہ کوشش کرتی بھی تو اس کا ساتھ نہ دے سکتی تھی اس کے اندر تو سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا تھا۔ زندگی مر گئی تھی۔ پھر کیسے ساتھ دیتی۔

وہاب اب اس سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا۔

سفینہ کی سوگواری اسے گوارہ نہ تھی۔ وہ زندہ تھا زندہ رہنا چاہتا تھا

زندگی کے دامن سے اپنی خوشیوں کا سارا حصہ وصول کرتے ہوئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔

وہ اب تو زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کے قابل ہوا تھا ٹوٹ کر جوانی آ رہی تھی۔ نشیلا سا خمار اس کی آنکھوں میں ہر وقت سمویا رہتا فطری تقاضے سر ابھارتے ـــ جوان لڑکیاں اس کے لئے مقناطیسی کشش رکھنے لگیں۔

اس کا زیادہ وقت اب باہر گزرنے لگا۔

سفینہ اندر ہی اندر کڑھتی۔ کبھی شکوہ لبوں پر آ جاتا تو پوچھ لیتی "وہاب رات گئے تک باہر کیا کرتے ہو" ؟

پہلے تو وہ کام کا بہانہ کر کے ٹال دیتا۔

لیکن جب سفینہ نے بار بار یہی سوال کیا تو وہ الجھ کر بولا۔ "گھر جلدی آ کر کیا کروں ـــ ؟ دولت اور بیوی کے ہوتے ہوئے بھی جس گھر میں سکون نہ ہو وہ جہنم سے کم نہیں ہوتا۔ اس جہنم سے فرار کے راستے ہی ڈھونڈتا رہتا ہوں۔"

" وہاب " سفینہ کا دل دہل گیا۔

" ہاں سچ کہتا ہوں۔ تم ہر وقت منہ بسورے پڑی رہتی ہو بچے ہیں نہیں جو دل کے بہلاوے کا سبب بنیں۔"

" تم جانتے ہو بچے نہیں ہو سکتے۔" سفینہ نے روہانسی آواز میں وہاب سے کہا۔

"تو اس میں میرا کیا قصور ——؟ مجھے کیوں سزا بھگتنا پڑ رہی ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"تم ... بچے چاہتے ہو نا۔" سفینہ نے سپاٹ چہرے اور پھیکی پھیکی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ... ہاں ... ہاں۔" وہ چڑ سا گیا۔

سفینہ چپ ہو گئی۔

وہ اس کے پاس سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ وہاب اس کے پیچھے پیچھے نہیں آیا۔ یہ اس کی ازدواجی زندگی کا پہلا تلخ سانحہ تھا۔ وہ بڑی دیر تک بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

وقت کے ساتھ ساتھ دوریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

قصور سفینہ کا نہیں تھا تو وہاب کا بھی نہیں تھا۔

سفینہ کچھ عرصہ تو پریشان رہی۔ روتی دھوتی بھی رہی۔ فتح اکثر اسے وہاب کی باہر کی سرگرمیوں سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔

"صاحب آج کل ایک لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔"

"اب دوسری کوئی لڑکی انہیں دفتر سے لینے آ جاتی ہے۔"

"ان دنوں وہ شہر کے مشہور تاجر کی بیٹی سے دوستی لگائے ہوئے ہیں۔"

ان خبروں سے اسے دکھ تو ہوتا۔ لیکن وہ سنجیدگی سے سوچا بھی کرتی وہاب کی عمر کا تقاضا یہی تھا۔ اس کی جوانی اسی کی متقاضی تھی۔ بچے ہو جاتے

شاید وہ بہکتا بھٹکتا نہیں۔ اب تو اس طرف سے بھی مایوسی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے وہاب سے کہا۔

"وہاب۔"

"ہوں۔"

"تم مجھ سے بالکل بے پروا اور بے تعلق ہوتے جا رہے ہو۔" سفینہ نے کہا۔

وہاب چپ رہا۔ کچھ کہنے کو اس کے پاس تھا ہی نہیں یا اتنا کچھ تھا۔ کہا ہی نہ جاتا تھا۔

سفینہ جہاندیدہ تھی —— خاموشی سے مطلب اخذ کرنا جانتی تھی۔ آہستگی سے بولی۔ "لڑکیوں سے دوستی کا مشغلہ ...؟"

"سفینہ۔" وہاب نے اسے ٹوکا۔

وہ جبراً مسکرائی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ "یہ تمہارا حق ہے۔ میں تمہیں منع تو نہیں کر رہی۔"

"سفینہ ——" وہاب کا لہجہ ڈوب سا گیا —— حیرانگی سے اس کا منہ تکنے لگا۔

سفینہ نے سر ہولے سے ہلایا۔ پھر لبوں پر ویسی ہی جبری مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے تمہارے سکون اور خوشی کا خیال رکھنا چاہیئے ——"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

سفینہ چند لمحے چپ رہی۔

وہاب حیرانگی سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"وہاب تم کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرلو ——" سفینہ نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"سفینہ"

"میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے وہاب۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تمہاری عمر تیز دوڑ کی متقاضی ہے اور میں اب سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے کے دور میں آچکی ہوں۔ ویسے بھی میری کوکھ بنجر اور ویران ہے۔ میں ایسا بوجھ بننا ہرگز پسند نہ کروں گی جسے تم اٹھانا بھی نہ چاہو اور پٹخ بھی نہ سکو۔ شاید احسانوں کی زنجیر میں اپنے کو بندھا پاتے ہو..... تم.....!"

وہاب نے جلدی سے کاٹ کاٹی "احسانوں کے بوجھ میں اک اور احسان کر کے مزید اضافہ کرنا چاہتی ہو"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں وہاب! ایسا نہیں۔ اس میں بھی میری اپنی غرض ہے"

"غرض"

"ہاں"

"میں سمجھا نہیں"

"وہاب تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو نا —— ناسمجھی ہی کی عمر ہے تمہاری میں تجربوں کی بھٹی سے گزر چکی ہوں۔ پیشتر اس کے کہ وقت آجائے کہ تم مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اپنا گھر بسانے کے لئے مجھ سے قطع

تعلق کرلو..... میں.....!"

"سفینہ"

"میں اس سے پہلے ہی تمہیں دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہوں میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔ لیکن تمہیں بکھرتے بھی دیکھ نہیں سکتی۔ دوسری شادی تمہارا فطری تقاضا ہے۔ بچوں کی خواہش بھی قدرتی ہے یہ خواہش مجھے بھی ہے وہاب۔ اور اس خواہش کے پورے ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ تم شادی کرلو۔ بچے ہوں گے۔ یہ گھر اس کی اداسیاں۔ اس کے کرب ناک سناٹے صرف اسی طرح ختم ہو سکتے ہیں میں تمہاری بیوی ہوں۔ تمہارے بچے میرے بچے ہوں گے اگر مجھے ماں بننے کا اعزاز نہیں ملا وہاب! ماں کہلانے کا اعزاز تو دے سکتے ہو۔ بولو یہ حق مجھے دو گے نا"

"سفینہ" وہاب دل گرفتہ سا گیا۔ کتنی عظیم عورت تھی سفینہ۔ اس نے سوچا۔ آبدیدہ ہو کر اسے دیکھا اور پھر بے اختیارانہ سر اس کی گود میں رکھ کر بچوں کی طرح سسک اٹھا۔

سفینہ کی آنکھیں بھی سلگ اٹھیں۔

کئی دن گزر گئے۔

گھر کی فضا مکدر رہی۔ اک تناؤ سا تھا۔ وہاب نے سفینہ سے کچھ نہیں کہا نہ ہی سفینہ نے وہاب سے۔

لیکن

دونوں ہی ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ سننے کے منتظر تھے۔

اس رات دونوں قریب قریب لیٹے سوچوں میں گم تھے۔

سفینہ نے ہمت کی اور وہاب سے پوچھا "کیا سوچا ہے؟"

وہاب نے کروٹ اس کی طرف بدلی اور آہستگی سے بولا۔

"کچھ نہیں۔"

"دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے؟"

وہ چپ رہا۔

"بتاؤ نا۔"

سفینہ۔ وہاب دونوں تکیے سرتلے برابر کرتے ہوئے بولا "جانتی ہو کس بات پر اصرار کر رہی ہو؟"

"بڑی اچھی طرح اور بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے میں نے۔ تمہارا حق میں مارنا نہیں چاہتی۔ اپنا حق تم سے لینا چاہتی ہوں مجھے بچوں کی ضرورت ہے۔"

وہاب خاموش رہا۔

سفینہ خود ہی بولی۔ "وہاب سب مجھے اس فیصلے سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ میں نے اتنی عمر میں تم سے شادی کر کے غلطی کی تھی نہ شادی کرتی نہ اب سوت لانے کا دکھ جھیلتی۔ لیکن میں ان سے متفق نہیں ہوں وہاب۔ میں تمہاری احسانمند ہوں کہ تم نے مجھ سے شادی کی۔ مجھے ازدواجی زندگی کے حسن سے آشنا کیا۔ مجھے تحفظ دیا مضبوط سہارا بنے میرا۔ تمہارا نام مجھے ملا۔ میری شناخت میری پہچان تم سے ہے۔ کیا یہ سب کچھ کم ہے۔ میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتی وہاب۔ یہ سارے حق میرے

ہیں اور رہیں گے۔ میں وعدہ کرتی ہوں وہاب کہ تمہاری بیوی کو میں چھوٹی بہن سمجھ کر بڑے پیار سے رکھوں گی۔ تم بھی وعدہ کرو کہ میرے حقوق مجھ سے کبھی نہیں چھینو گے۔"

وہاب کچھ نہیں بولا۔ صرف اس کا منہ تکے گیا۔

سفینہ نے پھر اصرار کیا۔

"میری باتوں کا جواب دو نا۔"

"مجھے کچھ نہیں پتا۔ جو فیصلہ کرنا ہے خود ہی کرو۔" وہ بولا۔ "مجھے تمہارا ہر فیصلہ منظور ہے۔"

سفینہ یہی سننا چاہتی تھی۔ سن لیا۔ لیکن پھر بھی دل کو دھچکا سا لگا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ جسے اس نے تلخ سی ہنسی سے چھپا لیا۔

وہاب نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اسے سینے سے لگاتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔

"تم کتنی عظیم ہو سفینہ۔ کتنی عظیم۔"

پھر کئی دن بعد۔

سفینہ نے ان عظمتوں کا پاس کرتے ہوئے وہاب کو تحریری اجازت نامہ دوسری شادی کے لئے دے دیا۔

وہاب نے یہ اجازت نامہ کانپتے ہاتھوں سے پکڑا۔

لیکن

لوٹایا نہیں، نہ ہی پھاڑ کر پرزے پرزے کیا۔

بیشک اس نے زبردستی یہ اجازت نامہ نہیں لیا تھا۔

لیکن

سفینہ، بانو سے ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کہ بعض اوقات زبردستی نہ کرنا بھی بہت بڑی زبردستی ہوتی ہے۔

وہاب نے اجازت نامہ صرف لے ہی نہیں لیا ـــــ ایک ماہ کے اندر ہی اس پر عمل بھی کر لیا۔ میمونہ دلہن بن کر سفینہ کے سجائے ہوئے حجلہ عروسی میں آ گئی۔

وہاب نے اندر جانے سے پہلے دل گرفتہ لیکن بظاہر شگفتہ سی سفینہ کو بازوؤں میں بھر کر پیار کرتے ہوئے کہا ـــــ "تمہارے احسانوں میں یہ سب سے بڑا احسان ہے سفینہ ـــ لیکن ـــ اس میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ ہمیں بچوں کی ضرورت ہے میں تمہیں ماں کہلانے کا اعزاز پورے اعزاز کے ساتھ دوں گا۔"

سفینہ نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اپنے آپ کو اس کے بازوؤں سے الگ کرتے ہوئے اسے کمرے میں جانے کے لئے راہ دے دی وہاب تیز تیز قدم اٹھاتے اندر چلا گیا۔

اور ـــــ

سفینہ من من بھر کے بوجھل قدم بمشکل گھسیٹتی اپنے کمرے میں چلی آئی ـــــ

رفتاروں کا فرق ہی سنگین سچائی تھی۔